نظریۂ نَو تاریخیت اور اُردو ادب: اُردو ادب میں نَو تاریخیت کے نظری و اطلاقی مَباحث کا تحقیقی و تجزیاتی مُطالعہ

مقالہ برائے ایم۔ فل (اُردو)

مقالہ نگار:

محمد عمر فاروق

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۳ء

نظریہ نَو تاریخیت اور اُردُو ادب: اُردُو ادب میں نَو تاریخیت کے نظری و اطلاقی مَباحث کا تحقیقی و تجزیاتی مُطالعہ

مقالہ نگار:

محمد عمر فاروق

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۳ء

©

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ، انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور "فیکلٹی آف لینگویجز" کو، اِس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **"نظریہ نُو تاریخیت اور اُردُو ادب: اُردُو ادب میں نُو تاریخیت کے نظری و اطلاقی مَباحث کا تحقیقی و تجزیاتی مُطالعہ"**

پیش کار: **محمد عمر فاروق** رجسٹریشن نمبر: **1890/Mphil/Urd/F19**

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: **اُردُو زبان و ادب**

پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم (صدرِ شعبۂ اُردو) ____________________

نگرانِ مقالہ

ڈاکٹر صنوبر الطاف ____________________

شریک نگران

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر سید نادر علی ____________________

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ: ____________________

اقرار نامہ

میں، **محمد عمر فاروق** حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ ،اِس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد ،کے ایم فل: اُردو اسکالر کی حیثیت سے **پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم** (صدرِ شعبۂ اُردو، نمل،اسلام آباد) کی نگرانی اور **ڈاکٹر صنوبر الطاف** کی شریک نگرانی میں، مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

محمد عمر فاروق

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

مقالہ اور دفاع کی منظوری کا فارم	III
اقرار نامہ	IV
فہرست ابواب	V
ABSTRACT	VIII
اظہارِ تشکر	X
باب اول: موضوعِ تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث	**1**
الف۔ تمہید	**1**
۱۔ موضوع کا تعارف	1
۲۔ بیان مسئلہ	4
۳۔ مقاصدِ تحقیق	5
۴۔ تحقیقی سوالات	5
۵۔ نظری دائرہ کار	5
۶۔ تحقیقی طریقِ کار	7
۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	12
۸۔ تحدید	14
۹۔ پس منظری مُطالعہ	15
۱۰۔ تحقیق کی اہمیت	18
ب۔ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ: اجمالی تعارف	**19**
ج۔ تاریخیت: مختصر تعارف	**81**

د۔ **نظریۂ نَو تاریخیت: تعارف**	**100**
حوالہ جات	**118**
بابِ دوم: نظریۂ نَو تاریخیت: بنیاد گزار، دبستانِ خیال اور اساسی نظری جہات	**124**
الف۔ نَو تاریخیت کے پیش رو	**124**
.i مشل فوکو(Michel Foucault)	124
.ii لوئی آلتھیوسے(Louis Althusser)	130
.iii مورس ڈکسٹین (Morris Dickstein)	134
ب۔ نَو تاریخیت کے دبستان خیال اور مفکرین	**135**
اول۔ نَو تاریخیت کا امریکی دبستان(AmericanSchool of New Historicism)	137
.i اسٹیفن جے گرین بلاٹ(Stephen Jay Green Blatt)	137
.ii جوناتھن گولڈ برگ(Jonathan Gold Berg)	141
.iii اسٹیفن اورگل(Stephen Orgel)	142
.iv لوئی مانٹروس(Louis Montross)	143
.v لیزا جارڈائن (Lisa Jardine)	145
دوم۔ نَو تاریخیت کا برطانوی دبستان(British School of New Historicism)	**147**
.i ریمنڈ ہنری ولیمز(Raymond Henry Williams)	147
.ii کیتھرین بیلسی(Catherine Belsey)	150
.iii جوناتھن ڈولی مور(Jonathan Dollimore)	153
.iv ایلن سن فیلڈ(Alan Sinfield)	155
حوالہ جات	**159**

باب سوم: اُردُو تنقید اور نَو تاریخیت: نظری مباحث 161

الف۔ اُردُو تنقید میں نَو تاریخیت کے نظری مَباحث کا آغاز اور روایت 161

ب۔ اُردُو تنقید میں نَو تاریخیت کے نظری مَباحث 180

حوالہ جات 245

باب چہارم: اُردُو تنقید اور نَو تاریخیت: اطلاقی مَباحث 251

الف۔ اُردُو تنقید میں نَو تاریخیت کے اطلاقی مَباحث کا آغاز اور روایت 251

ب۔ اُردُو تنقید میں نَو تاریخیت کے اطلاقی مباحث 264

حوالہ جات 298

الف۔ مجموعی جائزہ 302

ب۔ تحقیقی نتائج 315

ج۔ سفارشات 317

کتابیات 318

ABSTRACT

Title:

NEW HISTORICISM THEORY AND URDU LITERATURE: AN ANALYTICAL STUDY OF THEORETICAL AND APPLIED DISCOURSE OF NEW HISTORICISM IN URDU LITERATURE.

Abstract:

My research treatise is basically about a literary theory named; “New Historicism”. The theory of New Historicism was first given by English Theorist and Critic; “Stephen Jay Green Blatt” between 1980^A.D to 1987^A.D, with the help of different articles and books. In 1982^A.D, he used this term’s name for the first time. In this sense, a book named; “Renaissance Self-Fashioning: From More to Shakespeare." Which was published in 1980^A.D, is very overriding and foremost. Also In 1987^A.D, “Stephen Jay Greenblatt” wrote an essay entitled; “Towards a Poetics of Culture” which remains the rudimentary text of new historicism to this day. With the thought, contemplation and texts of “Stephen Jay Greenblatt” and his coadjutor like; “Jonathan Goldberg”, “Stephen Orgel”, “Louis Montross”, “Lisa Jardine” and “Leonard Tennenhouse”, the ideology of New Historicism flourished in America. On the other hand, in “Great Britain” (England) theory of “New Historicism” was thrive by “Raymond Henry Williams” and his cohort members like; “Jonathan Dollimore” ,“Alan Sinfield” ,“Catherine Belsey” and “Francis Barker” ,with a slightly different name which was;“Cultural Materialism”. Such, the theory of New historicism prosper. Thus, critics of Urdu literature influenced by him in the early nineties and began writing about New Historicism. The first articles on New Historicism in Urdu were written by; "Riaz Siddiqui" between 1993^A.D to 1995^A.D. After Riaz Siddiqui, lot of other critics of Urdu like; “Prof. Atique Ullah, Dr. Gopi Chand Narang, Dr. Nasir Abbas Nayyer, Wahab Ashraf, Altaf Anjum, Shams-ur- Rehman Farooqi, Prof. Ehsaas Baig, Dr. Qazi Abid and Dr. Naseem Abbas Ahmar”, wrote articles on New Historicism. The articles of; “Prof. Atique Ullah, Dr. Gopi Chand Narang, Dr. Nasir Abbas

Nayyer and Shams-ur- Rehman Farooqi" are so valued. So, if I want to define and elaborate New Historicism in just one line, then I say that; New Historicism is a theory that deals with History, Culture, Literary text and literary criticism. The main concern of new historicism, is with literature, history and culture, who is focused on understanding and explaining the relationship between them, and which opened the layers of history and led the way of reconstructing the past by formulating "Inter textual historical principle of criticism". So I wrote down my research in the context of the concept of New Historicism. And I have divided the thesis into four Chapters. **First Chapter**; is about introduction of research and basic concepts. In which I discussed the basic concepts of; "History, Philosophy of History, Historicism, and New Historicism". **Second Chapter;** is about beginner thinkers of New Historicism, Schools of thoughts of New Historicism and Fundamental concepts of New Historicism. I have discussed and evaluated all these aspects in this chapter. In **Third Chapter**, Research turned to Urdu literature. In which I analyzed the text of theoretical concepts of New Historicism in Urdu literature. This is based on "Fourteen (14) Articles" and "One (1) Thesis". The motif of the **Fourth and the Last Chapter** of this research is like the third. In which I analyzed the text of applied samples of New Historicism in Urdu literature. This is based on "Five (5) Articles" and "Three (3) Thesis". And after these Four Chapters I wrote an Overview, Research Findings and Recommendations about research. Hence, this research thesis is about New Historicism, covering the entire Theoretical and Applied development of this Theory (New Historicism) from its inception in English literature to its spread in Urdu literature and criticism.

اظہارِ تشکر

اِس کائنات کے لانگا ٹیر میں "انسان" وہ یکتا مخلوق ہے، جسے "ذی شعور" سمجھا جاتا ہے۔(شعور: جس کے معنی؛" سمجھ بُوجھ، احساس، دانائی، عقل اور نفسیات کی رُو سے وسیع ترین کیفیت، جس کے ماتحت تمام کیفیاتِ نفسی وقوف احساس ارادہ ہیں، کے ہیں۔) انسان جب اپنے ارتقائی عمل سے گزر رہا ہوتا ہے تو اِس ارتقا کے دوران جہاں ایک جانب اُس کا شعور اور شعوری قدریں پروان چڑھ رہی ہوتی ہیں تو وہیں دوسری جانب اُسی شعور کے ماتحت زندگی گزارنے کے مقاصد بھی تشکیل پا رہے ہوتے ہیں۔ بعض کے ہاں یہ واضح، جب کہ بعض کے ہاں غیر واضح ہوتے ہیں۔ جب کہ بعض اِنہیں خود کھوج کر سامنے لاتے ہیں۔ بعض انسان اِن مقاصد کو خود چنتے اور ترتیب دیتے ہیں اور بعد ازاں اُنہیں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب کہ بعض نیم دانستگی یا نادانستگی کی حالت میں ہو کر بھی کسی نہ کسی مقصد کو حاصل کر لیتے ہیں۔ اور بعض تگ و پُو کے باوجود بھی کسی مقصد کو حاصل نہیں کر پاتے۔ اگر "انسانی تاریخ" پر نگاہ دوڑائی جائے تو ہمیں انتہائی کام یاب اور نام ور انسان وہی نظر آتے ہیں کہ جو خود اپنا مقصد اور بڑا مقصد منتخب کرتے ہیں اور پھر اُسے حاصل کر کے چھوڑتے ہیں۔ تاریخ میں اُنہیں بڑے لوگوں کا نام باقی رہتا ہے، جو محنت کر کے، کام یاب ہوتے ہیں اور بڑے مقاصد حاصل کر کے بڑے لوگ کہلاتے ہیں، چاہے وہ کسی بھی شعبۂ ہائے زیست سے وابستہ ہوں۔ اُنہیں لوگوں سے متاثر ہو کر میری زندگی کے بھی متعدد مُعینہ مقاصد ہیں۔ جن میں سے ایک انتہائی اہم مقصد : "ڈاکٹر آف فلاسفی"(Doctor of Philosophy) کی "سند" (Degree) حاصل کرنا ہے۔ جس کے لیے ایک انتہائی اہم ولازمی زینہ "ماسٹر آف فلاسفی" (Master of Philosophy) کی ڈگری کا حصول اور اِس پڑاؤ کو عبور کرنا تھا۔ جو آج اِس "ایم۔فل: اُردُو" کے سندی تحقیقی مقالہ کو رقم کرنے سے تکمیل پایا۔ اور نہ صرف یہ مقصد حاصل ہوا بل کہ بعینہ میرے مزاج اور انتہائی خواہش کے مطابق ہی مجھے تحقیقی موضوع نصیب ہوا اور تمام تحقیقی مراحل کو طے کر کے و تمام تحقیقی لوازمات کو ملحوظ رکھ کر ترقیم پایا۔ پس اِس ابتہاجِ انتہا کے پُر بہا موقع پر، سب سے پہلے اُس "وحدہ لاشریک لہٗ"، تمام کائناتوں کے مالک" ،" اللہ رب العزت "کا، شکر گزار ہوں۔ کہ جس ہستی نے مجھے ترِلوک کی تمام مخلوقات میں سے، افضل ترین مخلوق میں پیدا کر کے، انسان بنایا۔ اور نہ صرف عام انسان، بل کہ اپنے ارجمند اور اکمل نبیؐ کا امتی بنایا۔ جن کی ذات کے

توسل سے علم کو امتیاز نصیب ہوا اور اُن کے تراب پا کے صدقے مجھے علم حاصل کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ پس میں آپؐ کی بارگاہ میں بھی سرنگوں ہو کر، سپاس گزار ہوں۔ رب کریم اور آقائے دوجہاںؐ کا شکر بجالانے کے بعد، میں اِس دنیا میں اپنے دو سب سے اہم رشتوں یعنی اپنے والدین: **"محترم ابو جی" (قاضی خالد فاروق احمد اعوان صاحب، سابق ڈپٹی ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفیسر، جوہر آباد۔)** اور **"محترمہ امی جی" (سعیدہ سلطانہ اختر صاحبہ)** کا، ہاتھ جوڑ کر، انتہائی احسان مند ہوں۔ کہ جنہوں نے ہمیشہ مجھے میری اوقات سے بڑھ کر پیار کیا، پروان چڑھایا اور میرے اَن گنت ناز اٹھائے۔ اور مجھ سے بے انتہا محبت کر کے آج مجھے اِس مقام تلک پہنچایا۔ **میں اپنی "ایم۔فل: اُردُو" کی یہ "سند" اور یہ "تحقیقی مقالہ" اُنہیں کے نام معنون کرتا ہوں۔** والدین کے بعد میرے لیے میرے اساتذہ بے حد اہمیت کے حامل ہیں، کہ جنہوں نے ہمیشہ میری سوچ سے بڑھ کر مجھ سے محبت کی اور مجھے علم کی دولت سے مالا مال کیا۔ اِس تناظر میں اپنی نگرانِ مقالہ: "ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ" (صدرِ شعبۂ اُردُو زبان و ادب، نمل، اسلام آباد) کا رہینِ منت ہوں کہ جنہوں نے اِس مقالہ کے آغاز سے، اِس کی تکمیل تک، ہر ہر موقع پر از حد راہ نمائی کی۔ اور اس تحقیق کی علمی جامع اور وقیع بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اسی سلسلے میں اپنی شریک نگران: "ڈاکٹر صنوبر الطاف صاحبہ" اور اپنی مشفق استاد "ڈاکٹر صائمہ نذیر صاحبہ" (کوآرڈی نیٹر: ایم۔فل و پی ایچ ڈی، اُردُو) کا بھی بے حد ممنون ہوں، کہ جنہوں نے ہر حوالے سے مدد کی اور اپنا قیمتی وقت دیا۔ علاوہ بریں، شعبۂ اُردُو کے دیگر اساتذہ میں: "ڈاکٹر عابد حسین سیال صاحب، ڈاکٹر نعیم مظہر صاحب، ڈاکٹر محمود الحسن رانا صاحب، ڈاکٹر ارشاد بیگم صاحبہ، ڈاکٹر نازیہ یونس صاحبہ اور ڈاکٹر نازیہ ملک صاحبہ" کا بھی از حد مشکور ہوں۔ اپنے شعبۂ اُردُو کے اساتذہ کے علاوہ، میں جس محترم استاد کا یہاں ذکر ضروری سمجھوں گا، اُن کا نام: "ڈاکٹر روش ندیم صاحب" ہے۔ ڈاکٹر روش ندیم صاحب ،سے اپنے اس ایم۔فل اُردُو کے علمی سفر سے قبل، تعارفی سا تعلق تھا۔ مگر اِس عرصہ میں راول پنڈی و اسلام آباد کے اِس سپوت اور اُردُو ادب کے مایۂ ناز استاد و ادیب سے جو رشتۂ محبت استوار ہوا، وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ اس تعلق کو استوار کرانے میں اہم کردار "ڈاکٹر صنوبر الطاف صاحبہ" کا ہے۔ میں ڈاکٹر روش ندیم صاحب کی اپنے لیے بے حد الفت و جَودت پر اُن کا سپاس گزار ہوں۔

اخیر میں اپنے چند غیر ادبی نجی مخلص دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چوں کہ ایک تو اُن کی فہرست قدرے طویل ہے، اور دوسرا اُن سے رشتہ ہی ایسا ہے کہ اُن کا نام تحریر کی ستائش کا محتاج نہیں۔ پس انفرادی طور پر اُن کا نام یہاں رقم کرنے سے قاصر رہوں گا۔ ہاں جس ایک ہستی کا ذکر نہ کرنا ابھاگ پن کا باعث ٹھہرے گا، وہ میرے بڑے بھائی، میرے روحانی مقتدیٰ، اور میرے راہ بر: "پیر سید حسن محمود بخاری نقوی صاحب" (سُلاسہ و سجادہ نشین: پیر مٹھا شاہ بخاریؒ) ہیں۔ جن کا میری زندگی میں ہونا کسی افزونیِ نعمت سے کم نہیں۔ جو کہ ایک روحانی پیشوا ہونے کے ساتھ ساتھ "ادب" سے بھی گہرا شغف رکھتے ہیں۔ میں اِس عظیم ہستی کا دل سے شکر گزار ہوں۔ اسی ہستی کے توسل سے ایک پیارا رشتہ بھی نصیب ہوا، جو ایک بھائی اور سگے بھائی سے بڑھ کر ہے۔ اُن کا نام :"وسیم عباس گُل لوئی" ہے۔ جن کی تعلیمی قابلیت تو ایک "مہندس" (Engineer) کی ہے مگر اُنہیں شاعری اور خاص کر اُردُو شاعری سے اتنا لگاؤ ہے کہ وہ بعض اوقات اُردُو ادب کے طلباء کو بھی مات دے دیتے ہیں۔ اور اُن سے اپنے انتہائی پیارے تعلق پر شکر بجالاتا ہوئے ہر دم اُن کا مشکور ہوں۔ میں اپنی اِس موجودہ جماعت میں، اپنی ہم جماعت: "ثانیہ صابر صاحبہ"، کہ جس سے انتہائی پیارا تعلق ہے، کا بھی بے حد مشکور ہوں کہ جس نے وقتاً فوقتاً بہت سے معاملات میں ساتھ نبھایا۔ مقالہ ہٰذا کو قلم سے قِرطاس پر رقم کرنے کے بعد، اِسے "کمپیوٹرائزڈ ٹائپ" کی صورت میں برادرم: "زرولی خان صاحب" (اسد کوآپریٹو سٹور، سرگودھا) نے ڈھالا ہے۔ میں اُن کا بھی انتہائی مشکور ہوں کہ مجھ ایسے محقق کی انتہائی سختیوں کو برداشت کیا اوراس مقالہ کو "ٹائپ" صورت میں مکمل کیا۔ میں اپنے اِس سندی تحقیقی مقالے سے متعلق، بہ حیثیت طالب علم و مقالہ نگار نیز "اظہارِ تشکر" کی ساخت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اِس مقالہ کے متعلق، اور کچھ زیادہ تو نہیں کہوں گا۔ بس اتنی توضیح پیش کرنا چاہوں گا کہ: "یہ تحقیقی مقالہ انسانی استطاعت بھرپور طریقے سے استعمال کرتے ہوئے رقم کیا گیا ہے۔ پھر بھی مستقبل میں اِس سے جو طالبِ علم، محقق یا محترم اساتذہ مستفید ہوں اور کسی بھی حوالے سے کسی بھی غلطی کو محسوس کریں تو اُن سے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔" چوں کہ اس مقالے کی اساس "تاریخ" پر ہے، تو آخر پر اسی نسبت سے، ہم سب کی **"تابیدہ تاریخ"** کے لیے دعا گو ہوں۔

قاضی محمد عمر فاروق اعوان

باب اول:

موضوعِ تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف:

اس نسقِ زیست میں "تاریخ"(History) کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ تاریخ،وہ عملِ مسلسل ہے، جو زمان و مکان کے درمیان اَبعاد کی ربط میں پابندی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس پیدائش میں جہاں زمان و مکان کے درمیان اَبعاد کی پابندی سے روانی ضروری ہے، وہیں وقوعات اور کرداروں کے ساتھ ساتھ "سماجی، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی عناصر اور عصری تصورات" بھی اساسی نوعیت کے حامل ہیں۔ حال اور ماضی کی کوکھ میں کلبلانے والے زمانے سے عبارت، تاریخ کا یہ عمل، جب اپنے ترکیبی عناصر کی مدد سے جنم لے کر ماضی میں ڈھلتا رہتا ہے، تو یہ دوہرا افریضہ انجام دیتا ہے۔ایک طرف جہاں یہ اِن عناصر سے تشکیل پاتا ہے، تو دوسری طرف اِن تشکیلی عناصر کو پروان چڑھانے میں بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ تاریخ کیا ہے؟۔۔۔اِس کے متعلق مختلف مفکرین اور فلسفیوں نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں، جن میں؛"جارج ولہیلم فریڈرش ہیگل" (Georg Wilhelm Friedrich Hegel)، "عبدالرحمٰن ابن خلدون"(Abdul Rehman Ibn-a-Khaldun)،"ایمانوئل کانٹ"(Immanuel Kant)،"کارل مارکس" (Karl Marx)،"اسوالڈا شپینگلر" (Oswald Spengler)، "وِل ڈیورانٹ" (Will Durant) اور "آرنلڈ جوزف ٹائن بی" (Arnold Joseph Toynbee) 'کے نظریات اہمیت کے حامل ہیں۔ تاریخ کی اِنہیں فلسفیانہ تعبیرات کی روشنی میں تاریخ کو مختلف صورتوں میں محفوظ اور بیان کیا جاتا ہے، جیسے:"اقوامِ عالم کی تاریخ"،"مذاہب کی تاریخ"،"جنگوں کی تاریخ"،"تہذیبوں کی تاریخ"،"علوم کی تاریخ"اور"ادب کی تاریخ"وغیرہ وغیرہ۔۔۔ تاریخ کا یہ بیان صرف

خالصتاً "تاریخی متون"(Historical Texts) پر ہی مشمول نہیں ہوتا، بل کہ "ادبی متون" (Literary Texts) بھی تاریخ کے اظہار کا ایک بڑا ذریعہ ہوتے ہیں۔

ادب(Literature)، جس کی علوم کی حیثیت کے بارے میں کوئی دورائے نہیں، یہ تفسیرِ کائنات اور تنقیدِ حیات کا فریضہ تو انجام دیتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ تاریخ کا مہابیانیہ بھی ہے۔ ادبی متون میں تاریخ کی پیش کش کا اپنا ایک اُسلوب اور مزاج ہوتا ہے، جو "بین المتونی"(Inter Textual) طرز پر بھی ہو سکتا ہے۔ ادب اور تاریخ کے اس تال میل میں "ناول" (Novel)، "ڈراما"(Drama)اور "افسانہ"(Short Story) مرکزی حیثیت رکھتے ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اِن اصناف میں ڈھالی گئی تاریخ، عمومی تاریخ کا ہی شاخسانہ معلوم ہوتی ہے، جو زندگی سے اور بھی قریب تر دکھائی دیتی ہے۔ ادب اور تاریخ کی یہ راہ و رسم صرف تخلیق تک ہی محدود نہیں، بل کہ اس کے دائرہ کار میں "تنقید"(Criticism) بھی شامل ہے۔ جو ادبی متون کے ذریعے تاریخ کو بہتر طریقے سے بیان کرنے اور اِسے پڑھنے کا ڈھنگ سکھاتی ہے اور اپنے توسط سے اِس کے مُطالعہ کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ ادب اور تاریخ کے تنقیدی مُطالعہ سے متعلق زمانۂ قدیم سے "دو تنقیدی رویے" (Two Critical Tendencies) موجود رہے ہیں۔ پہلا: "افلاطون"(Plato) کے زمانے سے، جب کہ دوسرا: "ارسطو"(Aristotle) کے دور سے، کارفرما ہے۔ اول الذکر، ادبی مُطالعات میں سماجی اور تاریخی تناظر کو ملحوظِ نظر رکھنے پر مُصر ہے۔ جب کہ مؤخر الذکر، ادب پاروں کی خود مختاریت اور خود مکتفی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ افلاطون، سے مُتصل تنقیدی رویہ افلاطون کے "نظریۂ نقل"(Mimesis Theory) کی ہی فروعی شاخ کے نظریات کی نظری و اطلاقی (Theoretical and Applied) صورت ہے۔ انہیں دو تنقیدی ضابطوں کے درمیان تیسرا ایک ایسا رویہ پروان چڑھتا رہا، جس نے ادب کو کُلی طور پر تاریخ سے الگ نہیں کیا اور نہ ہی ادب کو تاریخ کا دستِ نگر مقصور کیا۔ یہ نیا تنقیدی رویہ **"نو تاریخیت یا نئی تاریخیت" (New/Neo Historicism)** کہلایا، جو: مابعد جدیدیت" (Post-Modernism) کے مظہر اور تھیوری کے طور پر سامنے آیا۔ اس نظریہ کو پروان چڑھانے

میں "مشل فوکو" (Michel Foucault) اور "لوئی آلتھیوسے"(Louis Althusser) جیسے "پسِ ساختیاتی" (Post-Structural) مفکرین کے اثرات موجود ہیں، لیکن اسے عملی جامہ :"اسٹیفن جے گرین بلاٹ" (Stephen Jay Green Blatt) نے پہنایا۔ ۱۹۸۷ء میں "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" نے "Towards a Poetics of Culture" کے عنوان سے مدلل مضمون لکھا، جو آج تک نوتاریخیت کی بنیاد چلا آتا ہے۔ یوں نوتاریخیت ادب کی تفہیم کے بالکل جدید نظام کے طور پر واضح ہوئی۔ یہ قرأت کے ایک ایسے خاص طریقے کے طور پر سامنے آئی، جس کا اصرار متن کے نہایت غائر مطالعے پر ہے۔ اور نوتاریخیت (New Historicism) کا بنیادی سروکار ادب، تاریخ اور ثقافت کی ہم رشتگی سے ٹھہرتے ہوئے ان پے چیدہ رشتوں کو سمجھنے اور سمجھانے پر مرکوز ہے، جس نے تاریخ کی پرتیں کھولتے ہوئے "بین المتونی تاریخی اصولِ نقد" (Intertextual Historical Principles of Criticism) وضع کر کے ماضی کی تشکیلِ نو کی راہ دکھائی ہے۔ یوں نوتاریخیت کے اساسی منہاج اس طرح طے پاتے ہیں کہ: **"نوتاریخیت نئی پڑھت کے اس عمل کا نام ہے، جس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ادبی متون کس طرح اپنے زمانے کے طور طریقوں اور اعتقادات کو ظاہر کرتے ہیں، بل کہ انہیں بناتے اور ان سے متاثر بھی ہوتے ہیں، یعنی ادب نہ صرف ثقافتی طور پر پیدا ہوتا ہے، بل کہ ثقافتی اطوار کو پیدا بھی کرتا ہے۔ ان اُمور کے جائزے کے ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ کسی متن کا مصنف اپنے زمانے کے سرمایہ دار اور غیر انقلاب پسند طاقتوں کی رایوں کا محکوم تھا۔ یہ اپنی آزاد رائے بھی رکھتا تھا؟ اور اس نے یہ رائے شعوری طور پر اختیار کی یا مصنف کے ارادے کے بغیر ہی متن میں ظاہر ہوئی!"**، صرف یہ ہی نہیں بل کہ نوتاریخیت تو نوتاریخی نقاد سے متن کے توسط سے مصنف کے: **"ذہنی تعصبات، شبہات، عقائد، نظریات، خوف اور بے چینیوں تک"** رسائی کی بھی متقاضی ہے۔ اُردو ادب میں نوتاریخیت کا باقاعدہ آغاز "ریاض صدیقی" کے مضامین سے "نوے کی دہائی" (۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۵ء) میں ہوا۔ بعد ازاں چند دیگر ناقدین کے مضامین بھی سامنے آئے اور نوتاریخیت نے اُردو میں رواج پایا۔

تحقیق ہٰذا بنیادی طور پر نو تاریخیت کے نظری و اطلاقی مباحث (Theoretical and Applied Discourse) کا تحقیقی و تجزیاتی مُطالعہ ہے۔اس مُطالعہ کی غرض سے نو تاریخیت کے پیش رو اور بنیاد گزاروں (انگریزی ادب کے ناقدین) کا جائزہ لیتے ہوئے اُردو ادب و تنقید میں نو تاریخیت کے نظریہ اور اطلاق کا احوال بیان کیا جائے گا، تا کہ دیکھا جا سکے کہ اُردو تنقید میں اسے کس طرح قبولیت حاصل ہوئی اور اس کی نظری جہات (Theoretical Directions) کو کیسے سمجھا اور پیش کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نظریہ کی اُردو میں کون کون سی اطلاقی مثالیں ملتی ہیں اور انہیں کس قدر اس نظریہ کی ذیل میں پرکھا و پیش کیا گیا؟ پس یوں تحقیق ہٰذا نو تاریخیت کے نظریہ کی آغاز سے حال تک، روداد کی، ایک تحقیقی و تنقیدی کاوش ٹھہرتی ہے۔

۲۔ بیانِ مسئلہ:

نظریۂ نو تاریخیت (New Historicism Theory) کسی خاص بندھے ٹکے رویے کا نام نہیں ہے، بل کہ اس کا دائرہ کار بے حد وسیع ہے۔ اُردو میں نو تاریخیت کے نظریے کا اطلاق تو دور، بہ طور نظریہ بھی تاحال یہ ایک دقیق مسئلہ ہے۔ جس کی نظری جہات مبہم ہونے کے باعث تفصیلی مُطالعہ کی متقاضی ہیں اور اُردو میں چند ایک اطلاقی نمونے ہونے کے باوجود بھی، اس کی اطلاقی صورتوں کو واضح کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس سے قبل اُردو میں جو اطلاقی نمونے ملتے ہیں، وہ یا تو ؛"روایتی تاریخی طریقِ رسائی" (Traditional Historical Approach) یا کسی حد تک ؛"مارکسی تاریخی طریقِ رسائی" (Marxist Historical Approach) کے قریب تر ہیں، جنہیں اُردو میں رقم کرتے ہوئے، نو تاریخیت کے عنوان کے علاوہ، نو تاریخیت کے کسی وصف کو ملحوظ رکھا ہی نہیں گیا۔ پس تحقیق ہٰذا، بنیادی طور پر نو تاریخیت کے نظریے اور اطلاق پر منتج ہے۔ اس کے لیے نو تاریخیت کے بنیاد گزاروں اور اُردو ادب و تنقید میں نو تاریخیت کے نظری و اطلاقی مُطالعات سے رجوع کیا جائے گا۔ لہٰذا، اس مُطالعہ کا انحصار؛"نو تاریخیت کے نظریے کا آغاز، نو تاریخیت کی اساسی نظری جہات جیسا کہ؛ 'تاریخ کی تشکیل اور تاریخی ربط، تاریخ اور معروضیت، تاریخ اور ادبی متون، ادبی تاریخی متون اور ثقافتی تشکیل کا دوہرا

عمل اور تاریخ اور عصری تاویلوں میں پس پشت سماجی محرکات اور اقتداری تسلط' وغیرہ کا جائزہ لینے، نو تاریخیت کے بنیاد گزاروں اور دیگر ناقدین کی نو تاریخیت سے متعلق آرا کو پرکھنے، اُردو میں نو تاریخیت کے نظریہ کا رواج پانے' اور اس نظریے کی تفہیم اور روشنی میں اطلاقی مثالوں کا جائزہ لینے پر ہو گا۔"

۳۔ مقاصدِ تحقیق:

مجوزہ مقالے میں درج ذیل مقاصدِ تحقیق پیشِ نظر ہیں:

۱. نظریۂ نو تاریخیت کا تعارف پیش کرتے ہوئے اس کے مبادی تصورات اور نظری جہات کو پیش کرنا۔
۲. نو تاریخیت کے نظریہ کی متون کے تنقیدی مُطالعات کے تناظر میں، اطلاقی صورت واضح کرنا۔
۳. اُردو ادب میں نو تاریخیت کے نظری مَباحث کا اُردو ناقدین کی تنقید کی روشنی میں مُطالعہ کرنا۔
۴. اُردو ادب میں نظریۂ نو تاریخیت کے تناظر میں اطلاقی مطالعات کا تنقیدی جائزہ لینا۔

۴۔ تحقیقی سوالات:

مجوزہ مقالے میں درج ذیل تحقیقی سوالات پیشِ نظر ہیں:

۱. نو تاریخیت کیا ہے؟ اور اس کے بنیادی تصورات اور نظریات کیا کیا ہیں؟
۲. نو تاریخیت کے نظریہ کے تحت کسی بھی ادبی متن کا نو تاریخی مطالعہ کس طور کیا جا سکتا ہے؟
۳. اُردو ادب میں نو تاریخیت کے نظریہ کی تفہیم کن کن ناقدین نے اور کس کس طرح کی ہے؟
۴. اُردو ادب میں نظریۂ نو تاریخیت کے تناظر میں کون کون سی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا؟ اور کس طرح کیا گیا ہے؟

۵۔ نظری دائرہ کار:

اُردُو ادب میں "نو تاریخیت"(New Historicism) کا نظریہ دیگر متعدد نظریات کی طرح مغرب کی ہی دین ہے۔ مغرب میں اس نظریہ کے ابتدائی نقوش "مشل فوکو"(Michel Foucault)، "لوئی آلتھیو

سے" (Louis Althusser)، "مورس ڈکسٹین"(Morris Dickstein)"گلیفرڈ گیرٹز" (Clifford Geertz)اور "میخائل میخائیلوویچ باختین"(Mikhail Michailovich Bakhtin) ، جیسے مفکرین کے ہاں ملتے ہیں۔ جنھوں نے اس نظریہ کے ارتقامیں پس پشت گہرے اثرات مرتب کیے، لیکن اس نظریہ کا باقاعدہ آغاز امریکی ادبی مؤرخ اور نقاد "اسٹیفن جے گرین بلاٹ"(Stephen Jay Green Blatt) کی تحریروں سے "اسی کی دہائی" میں ہوا۔ اسٹیفن جے گرین بلاٹ، نے ۱۹۸۰ء میں "Renaissance Self-Fashioning: From More to Shakespeare" کے عنوان سے کتاب لکھی، جس میں نو تاریخیت کے تصورات کی ابتدائی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ "۱۹۸۲ء" میں اسٹیفن جے گرین بلاٹ نے "The Forms of Power and the Power of Forms in the Renaissance" ، کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس میں باقاعدہ پہلی بار "نَو تاریخیت"(New Historicism) کی اِصطلاح استعمال کی۔ اِسی سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے ۱۹۸۷ء میں اسٹیفن جے گرین بلاٹ نے "Towards a Poetics of Culture" کے عنوان سے ایک اور مفصل مضمون تحریر کر کے استدلالی بحث کرتے ہوئے نو تاریخیت کا مقدمہ پیش کیا۔ یہ مضمون آج تک نو تاریخیت کی بنیاد چلا آتا ہے اور اسی کے توسط سے "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" کو اس کا بنیاد گزار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسٹیفن جے گرین بلاٹ کے رفقا میں؛"جوناتھن گولڈ برگ"(Jonathan Goldberg)، "اسٹیفن اور گل" (Stephen Orgel)، "لوئی مانٹروس"(Louis Montross)، "لیزا جارڈائن" (Lisa Jardine) اور "لیونارڈ ٹینن ہاؤس"(Leonard Tennen House) ،اہمیت کے حامل ہیں۔ نو تاریخیت کے اس امریکی گروہ کے ساتھ دوسرا مغربی گروہ "برطانوی" (British) ہے۔ برطانیہ میں نو تاریخیت "ثقافتی مادیت" (Cultural Materialism) کے نام سے چلن میں آئی۔ ثقافتی مادیت کی اس اصطلاح کو برطانوی ویلش مارکسسٹ "ریمنڈ ہنری ولیمز"(Raymond Henry Williams) نے اپنی کتاب "Marxism and Literature" میں ۱۹۷۷ء میں پہلی بار استعمال کیا۔ ریمنڈ ہنری ولیمز کے ہم خیالوں میں؛ "کیتھرین(کیتھرائن)

بیلسی"(Catherine Belsey)،"جوناتھن ڈولی مور"(Jonathan Dollimore)،"ایلن سن فیلڈ"(Alan Sinfield)اور "فرانسز بارکر" (Francis Barker)،کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ یوں نو تاریخیت یہ سفر طے کرتے ہوئے "نوے کی دہائی" میں اُردُو ادب میں پہنچی۔ اُردُو میں نو تاریخیت پر سب سے پہلے مضامین "ریاض صدیقی" نے ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۵ء کے درمیان تحریر کیے۔ بعد ازاں: "پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ، وہاب اشرف، الطاف انجم، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر احساس بیگ، ڈاکٹر قاضی عابد، ڈاکٹر نسیم عباس احمر، حنا جمشید اور سید ازور عباس، ڈاکٹر مطاہر شاہ" ،نے نو تاریخیت پر نظری و اطلاقی مضامین تحریر کیے، لیکن اُردُو ادب میں تین دہائیاں گزر جانے کے باوجود نو تاریخیت کا کل سرمایہ یہی چند ایک مضامین ہیں۔

مجوزہ تحقیق اپنی ساخت کے اعتبار سے تنقیدی تحقیق میں شمار ہے، جس کا دارومدار ہی "نو تاریخیت" کے نظریات کا جائزہ لینے پر ہے۔ لہٰذا اسے بنیادی طور پر نو تاریخیت کے بنیاد گزار "اسٹیفن جے گرین بلاٹ"(Stephen Jay Green blatt)کے نظریات کے تحت استوار کیا جائے گا۔ علاوہ بریں گرین بلاٹ کے رفقا اور "ریمنڈ ہنری ولیمز"(Raymond Henry Williams) کے اساسی اہم نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے اُردو میں پیش کردہ مضامین جو دراصل گرین بلاٹ اور اس کے رفقاء کی تفہیمات و تعبیرات ہی ہیں، ان سے رجوع کیا جائے گا اور انہیں نظریات کے تحت نو تاریخیت کی اجمالی صورت پیش کی جائے گی۔

۶۔ تحقیقی طریق کار:

مجوزہ تحقیق دراصل "نو تاریخیت" (New Historicism) کے "نظریہ" (Theory) سے متعلق ہے، جس کا بنیادی سروکار اس کے "نظری"(Theoretical) اور "اطلاقی"(Applied) مَباحث کے تحقیقی و تجزیاتی مطالعے (Analytical Study) سے ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے دیکھا جائے تو تحقیق ہٰذا اساسی طور پر اسی نظریے کے گرد مرکوز ہے، جسے تحقیقی صورت میں ڈھالنے کے لیے تحقیق کے اصول و ضوابط سے رجوع تو کیا ہی

جائے گا، لیکن اس کا بنیادی سروکار یہ نظریہ ہی ہو گا۔ لہٰذا اس کی ترقیم کا عمل، طریق کار (Methodology) کے لحاظ سے تین جہات میں تقسیم ہے، جو کہ یہ ہیں:

اول: تحقیق ہٰذا کا ڈھانچہ تنقید کا عمل دخل زیادہ ہونے کے باوجود بھی، تحقیق کے طریقہ (Method) کے لحاظ سے اہم ترین قسم: "دریافتی / دستاویزی / تاریخی تحقیق" (Exploratory or Documentary or Historical Research) کے تحت استوار کیا جائے گا، تا کہ تحقیقی عمل کی ایک باقاعدہ صورت متعین ہو سکے۔

دوم: تحقیق ہٰذا میں نو تاریخیت کے نظریہ کی پرکھ، اس کی جہات کی تفہیم و توضیح کے لیے بنیادی اہمیت "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" (Stephen Jay Green Blatt) کے نظریات کو دی جائے گی، جس کے تحت نو تاریخیت کے نظریہ کی تفہیم کا ڈھانچہ استوار کیا جائے گا اور انہیں تفہیمات کی روشنی میں دیگر ناقدین کی آرا کا جائزہ بھی لیا جائے گا۔

سوم: مجوزہ تحقیق میں تجزیے کے لیے بنیادی طور پر نو تاریخیت کے نظریات سے رجوع کرنے کے ساتھ ساتھ "مابعد جدید تنقید" (Post Modern Criticism) کے اصول و ضوابط کو بھی مدِ نظر رکھا جائے گا، تا کہ اطلاقی مطالعات کے جائزے کے دوران غیر جانب دارانہ تعبیر و تفہیم کی جا سکے اور انہیں نو تاریخیت کے اوصاف کے تحت "نو تاریخی عمل" (New Historical Practice) کے طور پر برتا جائے گا، نہ کہ روایتی پڑھت کا انداز اختیار کرتے ہوئے، روایتی تجزیہ کیا جائے گا، بل کہ نو تاریخیت کے نظری تقاضوں کے تحت جدید تر تجزیاتی طریقہ اپنایا جائے گا۔

تحقیق کا یہ سارا عمل مجموعی طور پر "دریافتی / دستاویزی / تاریخی تحقیق" (Exploratory or Documentary or Historical Research) کے اصول و ضوابط کی مدد سے آگے بڑھایا جائے گا۔ اس طریقِ تحقیق کے تحت متون کا مُطالعہ اس طور کیا جاتا ہے کہ ان کی اثر پذیری کی غیر جانب دارانہ تشریح کی جا سکے

اور مستقبل میں ایسے اُمور کی اٹھان سے تعمیرِ نو میں مدد مل سکے۔ یہ تحقیقی طریقہ دراصل دستاویزات کی پرکھ، بیان اور ان سے ماخوذ نتائج سے مشروط ہے، جس کا معیار زیرِ تحقیق دستاویزات کے انتخاب اور متعلقہ مآخذ سے معتبر ہونے پر ہے۔ تحقیق ہٰذا چوں کہ نو تاریخیت کے نظریات کا نو تاریخیت کے بنیاد گزاروں اور اُردو ادب و تنقید کے ضمن میں تنقیدی مطالعہ ہے اور نو تاریخیت ایک بے حد وسعت کا حامل موضوع ہے، لہٰذا اس تحقیق کو بنیادی مآخذ کے ساتھ ساتھ متعلقہ ثانوی مآخذ جو کہ: "اُردو تحقیقی و تنقیدی کتب، تحقیقی مقالات، مضامین، ریسرچ پیپرز، رسائل و جرائد، انگریزی کتب، انگریزی مضامین، اُردو و انگریزی لغات اور ویب گاہیں" ہیں، سے رجوع کرتے ہوئے آراستہ کیا جائے گا، جن کی حیثیت "تحقیقی آلات"(Research Tools) کی ہے۔ دریافتی / دستاویزی / تاریخی تحقیق کے اصول و ضوابط کے تحت مجوزہ موضوع کو ڈھالنے اور اسے رقم کرنے کی جو اجمالی صورت قائم ہوتی ہے، اسے ذیل میں انتہائی اختصار سے "تین"(۳) نکات میں بیان کیا جارہا ہے:

١. دستاویزی تحقیق، کے دوران تحقیق کار نہ تو متغیرات کو قابو(Control) کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی مرضی کے تابع (Manipulate) کر سکتا ہے۔ محقق ماضی کے واقعات پر اثر انداز بھی نہیں ہو سکتا، جو ہو چکا ہے، وہ ہو چکا ہے۔ تاہم وہ سائنسی معروضیت(Objectivity) کے ساتھ یہ جاننے کی کوشش کر سکتا ہے کہ حقیقت میں ماضی میں ہوا کیا؟ پس تحقیق ہٰذا میں بھی اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے نو تاریخیت کی ماضی میں پیش کردہ تفہیمات کا جائزہ لیا جائے گا۔

٢. دستاویزی / دریافتی تحقیق میں معلومات کی موزونیت اور صحت کو ثابت کرنے کے عمل کے دو حصے ہیں: "پہلا حصہ؛ مآخذ کا مستند (Authentic) ہونا اور دوسرا حصہ ؛اندراجات کی موزونیت ثابت کرنا ہے"۔ مطالعہ ہٰذا میں بھی نو تاریخیت کے نظری مباحث کے لیے براہ راست بنیادی مآخذ سے رجوع کیا جائے گا اور ان کی تفہیم بھی انہیں کی روشنی میں کی جائے گی۔ نیز موزونیت کو برقرار رکھتے ہوئے متون کو

تنقیدی مطالعہ کی غرض سے زیرِ مطالعہ کسی قسم کے متعلقاتِ متن کو بیان نہیں کیا جائے گا۔ بل کہ صرف اور صرف تھیوری سے رجوع کی جائے گی۔

۳. دستاویزی / تاریخی تحقیق میں معلومات کی تشریح کرتے ہوئے اس فرضیے یا نظریے کو سامنے رکھنا چاہیے، جس کے ساتھ معلومات زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتی ہوں۔ الگ تھلگ حقائق بے معنی ہوتے ہیں اور نہ صرف حقائق کی فہرست تیار کر لینا ہی تحقیق ہے، بل کہ دراصل معلومات کو ایک دوسرے کے حوالے سے سمجھنا۔ ان کو تعمیمات (Generalization) اور نتائج کی صورت میں ترتیب دینا چاہیے، تا کہ ان کی مجموعی اہمیت پیشِ نظر رہے۔ نو تاریخیت کا موضوع بھی کثیر الجہاتی نوع کا ہے، جس کے کئیں ایک زاویے ہیں۔ پس تحقیق ہٰذا میں انہیں اس طور مرتب کیا جائے گا کہ ان میں الجھاؤ پیدا نہ ہو اور واضح صورت سامنے آئے۔

تحقیق ہٰذا میں انتہائی معمولی عمل دخل "تقابل" (Comparison) کا بھی ہے، جو کہ "تاریخیت" کا "نو تاریخیت" سے اور "نو تاریخیت" کا "ثقافتی مادیت" سے اشتراکات و افتراقات واضح کرنے کے لیے کہیں نہ کہیں متن میں برتا جائے گا۔ جو چاہے باضابطہ تقابل کے عنوان سے نہ بھی ہو پھر بھی اس کا پس منظر مقصد تقابل ہی ہو گا۔ لہٰذا تقابل کے عمل کے لیے "دبستانِ فرانس" (French School of Comparative Study) کے نظریات سے رجوع کیا جائے گا، جنہیں "سوزن بیسینٹ" (Susan Bassinet) نے اپنی کتاب "Comparative Literature: A Critical Introduction" (اُردو ترجمہ: تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ) میں بیان کیا ہے۔ علاوہ بریں تحقیق کی مبادیات سے واقفیت کے لیے "فریڈرک لیمسن وھٹنی" (Fredrick Lamson Whitney) کی کتاب "The Elements of Research" (۱۹۵۰ء) اور "دریافتی / دستاویزی / تاریخی تحقیق" (Exploratory or Documentary or Historical

(Research) کے لیے "ڈاکٹر گیان چند جین" کی کتاب "تحقیق کا فن" (۲۰۱۵ء) اور "ڈاکٹر عطش درانی" کتاب "لسانی وادبی تحقیق وتدوین کے اصول" (۲۰۱۹ء) سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ترقیمِ مقالہ میں اسلوب کے حوالے سے ایک احتیاط یہ بھی برتی جائے گی کہ جس باب کا جو موضوع جس طور ہے اسے اسی اسلوب وڈھنگ کے تحت پیش کیا جائے، مثال کے طور پر اگر کوئی ذیلی موضوع زیادہ تحقیق کا متقاضی ہے تو اس کا اسلوب تحقیقی نوعیت کا ہوگا اور اسی طرح اگر کوئی موضوع فزوں تنقید کا متحمل ہے تو وہاں اسلوب تنقیدی اختیار کیا جائے گا۔ اسی طرح اِملا کے حوالے سے کہیں پر انگریزی ودیگر زبانوں کے ادبا و نظریات کا تعارف وجائزہ پیش کرنا مقصود ہو تو، وہاں ساتھ تصریح کی غرض سے مطلوبہ "اسما، الفاظ یا اصطلاحات" کے ساتھ ہی "بین القوسین" (In Brackets) "انگریزی خط" (English Script) (جس کا باقاعدہ نام "لاطینی خط" (Latin Script) ہے۔، اور جسے عرفِ عام میں "رومن خط" (Roman Script) بھی کہتے ہیں، میں توضیحی طور پر اصل حالت میں رقم کیا جائے گا)۔ انگریزی ودوسری زبانوں کے وہ "اسما، الفاظ اور اصطلاحات" جو کہ پہلے سے اُردُو میں مستعمل ہیں وہ تو زیادہ تر اُردُو میں اسی بہتر مستعمل صورت میں ہی رقم کیے جائیں گے۔ مگر دیگر زبانوں کے ایسے "اسما، الفاظ واصطلاحات" کہ جن کی "اردوانا اِملا" بہت غلط رائج ہے، یا "جن کی سرے سے اِملا، اُردُو میں پہلے ملتی ہی نہیں ہے"، تو اُنھیں اصل زبان کے تلفظ یا وہ ممکن نہ ہو تو، اس زبان کے خاندان کی فی زمانہ آفاقی رائج قریبی زبان (جیسے "لاطینی" کی قریبی ایک ہی خاندان کی آفاقی زبان "انگریزی" ہے۔) کے ممکنہ مناسب تلفظ کے تحت، یعنی اس کی آواز پر، اِملا لکھی جائے گی۔ جو بنیادی اصول "ڈاکٹر عابد حسین سیال" کی چینی کلاسیکی شاعر: "چھویو آن" کی شاعری کی کتاب کے اُردُو میں شائع شدہ ترجمے بعنوان: **"غم کے محاذ پر"** (۲۰۲۱ء) کے دیباچے: "چند معروضات" سے اخذ کیا گیا ہے۔[1] اور کچھ اس اصول میں افزوں مناسب اِزدِیاد کیے گئے ہیں۔

---

[1] چھویو آن، غم کے محاذ پر، مترجم عابد سیال، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء

اس تحقیق کے اخیر میں "محاکمہ" قائم کرتے ہوئے :"ماحصل / مجموعی جائزہ"، "تحقیقی نتائج" اور "سفارشات" کا اہتمام بھی کیا جائے گا۔ تحقیق ہٰذا کے چاروں ابواب (باب:اول، دوم، سوم اور چہارم) ایک دوسرے سے ربط میں اور باہم منسلک ہوں گے۔ اس لیے جس باب میں موضوع کی مناسبت سے جو توضیح پیش کر دی جائے گا، تو دیگر ابواب میں اس کی غیر ضروری وضاحت اور غیر ضروری دوہرائی سے اجتناب کیا جائے گا۔ نیز ابواب کی طوالت کا انحصار بھی اُن کے موضوع کی مناسبت و اہمیت سے ہو گا۔ یا بعض صورتوں میں یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک موضوع اتنا اہم نہیں ہے مگر وہ پہلی بار کسی باب میں بیان کیا جائے گا اور بعد میں بھی کسی باب میں اس کا ذکر نہ آئے گا، تو وہ کم اہم ہونے کے باوجود بھی متعلقہ باب میں قدرے توضیح سے بیان کیا جائے گا۔ جب کہ دوسرا کوئی اہم موضوع کہ جو مقالہ کے حوالے سے تو اہم ہے، مگر متعلقہ باب میں اس کا صرف تعارف ضروری ہے تو وہ اس باب میں صرف تعارفی نوعیت سے پیش کیا جائے گا اور جب اگلے ابواب میں باب کی مناسبت سے اس کا ذکر آئے گا تو وہاں پر وہ تفصیلی زیر بحث لایا جائے گا۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

مجوزہ موضوع پر بعینہ ماقبل تحقیق نہ ہے (یاد رہے کہ یہاں لفظ: "بعینہ" استعمال ہوا ہے۔) کہ جس میں نظریہ نو تاریخیت کے بنیاد گزاروں اور اُردو ادب و تنقید دونوں کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہو۔ لہٰذا اس تناظر میں یہ اُردو میں پہلی تحقیقی و تنقیدی کاوش ہو گی۔ اس ضمن میں اُردو میں جامعاتی تحقیق کے منظر پر نگاہ دوڑائیں تو تاحال اُردو میں نو تاریخیت کے مباحث کے حوالے سے صرف ایک "ایم۔فل" کی سطح کا تحقیقی مقالہ بعنوان؛ **"اُردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث"**، سامنے آتا ہے، یہ تحقیقی مقالہ "سید ازور شیرازی" نے "ڈاکٹر محمد کامران" کی زیرِ نگرانی "۲۰۱۸ء" میں "شعبہ اُردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور" میں رقم کیا۔ علاوہ بریں اُردو تحقیق میں نو تاریخیت کے اطلاقی مَباحث کے حوالے سے تاحال دو تحقیقی مقالات سامنے آئے ہیں۔ پہلا تحقیقی مقالہ ایم۔فل کی ڈگری کے حصول کے لیے "عائشہ واجد" نے **"اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت"**،

کے عنوان سے "۲۰۱۰ء" میں "ڈاکٹر رخشندہ مراد" کی نگرانی میں "شعبہ اُردو زبان و ادب، نمل، اسلام آباد" میں مکمل کیا۔ جب کہ دوسرا تحقیقی مقالہ بھی اسی شعبہ سے "۲۰۲۰ء" میں ہی "سمعیہ شکور" نے **"زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت (تتلیاں ڈھونڈنے والی اور رقص بسمل ہے، کے حوالے سے)"**، کے عنوان سے "ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان" اور "ڈاکٹر نازیہ یونس" کی نگرانی میں ایم۔فل کی ڈگری کے حصول کے لیے ہی رقم کیا۔ مؤخر الذکر دونوں مقالات میں "روایتی تاریخی طریقِ رسائی" (Traditional Historical Approach) کو اختیار کرتے ہوئے رقم کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ ایک مقالے میں تو "پلاٹ" (Plot) اور "علامت نگاری" (Symbolism) کے تناظر میں بھی روایتی طرز پر متون کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اُردو جامعاتی تحقیق میں یوں نو تاریخیت کے نظریے کے اطلاق کا کل سرمایہ صرف یہ تین مکمل تحقیقی مقالات ہی ہیں۔ یہ تینوں مقالات، مقالہ ہٰذا میں زیر تحقیق لائے جائیں گے۔ علاوہ بریں تحقیق ہٰذا کی تکمیل کے دوران "دو" (۲) اور "پی ایچ ڈی" کی سطح کے تحقیقی مقالے سامنے آئے ہیں۔ ایک مقالہ؛ "حنا جمشید" کا ہے اور دوسرا؛ "اسرار احمد خان" کا۔ دونوں مقالہ جات کی حیثیت سندی تحقیقی مقالہ کی ہے اور دونوں ہی ۲۰۲۲ء میں مکمل ہوئے۔ پہلے مقالے کی مقالہ نگار: "حنا جمشید" ہیں اور انہوں نے "ڈاکٹر شازیہ عنبرین" کی نگرانی میں **"پاکستانی ادب میں نو تاریخیت"**، کے عنوان سے جنوری ۲۰۲۲ء میں "شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان" میں مقالہ رقم کیا۔ راقم نے ہر ہر ممکن کوشش کی وہ اس تک رسائی حاصل کر سکے، مگر مطلوبہ مقالہ کی مقالہ نگار کی رضامندی نہ ہونے کے باعث اُسے تحقیق ہٰذا میں زیرِ تحقیق نہیں لایا جا سکا۔ تا آں کہ مقالہ نگار (حنا جمشید) نے یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی اپنے مقالہ کی دستاویزی صورت جمع نہ کرائی۔ دوسرے مقالے کے مقالہ نگار: "اسرار احمد خان" ہیں اور انہوں نے "ڈاکٹر عرفان احمد ملک (عرفان عالم)" کی نگرانی میں **"اُردو ادب اور نو تاریخیت: نسیم حجازی کے منتخب ناولوں کا ایک مُطالعہ"**، کے عنوان سے دسمبر ۲۰۲۲ء میں "شعبۂ اُردو (پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اُردو)، کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سری نگر" میں مقالہ رقم کیا۔ اِسے اِس تحقیق میں اس لیے زیرِ تحقیق نہیں لایا جا سکا کہ یہ مقالہ اپنے شعبہ میں جمع ہی "۱۹ دسمبر ۲۰۲۲ء" میں

ہوا۔ تب تک مقالہ ہٰذا کا تحقیقی کام راقم تقریباً مکمل کر چکا تھا اور پیچھے شعبہ کی طرف سے وقت نہ تھا کہ کسی اور مقالہ کو شاملِ تحقیق کیا جا سکے۔ اِن مقالات جات کے علاوہ، چند ایک نظری مَباحث و اطلاقی مُطالعات کے مضامین ہیں، جنہیں اس مقالہ کے؛ "باب سوم" اور "باب چہارم"، میں تفصیلی زیرِ تحقیق لایا جائے گا۔ اس لیے اُن کا بیان یہاں نہیں کیا جا رہا ہے۔ اور انہیں مضامین پر مشتمل "ڈاکٹر نسیم عباس احمر" کی ایک کتاب: "نو تاریخیت [منتخب اُردُو مقالات] بھی ہے۔ جو ۲۰۱۸ء میں "مثال پبلشرز، فیصل آباد" سے شائع ہوئی۔ اس میں ایک اطلاقی مضمون بعنوان: "خس و خاشاک زمانے '---نو تاریخی پڑھت" کے علاوہ، باقی تمام مضمون وہی ہیں کہ جن کا متن اصل آخذ سے لیا جائے گا۔ اور صرف اِس مضمون ("خس و خاشاک زمانے "---نو تاریخیت پڑھت) کا تجزیہ اس کتاب سے متن لے کر مقالہ ہٰذا کے "باب چہارم" میں پیش کیا جائے گا۔ (کیوں کہ صرف اس ایک مضمون کے اصل متن کا ماخذ یہ کتاب ہے۔) اس لیے طوالت اور بے جا بکھیڑے سے بچنے کے لیے اِس کتاب کو الگ سے زیرِ تحقیق نہ لایا جائے گا۔ بل کہ اس میں ترتیب دیے گئے مضامین کو زیرِ تحقیق لانے کے لیے اصل آخذ سے رجوع کیا جائے گا۔ (یہ سطور مقالہ ہٰذا کی **تحدید** معلوم نہ ہوں، اس لیے یہ وضاحت کی جا رہی ہے کہ یہ صرف **مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق** سے متعلق ہی ہیں۔ اور اُسی تناظر میں اِن کا بیان یہاں کیا جا رہا ہے۔) پس اُردُو میں تحقیق ہٰذا کو رقم کرنے تلک، "نو تاریخیت" پر یہ کُل سرمایہ ہے۔

۸۔ تحدید:

مجوزہ موضوع، **اساسی طور پر نو تاریخیت کے نظریہ کا تجزیاتی مُطالعہ ہے**، اِس مُطالعہ کی غرض سے نظریۂ نو تاریخیت کے بنیاد گزاروں (انگریزی ادب کے ناقدین اور نو تاریخیت کے پیش کاروں) کو ابتداء میں فرداً فرداً مختصر زیرِ تحقیق لایا جائے گا اور اُن کے نظریات کا بھی انفرادی طور پر جائزہ لیا جائے گا۔ جب کہ اُردو ناقدین کو انفرادی طور پر زیرِ تحقیق لانے کی بجائے اُردُو تنقید میں نو تاریخیت کے نظری اور اطلاقی مباحث سے براہ راست رجوع کیا جائے گا اور دیگر تعارفی لوازمات میں الجھے بغیر تھیوری اور اس کے متعلقات کی روشنی میں جائزہ

پیش کیا جائے گا، تا کہ اُردو تنقید میں نو تاریخیت کی اجمالی صورت واضح ہو سکے۔ علاوہ بریں اُردو تنقید میں نو تاریخیت کے اطلاقی نمونوں کو نسبتاً چیدہ زیرِ تحقیق لایا جائے گا، جس کا انداز کچھ یوں اختیار کیا جائے گا کہ نو تاریخیت کے تناظر میں تو فن پارہ کے تنقیدی مُطالعہ کی صورت حال واضح ہو، لیکن فن پارہ کے دیگر فنی و فکری لوازمات اور تعارف میں زیادہ نہ اُلجھا جائے۔ اِسی طرح نو تاریخیت کی نظری جہات کا جائزہ لیا جائے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ نو تاریخیت کا " تاریخ، ثقافت کی تاریخی تشکیل، عصری تصورات اور تاویلوں اور مصنف کی جانب داری اور غیر جانب داری "وغیرہ سے تو سروکار رہے ہی سہی، وہیں نو تاریخیت کا ایک پہلو "ساختیاتی تناظر میں تاریخ اور متن کا جائزہ" بھی ہے، جسے بے جا طوالت اور گھمبیر تا سے بچنے اور تحقیق کے دورانیے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انتہائی اختصار سے مُطالعہ میں بیان کیا جائے گا۔ تحقیقِ ہٰذا کے دَور (عَرصہ)، کے حوالے سے اس مقالہ کی حد بندی کچھ ایسے کی گئی ہے کہ ۲۰۲۰ء اور اِس سے قبل کے تمام اُردُو میں موجود مواد کو زیرِ تحقیق لایا جائے گا۔ کیوں کہ اِس مقالہ میں زیرِ تحقیق مواد کو شامل کرنے کی تلاش کا عمل، "خاکہ "(Synopsis) کی صورت میں ۲۰۲۰ء کے اواخر میں کیا جا چکا تھا۔ جس کے "خاکہ "(Synopsis) کی منظوری جامعہ ہٰذا (نمل، اسلام آباد) کے "دی بورڈ آف ہائیر اسٹڈیز اینڈ ریسرچ "(BASR) کی مجلس میں ۲ جون ۲۰۲۱ء کو دی گئی، جس کا اطلاع و اجازت نامہ ۷ جولائی ۲۰۲۱ء کو جاری ہوا۔ یوں اس تحقیق میں بیش تر زیر تحقیقی مواد ۲۰۲۰ء یا اس سے قبل کا ہے۔ البتہ بعد کی ایک تحریر کو مقالہ رقم کرنے کے عرصے کے دوران، نگرانِ مقالہ ہٰذا (ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ) کی پابستہ اجازت سے شامل کیا گیا۔ جو "حنا جمشید "کا مضمون: "عبد اللہ حسین کا نو تاریخی مُطالعہ: تخصیصی مُطالعہ نادار لوگ" ہے۔ پس یہ اِس مقالہ کی ہر تناظر میں حد بندی ہے۔

۹۔ پس منظری مُطالعہ:

مجوزہ موضوع ظاہر اًتو نو تاریخیت کے نظریات اور اُردو ادب و تنقید میں اطلاقی مطالعات کا تحقیقی و تجزیاتی مُطالعہ ہے، لیکن دراصل اس کی وضع کثیر الا لجہاتی ہے اور پیرایہ بے حد وسیع ہے۔ لہٰذا اس تک رسائی ممکن بنانے

اور تحقیقی صورت میں ڈھالنے کے لیے نو تاریخیت کے نظریات کے علاوہ: " تاریخ، فلسفۂ تاریخ، عصری تاریخ، ثقافت، سماج، سیاست " کے مبادی نظریات سے رجوع بھی کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے جن کتب سے استفادہ کیا گیا ہے، ان میں سے چند اہم چھ (۶) کتب کی توضیحی فہرس (فہرست) ذیل میں پیش کی جا رہی ہے:

۱. **اُردو ادب میں تاریخیت، ڈاکٹر ناہید قمر:** اُردو تنقید میں تاریخیت کے نظری و اطلاقی مضامین کا تاحال واحد اثاثہ ہے۔ کتاب ہٰذا میں مُصنفہ نے تاریخیت کی رُو سے اُردُو تخلیقات کا تنقیدی مُطالعہ پیش کیا ہے۔ اس سے اُردُو ادب میں تاریخیت کے اطلاقی مزاج کو سمجھنے میں مدد حاصل کی گئی ہے۔

(ناہید قمر، ڈاکٹر، اُردو ادب میں تاریخیت، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء)

۲. **نو تاریخیت (منتخب اُردو مقالات)، ڈاکٹر نسیم عباس احمر:** اُردو میں نو تاریخیت کے نظری و چند اطلاقی مضامین پر تاحال اولین اور واحد مرتبہ اثاثہ ہے۔ کتاب ہٰذا کے تمام مضامین نو تاریخیت کو نظریاتی و اطلاقی طور پر سمجھنے کے لیے انتہائی معاون ثابت ہوئے، جن میں ڈاکٹر نسیم عباس احمر کا مضمون "خس و خاشاک زمانے—نو تاریخی پڑھت" کی حیثیت نو تاریخی تنقیدی پیرایہ متعین کرنے میں اختراعی ہے۔

(نسیم عباس احمر، ڈاکٹر (مرتب)، نو تاریخیت: [منتخب اُردُو مقالات]، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء)

۳. **فلسفہ تاریخ، جی ڈبلیو ایف ہیگل:** تاریخ کی تاریخ اور تاریخ کی مبادیات کی فلسفیانہ تعبیرات کو سمجھنے کے لیے "جارج ولہیلم فریڈرش ہیگل"(Georg Wilhelm Friedrich Hegel) کی اس تصنیف سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(جی ڈبلیو ایف ہیگل، فلسفہ تاریخ، مترجم نسیم احمد / اقبال آفاقی، ڈاکٹر، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء)

۴. **کلچر: منتخب تنقیدی مضامین، اشتیاق احمد:** اُردو ادب میں کلچر کا ادب اور کلچر کا تاریخ سے تعلق واضح کرنے کے لیے اشتیاق احمد کی مرتبہ کتاب سے مدد لی گئی ہے، تاکہ تاریخ کی تشکیل کے عمل میں ثقافت کے کردار سے واقفیت حاصل کی جا سکے۔

(اشتیاق احمد، (مرتب) کلچر: منتخب تنقیدی مضامین، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۷ء)

۵. **دی نیو ہسٹوریسیزم، ایچ۔ اے ویزر:** "ہیرولڈ ارم ویزر" (Harold Aram Veeser) کی یہ کتاب انگریزی ادب میں نو تاریخیت پر اولین مرتبہ میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب میں نو تاریخیت کے بنیاد گزاروں کے "انیس" (۱۹) مضامین دیے گئے ہیں، جن میں سے "اسٹیفن گرین بلاٹ" (Stephen Green Blatt)، "لوئی۔اے مونٹروس" (Louis A. Montrose) اور "کیتھرین گیلیغر" (Catherine Gallagher) و چند دیگر کے مضامین کے مُطالعے سے نو تاریخیت کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(Harold Aram Veeser, The New Historicism, Routledge, New York, 1989)

۶. **ہسٹوریسزم، پال ہیملٹن:** "پال ہیملٹن" (Paul Hamilton) کی یہ کتاب "تاریخیت" کے تناظر میں آد اساسی اہمیت کی حامل ہے۔ اُردو میں تو ایسی مثال ملتی ہی نہیں ہے۔ وہیں انگریزی میں بھی اس کتاب جیسی کتب بہت ہی کم ہیں۔ اس کتاب کو "پال ہیملٹن"، نے "پانچ" (۵) ابواب میں منقسم کر کے ایک طرح سے "تاریخیت" کی مکمل روایت کو بیان کیا ہے۔ جس میں انہوں نے "تاریخ اور تاریخیت کا تعلق، تاریخیت کا شہرہ، اٹھاؤ اور عروج، فنِ تشریح و تاویل و علم تفسیر یعنی "ہرمینیوٹک روایت ، تاریخ و تاریخیت" (The Hermeneutic Tradition,History and Historicism)، تاریخیت اور جدیدیت اور عصرِ رواں میں تاریخیت کی حیثیت" وغیرہ وغیرہ، کو پیش کیا ہے۔ اس کتاب سے، تاریخیت کی اساس، روایت، کردار اور فکر کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(Paul Hamilton, Historicism, Routledge, New York, 1996)

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت:

تحقیق ہٰذا دو حوالوں سے اہمیت کی حامل ہے۔ اول: یہ اُردُو تحقیق و تنقید میں نو تاریخیت کے تنقیدی جائزے کی پہلی ایسی باقاعدہ کاوش ہو گی، کہ جس میں اُردُو ادب اور نو تاریخیت کے بنیاد گزاروں (انگریزی ادب کے ناقدین) کا مفصل احاطہ کرتے ہوئے نو تاریخیت کے نظریات کا جائزہ پیش کیا جائے گا اور اِس کی نظری جہات کو تفصیلی بیان کیا جائے گا۔ دوم: یہ تحقیق اُردُو میں تاحال جو چند ایک نو تاریخیت کے اطلاقی مطالعات ہیں، اُن کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کرے گی، جو اس سے قبل اُردُو تحقیق میں تنقید بر تنقید کے ضمن میں یوں نہیں ملتے۔ اطلاقی مُطالعات کے حوالے سے جو تحقیقی مثالیں (سندی و غیر سندی) ملتی ہیں، وہ بیش تر "عنوانات" کی حد تک تو "نو تاریخی طریق رسائی"(New Historical Approach) کے تحت ہیں، لیکن انہیں پیش زیادہ سے زیادہ "روایتی تاریخی طریق رسائی" (Traditional Historical Approach) یا "مارکسی تاریخی طریق رسائی" (Marxist Historical Approach) کے تحت کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مُطالعہ ہٰذا کی مدد سے "نو تاریخی طریق رسائی "(New Historical Approach) کا ایک نیا تنقیدی پیرایہ متعارف کروانے کی کاوش بھی کی جائے گی، تاکہ مستقبل میں ادبی متون کو نو تاریخیت کے تناظر میں اس طور زیر مُطالعہ لایا جاسکے۔ پس تحقیق ہٰذا اُردُو تنقید میں نو تاریخیت کی راہیں ہموار کرتے ہوئے متعدد تناظرات میں بہتری کا باعث بنے گی۔

ب۔ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ: اجمالی تعارف

تاریخ (History)، اس انضباطِ کائنات (System of Universe) میں پارینہ ترین حیثیت کی حامل ہے۔ نامعلوم سے معلوم اور ذرے سے پہاڑ تک ہر شے پر تاریخ حاوی ہے۔ تاریخ دراصل زمان و مکان کے درمیان اَبعاد کی ربط میں پابندی کا وہ نام ہے، جس سے یہ تانتاِ کائنات اور متعلقاتِ آر بل خاص پیرائے میں رواں دواں ہیں۔ یہی ابعاد اور ان میں ربط و پابستگی در حقیقت تاریخ بناتے ہیں۔ اگر ان ابعاد کی اتباع اس حالت میں نہ رہے، تو یہ سلسلہ اتقان استمراری جمود کا شکار ہو جائے، جس سے تاریخ تو مسخ ہو ہی، بل کہ اس انجماد کی کیفیت سے تمام کائنات نظم بھی از حد متاثر ہو اور تمام دَر و بست ہی تہس نہس ہو جاوے۔ تاریخ کے نسق، مقدرت اور فراخی پر مزید تمحیص سے قبل اس لفظ کا علمِ صرف کی رُو سے جائزہ لیا جائے تو تاریخ کا لفظ عربی مادہ "ارخ" سے ماخوذ ہے، جو عربی زبان میں "ثلاثی مزید فیہ" کے باب تفعیل سے "مصدر" اور اُردو میں بہ طور "حاصل مصدر" رائج ہے، جسے روایت کے مطابق اُردو میں پہلی بار "قلی قطب شاہ" نے ۱۶۱۱ء میں استعمال کیا۔ تاریخ کی جمع: "تاریخیں"، جمع استثنائی: "تواریخ" اور جمع غیر ندائی: "تاریخوں" ہے۔ اُردو زبان کی بیش تر لغات میں اس کے قریباً ایک سے معنی دیے گئے ہیں، جو کہ "کسی چیز یا واقعے کے ظہور کا وقت"، "کسی امر عظیم کے وقت کا تعین"، "زمانے کا عرصہ"، "شمسی یا قمری مہینے کا ہر دن اور رات"، "وہ علم جس سے گزشتہ واقعات اور سیر سے بحث کی جائے" اور "بادشاہوں، نام ور آدمیوں، قوموں اور فرقوں کے حالات و واقعات اور حادثات کا تحریری تذکرہ" کے ہیں۔ اُردو کے معتمد لغت نگار "سید احمد دہلوی" اپنی معروف لغت: "فرہنگ آصفیہ" میں تاریخ کے معنی بتاتے ہیں:

> "کسی چیز کے ظہور کا وقت، کسی امر عظیم کے وقت کا تعین، شمسی یا قمری مہینے کا ہر ایک دن مع شب۔" (۱)

"فرہنگ عامرہ" میں محمد عبداللہ خان خویشگی "تاریخ" کے معنی کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> "ظاہر ہونے کا وقت، مہینے کا کوئی دن، واقعات زمانہ کا بیان۔" (۲)

اُردو زبان کے ایک اور نامی لغت نگار: "مولوی نور الحسن نیّر" ، "نور اللغات" میں تاریخ کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

> "کسی چیز کے ظہور کا وقت ظاہر کرنا، کسی امرِ عظیم کے وقت کا تعین کرنا، شمسی یا قمری کا ہر ایک دن۔۔۔ گزشتہ واقعات اور سیر کی تاریخ، اُس فن کا نام جس میں واقعات گزشتہ سے بحث کی جاتی ہے، کسی واقعہ کا ایسے الفاظ میں ظاہر کرنا، جن کے اعداد بحساب تجمل جوڑنے سے زمانہ وقوع ظاہر ہو۔" (۳)

تاریخ کے لیے، تاریخ کے متبادل "انگریزی" (English) زبان میں لفظ: "ہسٹری" (History) اور "ڈیٹ" (Date) استعمال ہوتے ہیں۔ ڈیٹ؛ شمسی، قمری، بکرمی اور عیسوی مہینے کے ہر ایک دن مع شب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جب کہ "ہسٹری؛" تاریخ" (بالا بیان کی گئی وضاحت کے مطابق) اور "فنِ تاریخ" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (فنِ تاریخ یا فنِ تاریخ گوئی کی مزید وضاحت آگے کی جائے گی، مختصراً یہ کہ جس میں واقعات عظیمہ کا حال درج کیا جائے۔ لفظ ہسٹری، اشتقاقی لحاظ سے وسعت کا حامل ہے، جو متعدد زبانوں کے توسط سے انگریزی زبان میں داخل ہوا۔ اس کا ماخذ عام طور پر "یونانی زبان" (Greek Language) تسلیم کیا جاتا ہے، مگر مزید پیچھے جا کر دیکھیں تو اس کا ماخذ یونانی نہیں، بل کہ "اولی ہندیورپی زبان" (Proto Indo European Language) ہے، جسے عرف عام میں "پائی" (PIE) کہا جاتا ہے۔ (چوں کہ اولی ہندیورپی زبان قریباً غیر مصدقہ اور نو تعمیر شدہ زبان ہے، جسے ہندیورپی زبانوں کا مورث اعلا بھی سمجھا جاتا ہے، اور اس کے خدوخال کی کوئی واضح صورتیں آج تلک بھی نہ بن پائی ہیں، مگر ماہرین لسانیات اس کی نو تعمیری کی کاوشوں میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ تاہم اسی بنا پر متعدد ماہرین لسانیات اسے اس قابل بھی نہیں گردانتے کہ اس سے کسی لفظ کو ماخوذ کیا جا سکے، لیکن دیکھا جائے تو نیو تو وہی ہے چاہے وہ معیاری ہے یا نہیں، یا چاہے وہ خود تدریجی حالت میں ہے۔) اولی ہندیورپی زبان کا زمانہ قریباً ۴۵۰۰ سے ۶۵۰۰ قبل مسیح ہے، جس سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہسٹری لفظ

کی ابتدائی صورت اندازاً ۴۵۰۰ قبل مسیح سے مستعمل ہے۔ چناں چہ یہ لفظ اولی ہندیورپی زبان میں "وید"(Weid) بہ معنی "دیکھنے کے لیے" اسی سے "ویدتور"(Weid-tor) ،وہاں سے "یونانی زبان"(Greek Language) میں "ہسٹور" (Histor) بہ معنی "پرکھنا اور عقل مند" کے اور اس کے بعد یونانی زبان میں ہی "ہسٹورین" (Historien) بہ معنی "جاننا" کے اور اس کے بعد "ہسٹوریا"(Historia) بہ معنی "کسی کے متعلق جاننے اور پرکھنے کے" سے ،"لاطینی" (Latin) میں "ہسٹوریا" (Historia) بہ معنی "کہانی" کے، شکلیں بدلتے ہوئے "قدیمی فرانسیسی" (Old French) میں" اسٹوریا، اسٹوئیر" (Estorie, Estoire) بہ معنی "تاریخ اور روزنامچہ" کے، داخل ہوا اور وہاں سے ۱۳۹۰ء کے قریب انگریزی زبان میں "ہسٹری" (History) بہ معنی "واقعات کے تعلق وغیرہ" کے شامل و مستعمل ہوا۔ "نیورلڈ انسائیکلو پیڈیا" (New World Encyclopedia) میں اس متعلق یوں بیان کیا گیا ہے:

> "The term History entered the English Language in 1390, with the meaning of "relation of incidents", Story via the old French historie, from Latin historia, narrative, account". This itself was dereived form the Ancient Greek istoria historia, Meaning "a Learning or Knowing by inquiry, history, record, narrative, from the verb istoria, historein, to inquire." (4)

یوں ۱۳۹۰ء سے عصرِ رواں تک پہنچتے پہنچتے لفظ ہسٹری نے معنوی لحاظ سے اپنا ارتقائی سفر جاری رکھا اور اپنا حدود اربعہ کشادہ کرتا گیا، وہ نہ صرف کہانی یا واقعات کے تعلق تک رہا، بل کہ انسانی عقل و شعور کا احاطہ کرتے ہوئے ان کو بیان کرنے تک وسعت اختیار کر گیا۔ تا آں کہ انسانی تاریخ کے انتہائی ارجمند فلسفی اور تاریخ دان "جارج ولیہلم فریڈرش ہیگل"(Geory Wilhelm Friendrich Hegel) نے یہاں تک رائے دی کہ:" اُن کے نزدیک انسانی تاریخ "عقل و شعور" کی تاریخ ہے اور اس بنا پر سوائے انسانی تاریخ کے اور کوئی تاریخ نہ

ہے۔" جس سے اس لفظ کی ماہیئت کے دو اساسی پہلو واضح ہوتے ہیں۔ اول: کہ ہسٹری نہ صرف واقعات کا بیان ہے بل کہ اس کی رسائی انسانی عقل و شعور کے ارتقائی سفر سے عہد رواں تک ہے اور جو مستقبل میں بھی جاری رہے گی۔ دوم: ہسٹری کا ارتکاز انسان کے گرد مرکوز ہے اور اسی سے وابستہ ہے۔ انگریزی کی جدید لغات میں "ہسٹری" (History) کے معنی قریباً ایک جیسے ہی دیے گئے ہیں۔ "اوکس فرڈ امریکن ڈکشنری آف کرنٹ انگلش" (Oxford American Dictionary of Current English) میں "ہسٹری" کے معنی یوں بیان کیے گئے ہیں:

> "1. A continuous, USU. Chronological, record of important of public events. 2. A. Study of past events, esp. Human affairs. B. The total accumulation of past events, esp. relating to human affairs or a particular nation, person, thing, etc (the history of astronomy). 3. An eventful past (this house has a history). 4. A systematic account of a past event or events, etc." (5)

اس طرح "کیمبرج ڈکشنری" (Cambridge Dictionary) میں لفظ "ہسٹری" کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> "The study of a record of past events considered together, especially events of a particular period, country, or subject." (6)

"میریم ویبسٹر ڈکشنری" (Merrian-Webster Dictionary) میں اس کی قدرے مختلف انداز میں وضاحت ملتی ہیں:

> "A treatise presenting systematically related natural phenomena (as of geography, animals or plants)". (7)

پس ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی کی بیش تر لغات میں "ہسٹری" (History) کے معنی: "ماضی کے واقعات کا بیان یا منظم طریقے سے قدرتی مظاہر کو پیش کرنا وغیرہ وغیرہ" ملتے ہیں۔ تاریخ (History) کے لغوی معنوں (Literal Meanings) کے بعد اس کے اصطلاحی معنی (Terminological Meaning) جاننے کی کوشش کی جائے کہ تاریخ دراصل ہے کیا؟۔۔۔۔ تو اس حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد مفکرین، تاریخ دانوں، فلسفیوں اور ناقدین نے اپنی اپنی آرا اور نظریات پیش کیے ہیں۔ (یہ سلسلہ مزید جاری ہے اور رہے گا)۔ تاہم تاریخ کے اہم نظریات کی رُو سے تاریخ کی بہت سے تعریفیں کی گئیں، اس تناظر میں "ڈاکٹر مبارک علی" لکھتے ہیں:

> "لغت میں تاریخ کے معنی وقت کی نشاندہی کرنا یا وقت بتانا ہیں۔ اصطلاحاً اس کے معنی ہیں۔ "وقت بتا کر احوال متعین کرنا" ماضی میں ہونے والے واقعات جنہوں نے تاریخ میں کوئی تبدیلی کی ہو یا جن کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی اہمیت ہو، ایسے واقعات کو ترتیب و تدوین کر کے انہیں سنہ وار بیان کرنا تاریخ کے دائرے میں آتا ہے۔" (۸)

اسی تناظر میں ڈاکٹر مبارک علی مزید لکھتے ہیں:

> "تاریخ کیا ہے؟ اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ ماضی میں انسان کی سرگرمیوں کی داستان، لیکن ہر داستان بکھری ہوئی اور بے ترتیب ہے اور مؤرخ اس داستان کو سلسلہ وار بنا کر اور واقعات کو ایک دوسرے میں ملا کر اس میں مفہوم پیدا کرتا ہے۔" (۹)

عبدالحیٔ خواجہ (معروف بہ: مشفق خواجہ)، ہندوستان کی معروف و مستند تاریخ: "تاریخ فرشتہ" (محمد قاسم فرشتہ) کے "دیباچۂ مترجم" میں تاریخ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"تاریخ، تہذیب و تمدن کا ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں انسانیت کے خدوخال اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ بڑی وضاحت سے اجاگر ہوتے ہیں۔ انسانی تہذیب نے خوب سے خوب تر کی تلاش میں جو ارتقائی سفر طے کیا اور جن وادیوں اور منزلوں سے یہ کاروانِ رنگ و بو گزرا ہے۔ ان کی روداد جب الفاظ کا پیکر اختیار کرتی ہے تو "تاریخ" بن جاتی ہے۔ لیکن تاریخ ماضی کے واقعات کو صرف دہرا دینے کا نام ہی نہیں، بل کہ ماضی کی بازیافت کا فن ہے۔" (۱۰)

اسی طرح "جوہن جیکب اینڈریسن (John Jacob Anderson) تاریخ (History) کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"History is a narration of the events which have happened among mankind, including an account of the rise and fall of nations, as well as of others great changes which have affected the political and social condition of Human race." (11)

تاریخ کی اصطلاح کی تفہیم کرتے ہوئے "رابن جارج کولنگ وڈ" (Robin George Collingwood) تاریخ کو دراصل تحقیق اور کھوج کی ایک قسم قرار دیتے ہیں اور اس کا رشتہ "سائنس" سے جوڑتے ہیں، اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"The definition of history. Every historian would agree, I think, that history is a kind of research of inequity. What kind of inequity it is i do not yet ask. The point is that generically it belongs to what we call Science: that is, the forms of thought whereby we ask questions and, try to answer them. Science in a general, it is important to realize, does not consist in

collecting what we already know and arranging it in this or that kind of pattern. It consist in fastening upon something we do not know, and trying to discover it."(12)

بایں طور، ہم تاریخ کے بالا بیان کیے گئے لغوی اور اصطلاحی مفاہیم اور تعریفات کی رُو سے دیکھتے ہیں، تو تاریخ آد اساسی طور پر دو جہتوں میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ (جو دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہ ہیں) تاریخ کا ایک دانگ یہ ہے کہ جس میں موالیدِ آفرینش سے آج تلک کائنات کا تمام نسق جاری ہے، یعنی دن سے رات بن رہے ہیں اور رات پھر دن میں ڈھل رہی ہے۔ اور یہ لانگا ٹیر پورا ہونے پر، تاریخ بنا رہے ہیں۔ نیز یہ نظام مسلسل جاری ہے اور کائنات کے وجود کو قائم رکھتے ہوئے ہے جس کی ترتیب ابتدا سے ایک جیسی ہے، جو گُپت ادوار میں بھی بعینہ اپناوجود قائم رکھے ہوئے تھی۔ یعنی اس کے تسلسل میں کبھی فرق نہ آیا۔ نہ صرف یہ بل کہ اسی عملِ مسلسل کے ساتھ ساتھ ہی تمام ابنائے دہر ایک تسلسل میں بڑھتے ہوئے وقت کی حد میں جی رہے ہیں اور اُسی میں ان کے واقعات بھی وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ یوں کائنات کا یہ تسلسل اس میں بسنے والوں کے واقعات اور ان کی پابند روانی، تاریخ بنانے میں مشغولِ کار ہیں۔ اور یہ عمل بدستور ہو رہا ہے، جس سے تاریخ اپنی حیثیت و وجود قائم کر رہی ہے۔ اس لیے یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ کی پہلی جہت حالتِ اہتزاز میں ہے۔ تاریخ کی اساسی جہات میں دوسرا دانگ یہ ہے: کہ تاریخ جو اپنی پہلی صورت میں اپنا تشخص قائم کر رہی ہے۔ یہ ایک طرح تو آفاق کے پردے پر محفوظ ہوتی جا رہی ہے، مگر جب تک اسے زبانی یا تحریری طور پر محفوظ نہ کیا گیا۔ تب تک یہ آنے والے عام انسانوں کی پہنچ سے دور رہی ہے۔ پس اس تک انسانوں کی رسائی ممکن بنانے کے لیے اسے "زبانی"(Oral) اور "تحریری"(Written) طور پر محفوظ کرنے کا اہتمام کیا جانے لگا، جسے؛ "تاریخ"(History)، "فنِ تاریخ" (Art of History) اور "تاریخ نویسی یا تاریخ گوئی"(Historiography) کا نام دیا گیا۔

ابتدائی ادوار میں تو تاریخ صرف سینہ بہ سینہ محفوظ اور بیان ہوتی، مگر بعد ازاں اسے لکھنے کا رواج بھی عام ہوا۔ اس تناظر میں اولین ادوار کے بعد وسطی ادوار میں اور مجموعی طور پر "تحریری تاریخ" زیادہ اہم ٹھہری، اس متعلق ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

> "ابتدائی تاریخی سرمایہ زبانی روایات پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ لوگ اہم واقعات اور حوادث کو یاد کر لیتے تھے اور انہیں واقعات و حوادث سے مدت کا تعین کرتے تھے۔ زبانی روایات قصوں اور کہانیوں میں خرابی یہ تھی کہ نسل بعد نسل ان میں صداقت کم اور مبالغہ اور تخیل آمیزی زیادہ ہوتی چلی جاتی تھی اور ہر نسل ان میں اپنی خواہشات جذبات اور امنگوں کو داخل کر کے ان کی حقیقت اور ماہیت کو بدل دیتی تھی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ تین نسلوں کے بعد زبانی روایات میں صداقت بہت کم رہ جاتی ہے اور اضافے زیادہ ہو جاتے ہیں۔" (۱۳)

وَلے اس کا ہرگز مطلب یہ بھی نہ ہے کہ زبانی تاریخ کی بالکل اہمیت ہی نہیں ہے کہ زبانی تاریخ کی بالکل اہمیت ہی نہیں ہے، بل کہ دورِ جدید میں زبانی تاریخ کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ جن ممالک میں آمرانہ یا اِکلا شخصی حکومتیں قائم ہیں اور جہاں تاریخ بیان کرنے والا ایک خاص وقت میں خشیہ و ہراس کی وجہ سے عوام کی جدوجہد یا دیگر معاملات کو تحریری طور پر بیان نہیں کر سکتا۔ وہاں وہ تاریخ زبانی طور پر تاریخ دانوں اور عوام کے سینوں میں محفوظ رہتی ہے، پھر آنے والے وقتوں میں تاریخ نگاروں کا یہ کام ہوتا ہے کہ اُن زبانی روایات کو تحریری صورت میں ڈھال کر، تاریخ کی تشکیل کو مکمل کرتے ہیں۔ جس سے تاریخ بھی محفوظ رہتی ہے اور تاریخ نگاروں کو بھی کسی ضِیق کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ چناں چہ اس نسبت سے تاریخ بیان کرنے والا، جسے عام طور پر "مؤرخ، تاریخ نگار، تاریخ داں یا تاریخ نویس" (Historian, Historiographer or Chronicler) کہتے ہیں، اُس کا انتہائی بنیادی کردار سامنے آتا ہے۔ جو ایک طرف تو عامۃ الناس، قارئین اور محققین تک تاریخ

پہنچانے کا یکتا ذریعہ ہوتا ہے، وہیں دوسری طرف تاریخی حقائق کو درستی سے پیش کرنا بھی اُسی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس قدر حقانیت سے تاریخ بیان کرتا ہے یا کس طور پیش کی گئی سرگزشت کی سند مستند ہے، اس تمام کا دارومدار مؤرخ پر ہوتا ہے۔

مؤرخین کے توسط سے باقاعدہ تحریری صورت میں تاریخ سے قبل زبانی تاریخ کتنی پارینہ ہے، اس متعلق تاریخ خود قریباً خاموش ہے، لیکن تاریخ نگاری کے ابتدائی نقوش؛"قدیم داستان گوئی، دیومالائی کہانیوں، اساطیر اور مذہبی و الہامی کتابوں" میں ملتے ہیں، جنہیں انسان کی تاریخ کے ابتدائی تاریخی مآخذ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ نہ صرف یہ بل کہ انسان نے ابتدا میں اپنے ہی تخیل کو اپنی تاریخ کی تشکیل کے لیے اساسی ماخذ کے طور پر استعمال کیا۔ بہت سی اقوام نے بدایت اپنی تاریخ تخیل کے زور پر دیومالائی حالات اور حادثات سے لکھی اور کچھ نے اپنے حالات کو اپنی ہی الہامی کتب کے متون میں شامل کرنا شروع کیا، جن کی اولین مثالیں قریباً "۲۰۰۰ ق۔م" کے آس پاس ملتی ہیں۔ بیسویں صدی کے متین امریکی تاریخ دان اور محقق:"سر ہربرٹ بٹر فیلڈ" (Sir Herbert Buterfield) کی کتاب:"دی اوریجنز آف ہسٹری"(The Origins of History) کے مطالعہ سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اقوامِ عالم میں سب سے پہلے تاریخ لکھنے کا شعور "یہودی قوم"(Jewish Nation) میں "۵۵۰ سے ۵۰۰ ق۔م" کے دوران پیدا ہوا۔ (جس کی وجہ بادشاہ بخت نصر کا حملہ اور اس حملے میں یہودی رہنماؤں کا قید ہونا بنا تو یہودیوں کو احساس ہوا کہ ان کی تاریخ ایک جگہ تھم گئی ہے۔ بعد ازاں جب ایرانی شہنشاہ نے یہودیوں کو قید سے چھڑایا تو وہ تاریخ لکھنے کی طرف راغب ہوئے۔) یہودیوں کے علاوہ بالترتیب "یونانی، چینی اور مسیحی اقوام" نے ابتداً تاریخ کی ترقیم میں اہم کردار ادا کیا اور اپنی اپنی شناخت کو مستقبل میں قائم رکھنے کے لیے تحاریر لکھیں، جو تاریخ کی ابتدائی ابتری صورتیں قرار پائیں۔

تاریخ نے جو ارتقائی سفر "۲۰۰۰ ق۔م سے ۵۰۰ ق۔م" تک پارچوں میں طے کیا وہ بالآخر ۴۳۰ ق۔م میں باقاعدہ اپنی پہلی صورت میں پہنچا۔ جس کا سہرا "قدیم یونان"(Ancient Greek) کے مؤرخ "ہیروڈوٹس"

(Herodotus) کے سر سجا۔ ہیروڈوٹس، کی حیثیت باقاعدہ پہلے نام ور مؤرخ کی ہے، جو "۴۸۴ق۔م" میں قدیم یونان کے شہر "ھالی کارناسس"(Halicarnassus) میں پیدا ہوا اور قدیم یونان میں ہی "تھریِی"(Thurii) کے مقام پر "۴۲۵ق۔م" میں فوت ہوا۔ اس کی سب سے اہم کتاب جو تاریخ کی بھی سب سے اولین تصنیف تسلیم کی جاتی ہے، وہ "یونانی زبان"(Greek Language) میں "دی ہسٹوریز"(The Histories) ہے۔ جسے مزید قدیم یونانی میں "ہسٹوریائی"(Historia) کہا جاتا ہے اور اُردو میں اس کے عنوان کے معنی "تاریخیں" بنتا ہے۔ (ویسے تو عنوانات کا ترجمہ کرنا غیر مناسب عمل ہے، لیکن یہاں وضاحت کی غرض سے معنی بتایا گیا ہے۔) یہ کتاب تقریباً "۴۳۰ق۔م" میں پہلی بار شائع ہوئی۔ یوں یہ پہلو بھی فاش ہوتا ہے کہ تاریخ کی باقرینہ پہلی دستاویز آج سے قریباً: **"دو ہزار چار سو باون" (۲۴۵۲) برس** پرانی ہے۔ "رابن واٹر فیلڈ" (Robin Water Firld) "دی ہسٹوریز" کے انگریزی ترجمہ میں "ہیروڈوٹس"(Herodotus) اور اس کی اس اولین کتاب کے متعلق رائے دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "In one very obvious sense, Herodotus, Histories are certainly history, since stories from the past Provide Their basic content…. The longer, more published stories, or Logoi, in Herodotus, Histories certainly retell past event, both Greek, and barbarian, but hey do so with much included that is not today customarily found in historical narrative." (14)

یعنی "رابن واٹر فیلڈ" بعض عوامل خاص کر تاریخی بیانیہ میں "ہیروڈوٹس" کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ان کے مطابق وہ چند خصوصیات آج کے جدید مؤرخین میں بھی نہیں ہیں۔ ہیروڈوٹس، کی ہی تاریخ کے اردو ترجمے میں "یاسر جواد" اپنے خیالات کا اظہار الفاظ میں کرتے ہیں:

"سسرو (Cicero) نے ہیروڈوٹس کو "بابائے تاریخ" قرار دیا ہے۔ وہ واقعی اپنے سے بعد کے مؤرخین کا جد امجد تھا۔ اگرچہ اس کا طریقہ کار موجودہ محققین کی توقعات کے مطابق نہیں، مگر ماضی کے ایک قابلِ بھروسہ بیان کے لیے اس کی کھوج (جو دیوتاؤں کی بجائے انسانوں پر مرکوز ہے) گزرے زمانے کے تنقیدی مطالعہ کا نکتہ آغاز ہے۔ اس کی "Histories" کو کسی ایک زمرے میں رکھنا آسان نہیں، کیوں کہ یہ جغرافیہ، نسلیات اور حیاتیات کا ملغوبہ ہیں۔" (۱۵)

ہیروڈوٹس کے علاوہ تاریخ کے ابتدائی مؤرخین یں "تھیوسی ڈائیڈز"(Thucydides) پیدائش: ۴۶۰ ق۔م، وفات: ۴۰۰ ق۔م، "زینوفن" (Xenophon) پیدائش: ۴۳۰ ق۔م، وفات: ۳۵۴ یا ۳۵۵ ق۔م، "دوریس آف سیموس" (Duris of Samos)، پیدائش: ۳۵۰ق۔م، وفات: ۲۸۱ق۔م، "سیما کی یان"(Sima Qian)، پیدائش: ۱۴۵، ق۔م، وفات: ۸۶ق۔م، "پوزی ڈونیئس"(Posidonius)، پیدائش: ۱۳۵، ق۔م، وفات: ۵۱ق۔م، "گائس جولیس سیزر یا کائیزر"، (Gaius Julius Casesar,) پیدائش: ۱۰۰ ق۔م، وفات: ۴۴ق۔م، "تی تُوس لی ویوس"(Titus Livius) پیدائش: ۵۹ق۔م، وفات: ۱۷ء، "سترے بو" (Strabo)، پیدائش: ۶۳ق۔م یا ۶۴ق۔م، وفات: ۲۴ء، "تے بیرُیوس کلائی دیوس کائیزاُوگسٹس جرمانی کٹس" (Tiberius Claudius Caesar Augustus Germanicus)، پیدائش: ۱۰ق۔م، وفات: ۵۴ء، "تی تُوس فلاویس جوزے فُس"(Titus Flavius Tosephus)، پیدائش: ۳۷ء، وفات: ۱۰۰ء، اور "یوسے بیس آف سی زے ریا"(Eusebius of Caesarea) پیدائش: ۲۶۰ء سے ۲۶۵ء کے درمیان، وفات: ۳۳۹ء کے نام انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ جنھوں نے تاریخ کا اساسی ڈھانچہ استوار کرنے اور تاریخ کو بنیادیں فراہم کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔

تحتائی مؤرخین کے توسط سے رقم کی گئی تاریخیں زیادہ تر "مذہبی، شخصی، حکم رانی، معرکۂ رُستخیز، فتوحات اور اقوام کے حالات وواقعات "پر مشمول تھیں۔ پس ازاں تاریخ نے اپنا دائرہ کار وسیع کیا اور تاریخ کے مزید شعبہ جات سامنے آئے۔ تاریخ جن دیگر اقسام و درجہ بندیوں (Types and Classifications) میں جدت سے پروان چڑھی اُن میں: "فلسفہ کی تاریخ"(History of Philosophy)، "فلسفیوں کی تاریخ" (History of Philosophers)، "مفکرین کی تاریخ" (A history of Thinkers) ، "نظریات کی تاریخ" (A History of Ideas)، "علوم کی تاریخ"(History of Knowledge or Studies)، "فنون کی تاریخ" (History of the Arts)، ادب کی تاریخ(History of Literature)، "زبان کی تاریخ"، (History of Languages)، "لسانیات کی تاریخ"،(History of Linguistics)، "سائنس کی تاریخ" (History of Science)، "ایجادات کی تاریخ"(History of Inventions)، "طب کی تاریخ" (History of Medical)، "سیاست کی تاریخ" (History of Politics)، "معیشت کی تاریخ"، (History of Economics)، "عمرانیات کی تاریخ"،(History of Sociology)، "تہذیب کی تاریخ" (history of Civilization)، "ثقافت کی تاریخ"(History of Culture)، "علاقوں کی تاریخ" (History of Territories of Regions، "ادوار کی تاریخ"،(History of Eras)، "اقوام کی تاریخ" (History of Nations)، "ماحولیات کی تاریخ" (History of Ecology)، "جغرافیہ کی تاریخ"، (History of Geography)، "افواج کی تاریخ" (History of Militaries)، "جنگوں کی تاریخ" (History of Wars)، حکم رانوں و بادشاہی کی تاریخ (History of Rulers and Kingdoms)، "صحافت کی تاریخ"(History of Journalism)، "ابلاغِ عامہ کی تاریخ"، (History of Mass Communication)، "جنس کی تاریخ" (History of Gender)، "عورتوں و حقوقِ نسواں کی تاریخ" (History of Women and Feminism or Women’s rights)، "الہامی کتب کی تاریخ"

(A History of "الحاد کی تاریخ" اور (History of Scriptures or Revealed Books) (Atheism، جیسی تاریخ کی اقسام انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔

تشکیلِ تاریخ کی تعمّق پر کھ کی جائے تو تاریخ کے جوہری کالبُد میں سب سے اہم اساسی عنصر "واقعہ" (Incident) سامنے آتا ہے اور اس تشکیل کو مزید استوار اس "واقعہ کا بیان" کرتا ہے۔ یہاں کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں، جیسا کہ: کیا تاریخ تمام واقعات کا احاطہ اور بیان کرتی ہے؟ کیا تاریخ کے لیے ہر واقعہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے؟ کہ ہر واقعہ کو ہر صورت تاریخ میں بیان کیا جائے۔ تو ان کے جوابات کچھ یوں ہیں کہ: تاریخی سرمایہ ہمیشہ سے اسی بے مائیگی کا شکار رہا ہے کہ اس میں تمام واقعات کا بیان نہیں ملتا۔ تا آں کہ بے بہا تواریخ میں بہت سے ان واقعات کا اندراج نہ ہے کہ جو اس صورت احوال کے لیے از حد ضروری ہیں۔ دوسرا یہ کہ ماضی میں ہونے والا ہر واقعہ تاریخ کے لیے اہم نہیں ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے اس تمام کا بکھان تاریخ میں کیا جائے، بل کہ تاریخ میں پیش کرنے کے لیے منتخبہ واقعات کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے، جنہیں خاص تہذیب کے تحت پیش کیا جاتا ہے اور ان کا کسی نہ کسی طور سُود مند ہونا لازم ہے۔ تاریخ میں واقعات کو بیان کرنے کے دو اساسی اغراض ہیں۔ **اول:** اس کے ذریعے تمام چیدہ ترو جملہ متعلقات محفوظ ہو جائیں اور مطالعہ تاریخ پر قارئین تلک ان کی بہ آسانی رسائی ہو، وہ ایک تسلسل میں ابتداء یعنی ماضی سے حال تک کو علی الا تصال مفصل جان سکیں۔ **دوم:** اس بیان کے ذریعے کوئی نہ کوئی تاریخی نتیجہ ضرور اخذ ہو، جس سے آئندہ کوئی نہ کوئی اضافہ ضرور کیا جاسکے ۔ بایں، جہاں تک معاملہ ہے احراز کا تو اس میں بھی چناؤ واجب ہے۔ کیوں کہ تاریخی عمل کے دوران ہر پل متعدد ایسے واقعات ہو رہے ہیں کہ جنہیں یاد رکھنا کسی طور ضروری نہیں ہے۔ ہاں بعض صورتوں میں عامیانہ یا یک ساں واقعات کا اجمالی بیان کرنے میں کوئی احتراز نہیں ہے۔ علاوہ بریں جہاں تک واقعات کو وقعت کے ضمن میں دیکھا جائے، تو تاریخ میں وہ واقعات ہی اہمیت کے حامل ٹھہرتے ہیں کہ جن کے ذریعے معاشرے پر بالعموم معاشی، سیاسی، معاشرتی، سماجی، یا ثقافتی اثرات وغیرہ مرتب ہوں، یا جن سے کوئی نہ کوئی مثبت اَنمان ضرور اخذ کیا

جاسکے۔ یہاں ایک اور اَہم سوال یہ سامنے آتا ہے کہ: کیا صرف واقعات اور متعلقاتِ واقعات کا بیان ہی کا نام تاریخ ہے؟ یا کیا صرف ان واقعات کو پیش کرنا ہی تاریخ کہلاتا ہے! تو اس کا بال تفصیل جواب ہمیں "فلسفۂ تاریخ" (Philosophy of History) دیتا ہے۔ جو اولاً ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ صرف واقعات کو بیان کرنا، تاریخ نہیں ہے، بل کہ تاریخ کا دائرہ عمل بے حد وسعت کا حامل ہے، جس کا حصار بہ افراط ہے۔ جیسے فلسفے کا از خود اور فلسفے کی ہر شاخ کا آغاز، مبادی سوالات سے ہوتا ہے، ویسے ہی فلسفۂ تاریخ کا آغاز بھی اسی ابجد سوال سے ہوتا ہے کہ: **تاریخ کیا ہے؟** جس کے اپرم پار جوابات تاریخ کے فلسفیوں نے دیئے ہیں۔ جن جوابات کا اختصار سے احاطہ کرنے سے پیش تر، اگر اس "فلسفۂ تاریخ" کی اصطلاح کا جائزہ لیا جائے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کی اساس کے متعلق غور وخوض تو امتدادِ زمانہ سے چلا آرہا تھا۔ مگر اس اصطلاح کو باقاعدہ پہلی بار فرانسیسی فلسفی: "فونسوا ماہی یارُو ہے"((Francois-Marie Arovet (جو کہ اس کے برعکس اپنے فرضی قلمی نام: "والٹیئر "(Voltaire) سے زیادہ معروف ہے۔) نے پہلی بار اپنی کتاب بعنوان: "LA PHILOSOPHIE DE L' HISTOIRE" میں استعمال کیا۔ جس کی پہلی اشاعت ۱۷۶۵ء میں فرانسیسی زبان میں "ایم سٹر ڈیم" (Amsterdam) میں ہوئی۔ اس کتاب کے عنوان کا اُردو معنی ہی "تاریخ کا فلسفہ" بنتے ہیں، یوں فلسفۂ تاریخ کی اصطلاح کا استعمال پہلی بار "والٹیئر" نے اسی نام سے کتاب رقم کر کے کیا۔ چیک ری پبلک، کے معروف ماہرِ آثارِ قدیمہ و مؤرخ "زَڈینیک وشی چیک" (Zdenek Vasicek) فلسفۂ تاریخ کی اصطلاح کی وضاحت، ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "What do we understand by philosophy of history? The term is not exact. Its fozziness may suggest that it is perhaps a collective concept it was used first by Abbe Bazin in the title of his book. La philosophie do I'histoire published in Amsterdam in 1765. The Author was in fact F. M. Arovet, usually known as

> Voltaire philosophy of history has many near-synonyms, notably: philosophy, (meta) theory of history, theoretical history, logic of history, meta history, historiosophy, and anachronic historiography.” (16)

زڈینیک وشی چیک، کے مطابق فلسفۂ تاریخ کی اصطلاح کا استعمال تو سب سے پہلے والٹیئر نے کیا، مگر اُس کے مطابق یہ اصطلاح خاص قطعی نہیں ہے۔ اس کا دیجور پس منظر یہ اشکار کرتا ہے کہ اس اصطلاح نے اجتماعی تصور کے طور پر رواج پایا، یعنی اس کی تکوین کی قرینہ علامات نہیں ملتیں۔ والٹیئر نے اِسے ان معنوں میں استعمال کیا کہ تاریخ کا مقصد محض یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعے صرف واقعات بیان کیے جائیں، بل کہ اُسے تحریر کرنے والا یعنی مؤرخ ان واقعات پر غور و خوض بھی کرے اور ان سے کوئی نہ کوئی نتیجہ بھی اخذ کرے۔ والٹیئر، تاریخ کے توسط سے "آزادی" اور "فکر" کے مطالعہ کا داعی تھا۔ بعد زاں اس اصطلاح کو شہرت دوام "جارج ولہیلم فریڈرش ہیگل"(Georg Wilhelm Friedrich Hegel)، نے بخشی۔ جس نے اسے آفاقی و عالمی معنوں میں استعمال کیا اور اُس کے بعد اس نے باقاعدہ چلن پکڑا۔ ساتھ ہی اس کی ترویج میں تیسرا اہم کردار انیسویں صدی کے عمرانی فلسفے کے ایک فرانسیسی بنیاد گزار فلسفی، "اگست کامٹ"(Auguste Comte) کے "ارتقائی نظریے" (Evolutionary Theory) اور تحریک،" مثبتیت "(Positivism)نے ادا کیا۔ ثبوتیت پسندوں (Positivists) ،نے فلسفۂ تاریخ کو ایک نیا ڈھنگ عطا کیا۔ وہ تاریخ کو فلسفہ ماننے کے بجائے اُسے "تجرباتی سائنس "ماننے پر مُصر تھے۔ یوں ان کے احیا سے تاریخ نے فلسفہ سے سائنس کی حیثیت پائی اور اسے اِس طور پر کھا جانے لگا۔ ثبوتیت پسندوں کا خیال تھا کہ تاریخ کے واقعات کی تہہ میں کچھ "یکساں نوعیت کے قوانین" (Uniform Laws) کام کر رہے ہیں اور تاریخ کا کام یہ ہے کہ وہ ان قوانین کی دریافت کرے۔ ثبوتیت پسندوں کے مطابق تاریخ کا کام یہ ہے کہ وہ ان قوانین کی دریافت کرے۔ ثبوتیت پسندوں کے تاریخ کے

نظریات اور والٹیئر و جارج و لہیلم فریڈرش ہیگل کی فلسفۂ تاریخ کی اصطلاح کے رواج سے **متعلق** "رابن جارج کولنگ ووڈ"(Robin George Collingwood) کچھ یوں لکھتے ہیں:

> "The name Philosophy of history was invented in the eighteenth century by Voltaire, who meant by it no more than critical or scientific history, a type of historical thinking in which the historian made up his mind for himself instead of repeating whatever stories he found in old books. The same name was used by Hegel and other writers at the end of the eighteenth century; but they gave it a different sense and regarded it as meaning simply universal or world history. A third use of the phrase is found in several nineteenth-century positivists for whom the philosophy of history was the discovery of general laws governing the course of the events which it was history's business to reount." (17)

بایں لحاظ یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ تاریخ کو فلسفہ کے قالب میں ڈھالنے اور اسے بہ حیثیت فلسفہ زیرِ بحث لانے میں دیگر مفکرین کے ساتھ ساتھ بالا بیان کیے گئے تین مؤرخین اور فلسفیوں اور ایک سماجی ارتقائی نظریے کی تحریک نے اہم کردار ادا کیا۔ تاریخ کے فلسفہ کے ارتقاء، نُمو اور تشکیل میں جن دانش وروں، مؤرخوں اور فلسفیوں کے نام اہم ہیں۔ ان کی فہرست عصری ترتیب کے لحاظ سے ذیل میں پیش کی جارہی ہے:

سن وفات	سن پیدائش	نام	نمبر شمار
۱۰۳۰ء	۹۳۲ء	ابو علی احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ الرازی (Abu Ali Ahmad Bin Muhammad Bi Yaqub Miskawayb Alrazi)	١.
۱۴۰۶ء	۱۳۳۲ء	ابو زید عبد الرحمٰن بن محمد بن خلدون ولی الدین التونسی الحضرمی الاشبیلی المالکی (Abu Zayd Abd-ul_rahman Bin Muhammad Bin Khaldun Wali-ul-Din al-tunsi Al-Hadrami Al-Shabeli Al-Malki)	٢.
۱۶۵۰ء	۱۵۹۶ء	رینے ڈی کارٹ (Rene Descarte)	٣.
۱۷۰۴ء	۱۶۳۲ء	جان لاک (John Locke)	۴.
۱۷۴۴ء	۱۶۶۸ء	جیامبا تیستا ویچو (Giambattista Vico)	۵.
۱۷۵۳ء	۱۶۸۵ء	جارج برکلے (George Berkeley)	٦.
۱۷۷۸ء	۱۶۹۴ء	فونسو اماہی یا اُوہے / والٹیئر (Francois-Marie Arouet/ Voltaire)	۷.
۱۷۷۶ء	۱۷۱۱ء	ڈیوڈ ہیوم (David Hume)	٨.
۱۸۰۴ء	۱۷۲۴ء	ایمانوئل کانٹ (Immanuel Kant)	٩.
۱۸۰۳ء	۱۷۴۴ء	جوہان گوٹ فریڈ ہرڈر (Johann Gottfried Herder)	١٠.
۱۸۰۵ء	۱۷۸۹ء	جوہان کرسٹوف فریڈرش وون شلر (Johann Christoph Friedrich Von Schiller)	١١.

۱۸۱۴ء	۱۷۶۲ء	جوہان گوٹ لیب فشٹے (Johann Gottlieb Fichte)	۱۲.
۱۸۳۱ء	۱۷۷۰ء	جارج ولہیلم فریڈرش ہیگل (Georg Hilhelm Friedrich Hegel)	۱۳.
۱۸۵۴ء	۱۷۷۵ء	فریڈرش ولہیلم جوزف شیلنگ (Freidrich Wilhelm Joseph Schelling)	۱۴.
۱۸۸۶ء	۱۷۹۵ء	لیوپولڈ وون رینک (Leopold Von Ranke)	۱۵.
۱۸۵۷ء	۱۷۹۸ء	اگست کامٹ (Auguste Comte)	۱۶.
۱۸۸۲ء	۱۸۰۹ء	چارلس رابرٹ ڈارون (Charles Robert Darwin)	۱۷.
۱۸۹۵ء	۱۸۲۰ء	کارل ہینرش مارکس (Karl Heinrich Marx)	۱۸.
۱۸۹۷ء	۱۸۱۸ء	کارل جیکب کرسٹوف برک ھارٹ (Carl Jacob Christoph Burckhardt)	۱۹.
۱۸۹۵ء	۱۸۲۰ء	فریڈرش اینگلز (Friedrich Engels)	۲۰.
۱۹۲۴ء	۱۸۴۶ء	فرنسس ہربرٹ بریڈلی (Francis Herbert Bradley)	۲۱.
۱۹۵۲ء	۱۸۶۶ء	بنی ڈیٹو کروچے (Benedetto Croce)	۲۲.
۱۹۷۰ء	۱۸۷۲ء	برٹرینڈ آرتھر ولیم رسل (Bertrand Arthur William Russell)	۲۳.
۱۹۳۶ء	۱۸۸۰ء	اوسوالڈ آرنلڈ گوٹ فریڈ اسپینگلر (Oswald Arnold Gottfried Spengler)	۲۴.
۱۹۸۱ء	۱۸۸۵ء	ولیم جیمز ڈیورانٹ (William James Durant)	۲۵.

۲۶.	رابن جارج کولنگ وڈ (Robin George Collingwood)	۱۸۸۹ء	۱۹۴۳ء
۲۷.	آرنلڈ جوزف ٹائن بی (Arnold Joseph J Toynbee)	۱۸۸۹ء	۱۹۷۵ء
۲۸.	پیٹیرم الیگزینڈرووچ سوروکن (Pitirim Alexanderovich Sorokin)	۱۸۸۹ء	۱۹۶۸ء
۲۹.	ولیم کیتھ چیمبرز گھتری (William Keith Chambers Gothrie)	۱۹۰۶ء	۱۹۸۱ء
۳۰.	سر عیسعیاہ برلن (Sir Isaiah Berlin)	۱۹۰۹ء	۱۹۹۷ء
۳۱.	یووال نوح ہراری (Yuval Noah Harair)	۱۹۷۶ء	بقیدِ حیات

نوشت بالا فہرست، ایک ممتد سرمایے میں سے صرف ان اہم ناموں پر مشمول ہے، جنھوں نے تاریخ کو بہ مقدرتِ فلسفہ زیرِ بحث لانے میں اور اس کا اساسی جہاتی تشکیل میں، بدایتِ مباحث سے حال تلک بدرجہ غایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ (وگرنہ تمام مؤرخین اور فلسفیوں کی ایک اَتم فہرست ہے، جو یہاں ضخامت کے تجاوز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پیش نہیں کی گئی، نیز جن انتہائی اہم کا بیان ضروری تھا۔ اُن کا اندراج فہرست میں کر دیا ہے۔) اس انتخاب میں بیش تر دانش وروں اور فلسفیوں کا تعلق: "جرمنی، انگلستان، روس، یونان، امریکہ، تیونس اور ایران" جیسے ممالک سے ہے اور ماسوائے چند ایک کے ان کا عہد: "اٹھارہویں سے بیسویں صدی عیسویں" (Eighteenth to Twentieth Century A.D.) کے درمیان بنتا ہے، جس سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تاریخ کا یہ فلسفہ اس عرصے کے دوران ان خطوں میں پروان چڑھ کر آج اس حالت میں ہم تلک پہنچا ہے۔ انہیں فلسفیوں کے توسط سے تاریخ کی فلسفیانہ اقسام بھی کی گئی ہیں۔ (جیسے بالا صفحات میں تاریخ کی موضوعاتی اقسام بیان کی گئی ہیں)۔ یہ درجہ بندیاں جہاں ایک طرف تاریخ کی تقسیم کرتی ہیں، وہیں یہ عصری تناظر کو بھی مدِ نظر رکھتی ہیں۔ مرادیہ کہ کن کن ادوار میں کس کس طرح تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے تاریخ کے معتمد فلسفی: "جارج ولہیلم فریڈرش

ہیگل" (Georg Wilhelm Friedrich Hegel) کیٰ کی گئی تقسیم اہمیت کی حامل ہے۔ وہ تاریخ کو تین درجات میں منقسم کرتے ہیں۔ وہ تین اقسام یہ ہیں:

۱. قدیمی تاریخ(Original History)

۲. تخیلاتی تاریخ(Reflective History)

۳. فلسفیانہ تاریخ(Philosophical History) (۱۸)

قدیمی تاریخ یا ہم عصر تاریخ(Original History) ، تاریخ کی وہ پہلی صورت ہے کہ جس سے تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نوع کی تاریخ میں ہم عصر مؤرخ اپنے ہی دور کی تاریخ کو رقم کرتا ہے۔ یہ تاریخ اساسی ماخذ کا کام بھی دیتی ہے۔ اس تاریخ کا بیش تر حصہ اس وقت کے لوگوں کے کارناموں، واقعات اور معاشرے کی ان کیفیات کے بیان پر ہوتا ہے، جو اُس وقت مؤرخ کے سامنے ہوں اور ان کے بارے میں اُس کے جذبات تموجی ہوں۔ یعنی مؤرخ صرف یہ کرتا ہے کہ اس زمانے میں اُن کے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے اسے صرف تاریخ کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ اس نوع کی ابتدا "ہیروڈوٹس" (Herodotus) اور "تھیوسی ڈائیڈز" (Thucydides) سے ہوتی ہے۔ ہیگل کے نزدیک اس دور کے قابلِ ذکر یہ دو اہم نام ہی ہیں۔

تخیلاتی تاریخ (Reflective History) ، تاریخ کی دوسری قسم ہے۔ اس نوع میں مؤرخ ماضی قریب و بعید کے واقعات نکال کر لاتا ہے اور انہیں تاریخ کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ حالاتِ محض کا بیان ہوتی ہے، بل کہ تخیلاتی تاریخ میں ہم عصر مؤرخوں اور تاریخ کے ماخذوں کی روشنی میں واقعات کا تجزیہ کر کے تنقیدی نظر سے ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ تاریخ ہر دور اور زمانہ میں بدلتی رہتی ہے اور بدلاؤ کو روایت میں منتقل کرتی رہتی ہے۔ اس منتقلی سے وہ نئی زندگی پید کرتی ہے، جو اسے زندہ رکھنے اور دل چسپ بنانے میں مدد دیتی ہے۔ ہیگل، کے مطابق تخیلاتی تاریخ کی روح حال سے ماورا ہوتی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق تخیلاتی تاریخ میں مؤرخ ماضی کے واقعات کو حال کی روایات اور اقدار میں رنگ کر انہیں پیش کرتا ہے۔ ہیگل،

تاریخ کے اس دوسرے دور کے جن اہم موٴرخین کے نام گنواتا ہے، ان میں "تی توس لی ویوس" (Titus Livius) ، "ڈیوڈورس سیکولس"(Diodorus Siculus) اور "جوہانز وان مُلر" (Johannes Von Muller)کے نام شامل ہیں۔

فلسفیانہ تاریخ(Philosophical History)، تاریخ کی "ہیگل" کے مطابق تیسری قسم ہے۔ تاریخ کی یہ تیسری قسم تاریخ کو عقلی بنیادوں پر پرکھنے کا تقاضا کرتی ہے اور عقل کی بنیاد پر ہی عالمی روح جو دراصل ایک ہے، مگر ماحول کا سہارا لیے ہوئے اپنے آپ کو مختلف ظاہر کرتی ہے، اسے یک جا کر کے تاریخ کی اس قسم کے ذریعے ظاہر و بیان کیا جاتا ہے۔ یہ قسم تاریخی واقعات کے ڈھیر سے انسانی ذہن، شعور، فکر اور نظریات کی اِستعِلا کا مطالعہ کرتی ہے اور ان کی تہہ میں جو جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں، اُن سے پردہ اٹھاتی ہے، جس کی بنا پر تاریخ اپنی اصل وواضح شکل وصورت اور تنت خال وخط میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس قسم کا ایک اور اہم خاصہ یہ ہے کہ یہ موٴرخ سے قاری تک کو اس طور رُدغم کرتی ہے کہ قاری خود کو اس متن کا حصہ سمجھنے لگ جاتا ہے۔ ہیگل، تاریخ کی اس قسم کی تصریح میں نہ صرف توضیحِ نوع سے کام لیتا ہے، بل کہ وہ اسی کے توسط سے اپنی شہرہ آفاق تصنیف: "فلسفہ تاریخ"(The Philosophy of History) میں تاریخ کے فلسفہ اور اس کے عناصر سے متعلق اپنا مفصل نقطہ نظر بھی پیش کرتا ہے۔ اپنی ان تینوں بیان کردہ تاریخ کی اقسام کے متعلق "جارج ولہیلم فریڈرش ہیگل"(Georg Whilhelm Friendrich Hegel)یوں لکھتا ہے:

> “The Third Kind of History the Philosophical. No explanation was needed of the two previous classes; their nature was self-evident. It is otherwise with this last, which certainly seems to require an exposition or justification. The most general definition that can be given, is, that the Philosophy of History means nothing but the thoughtful consideration of it.” (19)

یوں "ہیگل" تاریخ کی تینوں صورتوں کا لُب لباب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ؛ تاریخ کی پہلی دو صورتیں ایسی ہیں کہ جن کا کردار اُن کے ناموں سے ہی واضح ہو جاتا ہے۔ اِلا تاریخ کی اس تیسری صورت کا معاملہ دگر ہے اور اس کی توضیح کی ضرورت ہے۔ ہیگل، اس کی یک سطرح تصریح یوں بیان کرتا ہے کہ؛"**تاریخ کے معنی بجز اس کے کچھ نہیں کہ، تاریخ پر حاذِق غوروخوض کیا جائے**"، قصہ کوتاہ تاریخ کے تشکیلی عناصر کو فلسفیانہ تناظر میں پرکھا جائے اور غوروخوض و پرکھنے کا یہ عمل بارہا گہرائی سے دوہرایا جائے، جو اس پورے تاریخی نظام کو بہتر سے بہتر کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ تاریخ کی اس تیسری قسم کے بیان کے دوران "ہیگل" صرف اپنے نظریات سے رجوع کرتے ہوئے بحث کو آگے بڑھاتا ہے اور نظری تناظر تک اسے محدود رکھتا ہے اور اس دور کے اہم مؤرخین کے ذکر سے گریز کرتا ہے۔ (ہاں اگر کسی مؤرخ کا حوالہ ہے بھی تو وہ بھی مثال کی غرض سے ادوار کی قید کے بغیر، نظریے کی تفہیم کے لیے ہے، نہ کہ مؤرخین کی اہمیت بیان کرنے کی منشا سے۔) پس یہاں بھی ان کی بے احتیاجی کے باعث انہیں پیش نہیں کیا گیا۔

فلسفۂ تاریخ، ویسے تو ہر نوع فلسفہ کی طرح بدرجہا کثیر جہاتی ہے، لیکن اس کا اساسی و مبادی سروکار "دو اَبعاد" سے ہے۔ **پہلا یہ کہ؛** تاریخ کی بُنت کیسے ہوتی ہے؟ یعنی اس کے نظامِ بیان میں کون کون سے اسباب اور عناصر پنہاں ہوتے ہیں اور کیسے وہ تمام ایک دوسرے سے باہم منسلک ہو کر تشکیلی ارتقا کرتے ہیں اور ان میں سے کون کس کس طرح اہمیت کے حامل ہیں! **دوسرا یہ کہ؛** تاریخ کا اساسی داعیہ کیا ہے؟ یعنی اس سے کون کون سے مقاصد اور کس کس طرح حاصل کیے جاتے ہیں اور اس کے بیان سے زیستِ انسانی، اقوامِ عالم، معاشروں، ثقافتوں اور تہذیبوں میں کیا کیا تبدیلیاں رُونما ہوتی ہیں! تاریخ (History) کس طرح ترکیب پاتی ہے! اس متعلق جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ متعدد تاریخ دانوں، فلسفیوں اور مؤرخین نے بے بہا "نظریات" (Theories) دیے ہیں۔ ان میں سے اگر خالصتاً تاریخ کے فلسفیوں کے نظریات کا بغور مطالعہ بھی کیا جائے تو ان کے بھی انیک متفرق نظریات سامنے آتے ہیں۔ ان تمام نظریات کو مطالعہ سے چھانٹی کیا جائے تو، کچھ ایسے نظریے بھی ہیں کہ جنہیں

ایک سے زائد بار کئی فلسفیوں نے معمولی ترامیم سے پیش کیا ہے۔ بدیں وجہ ان میں سے جو انتہائی موثق ہمہ گیر نوعیت کے نظریات ہیں۔ ان کی تعداد قریباً "چار"(۴) کے قریب بنتی ہے۔ ان متفرق پیش کردہ چار اہم نظریات کو مابعد مطالعہ یہ نام دیے جاسکتے ہیں:

۱. تاریخ کا گردشی نظریہ (Cyclical Theory of History)

۲. تاریخ کا مذہبی یا عظیم خدائی نظریہ (Religious or Great GOD Theory of History)

۳. تاریخ کا ترقی کا نظریہ (The Development Thoery of History)

۴. تاریخ کا مادی نظریہ (Material Theory of History)

بالا نظریات کی تفہیم سے قبل اگر تاریخ کے عمل اور حرکت کو یک لفظی طریقوں میں بیان کیا جائے تو متعدد ماہرین کے نزدیک تاریخ عموماً "چار"(۴) طرائق میں حرکت کرتے ہوئے اپنا عمل جاری رکھتی ہے۔ یہ چار طرائق ہیں:

۱. پینڈولم (Pendulam)

۲. آرا (Seesaw)

۳. پہیہ (Wheel)

۴. تیر (Arrow)

متعدد نظریات میں تاریخ اُنہیں میں سے کسی نہ کسی ایک حرکت کے تحت اپنے آپ کو آگے بڑھاتی ہے۔ بالا بیان کیے گئے چار نظریات کا احوال پیش کیا جائے تو اُن میں: **"تاریخ کا گردشی نظریہ" (Cyclical Theory of History)** پارینہ ترین حیثیت کا حامل ہے۔ اس نظریے کے مطابق تاریخ ایک "پہیہ" (Wheel) کی طرح ایک دائرے میں گردش کرتی ہے۔ تاریخ جب پہیہ کی صورت میں ایک دائرے میں دورہ کرتی ہے، تو "پینڈولم" اور "آرے" کی طرح صرف دو سمتوں میں ہی حرکت نہیں کرتی، بل کہ یہ ایک کوتاہ

دائرے میں تسلسل کے ساتھ چکر لگاتی رہتی ہے اور اس کا یہ دورہ پورے دائرے میں ہوتا ہے۔ تاریخ کی یہ حرکت اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ ماضی اپنے آپ کو دوہراتا رہتا ہے۔ پس تاریخ کے گردشی نظریے میں بھی یہ پہلو سامنے رکھا جاتا ہے اور یہ نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو ہی دہراتی رہتی ہے۔ یعنی تاریخ میں گردشی نظریے کے مطابق تاریخ ساکتی لحاظ سے اپنی بُنت کا عمل ایسے کرتی ہے کہ یہ اس بُنائی میں اپنے مخصوص اجزائے ترکیبی کو ہی پیہم استعمال میں لاتے ہوئے اپنے آپ کو ایک خاص ڈھنگ پر اُستوار کرتی جاتی ہے۔ تاریخ کا گردش کا نظریہ ،سب سے پہلے "ابن خلدون" (Ibn e Khaldun) اور اس کے بعد "جیامباتیستا ویچو" (Giambattista Vico) نے پیش کیا۔ جیامباتیستا ویچو، کے تاریخ کے گردش کے نظریہ میں معمولی سا فرق یہ تھا کہ تاریخ یک سوئی میں اپنے آپ کو ان مقررہ دائروں میں نہیں دوہراتی، بل کہ وہ گردش کسی حد تک "خم دار" (Spiral) ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں تاریخ اپنے آپ کو یکسر نہیں دوہراتی، بل کہ ہر گردش میں اس کا راستہ اور رفتار متفرق ہوتی ہے۔ جس سے ہر بار وہ ایک نئی قوت سے اپنا سفر شروع کرتی ہے۔ تاریخ کا گردش کا نظریہ، انسانوں میں اس لیے مقبول اور قدیم ترین ہے کہ انسان کا "فطرت "(Nature) سے ازمنہ قدیم سے گہرا تعلق رہا ہے۔ بل کہ یوں کہہ لیا جائے کہ اس دھرتی پر پہلے انسان کے وجود سے ہی انسان فطرت سے وابستہ ہو گیا تو یہ غلط نہ ہو گا اور اس وابستگی سے انسان نے فطرت کے اس عمل پر تاریخی تناظر میں غور وخوض شروع کیا اور تاریخ کو محفوظ کرنے لگا، تو انسان نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ متعدد اہم واقعات ایسے ہوتے ہیں، جو بارہا وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ بہت سی ثقافتیں اور تہذیبیں اوج کمال پر پہنچتی ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ زوال کا شکار ہو جاتی ہیں اور بعض اُن میں سے پھر کچھ مدت کے بعد عروج پکڑ لیتی ہیں۔

اسی طرح ریاستیں، سلطنتیں، حکومتیں اور بادشاہیاں پیدا ہوتی ہیں اور کچھ مدت بعد فنا ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی وہ پھر سے اپنے آپ کو استوار کرتی ہیں۔ زندگی اور موت، عروج وزوال، جنگ اور امن، فتح وشکست اور ایسے بہت سے عوامل ہو بہو یا تھوڑی سی صورتیں بدل کر ایک دائرے میں وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ پس اس غور وفکر

اور ان عوامل نے تاریخ میں گردش کے نظریہ کو جنم دیا اور انسان اسی گردش کے نظریے میں اپنے نروان کی راہیں تلاش کرنے لگا۔ لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ نظریہ کوئی زیادہ سود مند بھی نہ رہا اور اس کی روشنی میں تاریخی تبدیلی کو سمجھنا بہت ہی دقیق امر ٹھہرا۔ جو تاریخی تبدیلی کے عمل کو انتہائی محدود کرنے کے مترادف قرار پایا۔

تاریخ کا مذہبی نظریہ (Religious Thoery of History) یا تاریخ کا عظیم خدائی نظریہ (Great GOD Theory of History)، تاریخ کا ایک اور کُہنہ نظریہ ہے۔ جسے "مذہبی" اور "خدائی" دونوں ناموں سے جانا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس نظریے کے نام سے ہی واضح ہے کہ اس کا بالواسطہ تعلق خدا اور مذہب سے ہے۔ لہٰذا جب گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ "ایک ان جانے خدا کے تصور" (The Concept of and Unknowable) نے جنم لیا۔ جس کا اظہار سب سے پہلے "یہودیوں"(Jewish) نے کیا۔ تو تاریخ میں بھی اس نظریے کا جنم ہوا۔ یہ خدا بہ ظاہر نظر تو نہ آتا تھا، مگر اس تصور کے مطابق اپنا وجود ہر جگہ رکھتا تھا اور وہی تمام کائنات کا مالک سمجھا جانے لگا، جو انسانوں کو نیکیوں پر جزا و انعام اور برائیوں پر سزا دیتا تھا۔ پس جب یہ عقیدہ مزید پروان چڑھا تو اس تصور نے مزید اِصابت سے قدم جمائے ہوئے انسانوں کو اس بات پر قائل کروایا کہ وہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور فطرت و تاریخ بھی خدا کی ہی تخلیق کردہ ہے اور سب کچھ اسی کی منشا کے مطابق ہو رہا ہے اور تاریخی عمل یعنی تاریخ کی تشکیل بھی ایک غایت کے تحت ہو رہی ہے۔ یعنی خدا کا اس کائنات کو چلانے کا ایک منصوبہ ہے اور اس کا ایک متعین پیشِ نہاد ہے۔ پس تاریخی عمل اس منصوبہ اور پیش نہاد کو پورا کر رہا ہے۔ نہ صرف یہ بل کہ اس نظریے کی ترویج کے بعد فطرتی، سماجی اور سیاسی تمام بدلاؤ اور ان کے نتائج کو خدا سے منسوب کیا جانے لگا کہ یہ تغیرات بھی کوئی خود ساختہ نہیں، بل کہ خدا کے منصوبے کی ہی تکمیل ہیں اور ان میں سے انسانی وسیلہ سے ہوئے تغیرات کے پیش نہاد بھی اصلاً خدا کے منصوبوں کو ہی سمجھا جانے لگا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

> "خدا تعالیٰ تاریخ کے ذریعہ جن منصوبوں کی تکمیل کر رہا ہے، یہ منصوبے انسان کے منصوبوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ انسان جو چاہتا ہے اسے وہ اپنے عمل سے پورا نہیں کر سکتا ہے، بل کہ وہ غیر شعوری طور پر خدا کے منصوبوں کو پورا کرتا ہے۔اس لیے قدرت کچھ شخصیتوں کے ذریعہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کرتی ہے۔ اس غرض کے لیے ان شخصیتوں میں اعلیٰ صفات پیدا کر دی جاتی ہیں اور یہ اس سرزمین پر خدا کے نمائندے بن کر جاہل اور ناسمجھ انسانوں کی راہ نمائی کرتی ہیں۔ان میں پیغمبر، حکم ران، سیاست دان، فوجی جنرل، مفکر اور دانش ور آ جاتے ہیں۔" (۲۰)

اس نظریے کو اپنے تئیں "جارج ولہیلم فریڈرش ہیگل" (Geeorg Wilhelm Friedrich Hegel) نے بھی پیش یا اور اسی کے تحت وہ بالا اقتباس میں پیش کی گئی شخصیات کے متعلق کہتا ہے کہ یہ شخصیات دیکھنے میں تو بہ ظاہر اپنے ذاتی مقاصد اور ان کی تکمیل کے لیے جدوجہد کر رہی ہوتی ہیں، مگر اصلاً حقیقت میں وہ خدا کے منصوبے پورا کرتی ہیں، جس کا انہیں علم تک بھی نہیں ہوتا۔ اور یہ ہی خدا کے منصوبے اور قدرت کا کمال ہے کہ وہ انہیں ایسا کرنے پر اکساتی ہے۔ لہٰذا انہیں مقاصد کی تکمیل سے تاریخ میں بڑے بڑے کارنامے سرزد ہوتے ہیں اور تاریخ اہم موڑ لے کر آگے بڑھتی ہے۔ تاریخ کے اس **مذہبی یا عظیم خدائی نظریے** کے تحت تاریخ میں مادی فوائد اور اس کے حصول کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ پس اس کے تحت یہ درس دیا جاتا ہے کہ دنیا عارضی ہے اور اس میں انسانوں کا قیام بھی بے حد مختصر ہے۔ لہٰذا انسان کو اس دنیا میں بھیجنے کا اساسی مقصد اور تاریخ کی تکمیل کا مقصد بس اگلی دنیا کی تیاری ہے۔ انسان اسے عارضی ٹھکانہ سمجھتے ہوئے اس دنیا میں اپنے آنے کا مقصد صرف انسانی فلاح و بہبود سمجھیں۔ اور تاریخ کی تکمیل اس بہترین انتہا پر کریں کہ اگلی دنیا اس کے توسط سے انہیں بے حد اعلا نصیب ہو۔ اسی حوالے سے چوتھی صدی عیسوی کے ایک اور عیسائی مبلغ، مذہبی رہنما اور فلاسفر: "آگسٹائن آف ہپپو، المعروف بہ؛ سینٹ آگسٹائن" (Augustine of Hippo Known as Saint Augustine)

نے "تاریخ کے گردشی نظریے" کی مدد سے "تاریخ کے مذہبی یا عظیم خدائی نظریے" کو ایک نئی جہت دی۔ اس نے اپنی کتاب: **"خدا کا شہر"(The City of God: De civitate Dei contra paganos)** میں یہ مؤقف پیش کیا کہ خدا نے اس نسقِ جہاں میں دو شہر بنائے ہیں۔ ایک شہر "بدی" کا تو دوسرا شہر "نیکی" کا ہے۔ اگرچہ ان دونوں شہروں میں ایک سی زندگی پائی جاتی ہے، مگر ان میں روحانی(Spiritual) فرق ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی پوری زیست اسی بدی اور نیکی کی کش مکش کے دوران بسر ہو جاتی ہے۔ اس کے انجام پر اگر نیکی کام یاب ہو گئی تو انسان گُلو خلاصی پائے گا اور اگر بدی کا پلڑا بھاری رہا تو انسان دوامی عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔ پس "سینٹ آگسٹائن" بدی اور نیکی کے درمیان اسی تجاذُب کی حالت کو پوری انسانی تاریخ قرار دیتا ہے۔

تاریخ کے مذہبی یا عظیم خدائی نظریے، کی ذیل میں تاریخ کسی دائرے(Circle) میں گردش نہیں کرتی، بل کہ تاریخ **ایک سیدھی لکیر(A Straight Line)** کی طرح آگے کی جانب جاتی ہے اور تین پڑاؤ طے کرتی ہے۔ یوں تاریخ **ابتداء یعنی آغاز، درمیان اور انتہاء** جیسے مراحل سے ہو کر اپنے انجام تک پہنچے گی اور اسی سے ہی خدا کا منصوبہ پورا ہو گا، جب تاریخ کا آخری انجام(Final End) ہو گا اور یہ مرحلہ تاریخ کی تنہا ہو گی۔ تاریخ کے اس آخری منصوبہ کی تکمیل کا نظریہ "جارج ولہیلم فریڈرش ہیگل" کے ہاں بھی ایسے ہی ملتا ہے۔ یعنی اس کے مطابق بھی تاریخ ان تین مراحل سے گزر کر اپنی انتہا کو پہنچے گی۔ تاریخ کا مذہبی یا عظیم خدائی نظریہ ایک لحاظ سے انسان کو مجبور اور لاچار کرتا ہے اور یہ معذوری و جمود کی طرف لے جاتا ہے۔ کیوں کہ اس نظریے کے تحت انسان کو اپنے تئیں تو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ ہے۔ اگر وہ اپنے طور پر کچھ کرتا ہے کہ جس سے انسانوں کی ترقی کی منازل طے کی جا سکیں یا انسانیت کو مزید بہتری کی طرف لے جایا جا سکے، تو اس نظریے کے تحت وہ الٹا خدا کے منصوبے میں خلل ڈالنے کے مترادف ہے۔

تاریخ کا ترقی کا نظریہ (The Development Theory of History)، تاریخ کا تیسرا اہم اساسی نظریہ ہے۔ جو کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے یورپ بل کہ بالخصوص انگلستانی مفکرین کے توسط سے ارتقا

پایا جو انتہائی خاص حالات کی پیداوار ہے۔ یہ ایسے حالات تھے کہ جب یورپ میں سائنسی، فنی، اقتصادی اور معاشی ترقی ہو رہی اور یورپ نہ صرف ترقی پر گام زن تھا، بل کہ وہ استعماری ہتھ کنڈوں کے ذریعے آسٹریلیا، امریکہ اور ایشیاء کے ممالک میں نو آبادکاریاں (Colonizations) بھی کر رہا تھا۔ تو نو آبادکار مفکرین اور دانش وروں نے ان ممالک کا مطالعہ بھی کیا، جس میں انہوں نے یورپی تاریخ کی مدد سے یورپی معاشرے کے ابتدائی ادوار اور استعمار زدہ ممالک کے ابتدائی ادوار کا تقابل کیا اور بہت سی مماثلتیں ڈھونڈیں۔ جیسا کہ امریکہ کے ریڈ انڈین قبائل اس وقت اس مرحلہ پر تھے، جہاں ابتداء میں رومی اور یونانی تھے، نہ صرف وہ ظاہری طور پر ایک جیسے تھے، بل کہ ان کے عقائد، روایات اور اقتدار بھی ایک جیسی تھیں۔ اس مطالعہ اور ان مماثلتوں نے تاریخ کے ترقی کے نظریہ کو پروان چڑھنے میں مدد دی۔ جس سے یہ اخذ کیا گیا کہ تمام اقوام بتدریج ارتقا سے آہستہ آہستہ ترقی کا سفر طے کرتی ہیں اور یہ سفر قریباً ایک جیسا ہوتا ہے۔ یہ اساسی ڈھانچہ ایک جیسا ہی استوار ہوتا ہے اور اس نظریے کے مطابق ہر دور، خطے اور قوم کی تاریخ میں یہ پہلو آفاقی ہے۔ یعنی انسانی تہذیب ایک جگہ ٹھہری نہیں ہوئی ہے، بل کہ وہ مسلسل آگے بڑھ رہی ہے اور مسلسل ترقی ہو رہی ہے۔ معاشرے پیدا اور فنا ہوتے رہتے ہیں، ثقافتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں، تہذیبیں عروج و زوال کا شکار ہوتی رہتی ہیں، مگر اس سب کے باوجود تاریخ کی تشکیل آگے کی جانب مسلسل ہو رہی ہے اور تاریخی عمل میں واقعات ایک دوسرے سے مل کر مسلسل پھیلتے جا رہے ہیں۔ اس سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تاریخی عمل ایک تسلسل کے ساتھ بالیدگی کی راہ پر گام زن ہے۔

تاریخ کے ترقی کے نظریے، کی بنیاد جن نکات پر رکھی گئی، وہ کچھ اس طرح ہیں: **پہلا نکتہ یہ ہے کہ؛** تبدیلی اور تغیر سماج و معاشرے کا فطری عمل ہے۔ اگر کسی سماج و معاشرے میں انجماد کی صورت طاری ہو جائے تو اس کی وجہ حوادث، آفات اور بے دستور حالات ہوتے ہیں۔ جو کہ معاشرتی اور تاریخی ترقی کا ڈھانچہ استوار کرنے میں رُکاوٹ کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے صرف مثبت تبدیلی ہی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اور تبدیلی اور تغیر کے رک جانے کا عمل نقصان دہ۔۔۔ **دوسرا یہ کہ؛** معاشرے کی اساسی خصوصیت تغیر کا عنصر ہے، جب ہم اپنے حال کا

مطالعہ کرتے ہیں، تو اس میں اور ماضی میں، کافی فرق دیکھتے ہیں اور ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حال کا یا موجودہ زمانہ کا یہ فرق ماضی کے بدلنے یعنی ماضی کی تبدیلی کی وجہ سے آیا ہے۔ اس سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ تاریخی عمل کا ایک اہم قانون: **"تبدیلی کا قانون"** ہے۔۔۔۔ **تیسرا یہ کہ؛** وہ تبدیلی اور تغیر جو سماج کی ہیئت، ساخت اور شکل کو بدل دے وہ تدریجی اور دھیرج کے ساتھ آتی ہے۔۔۔۔ **چوتھا یہ کہ؛** تبدیلی کے عمل میں بیرونی عناصر بھی اس عمل کے لیے وجہ تو بن سکتے ہیں، مگر وہ اس کا راستہ اور رفتار متعین نہیں کر سکتے۔ نہ ہی بیرونی عناصر اس عمل پر قابو پا سکتے ہیں۔۔۔۔ **پانچواں یہ کہ؛** انسانی سماج اور اس کے تاریخی عمل میں تبدیلی کسی نا کسی مقصد کے تحت ہوتی ہے اور وہ مقصد تقرر کرنے کا عنصر انسانی سرشت میں نہاں ہوتا ہے۔۔۔۔ **چھٹا یہ کہ؛** سماج کو یہ تبدیلی یا تبدیلی کا عمل، ہمیشہ عدم تصنع سے تصنع کی جانب لے جاتا ہے اور یہ عمل فراخی کا باعث بنتا ہے۔۔۔۔ **ساتواں اور آخری نکتہ یہ ہے کہ؛** تبدیلی کے قوانین آفاقی نوعیت کے ہیں اور یہ قوانین خود تبدیل نہیں ہوتے بل کہ یہ ہر دور اور ہر صورت میں ایک ہی طرح سے عمل کرتے ہیں اور ایک جیسے رہتے ہیں۔ پس اس لیے ان کی مدد سے کسی بھی سماج کے تبدیلی اور تغیر کے عمل کو تاریخی تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے اور ان کی مدد سے تاریخ میں کسی ایک مقصد و منصوبہ کو بھی دریافت کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے مؤرخین اور فلسفیوں نے تاریخ کو اِن نکات کی صورت میں دیکھنا شروع کیا اور اسی کی ذیل میں اُنہیں معاشروں و مختلف سماجوں میں متعدد مطابقتیں نظر آئیں اور اس نقطہ نظر سے سے جو تواریخ رقم کی گئیں۔ ان میں عصرِ تفرید سے عصرِ تہذیب تک کو، تاریخ میں تسلسل سے بیان کر کے، نسلِ انسانی کے ارتقاء، تبدیلی اور ترقی کو ثابت کیا گیا ہے۔ تاریخ میں ترقی کا نظریہ، ایک حد تک اہم ثابت ہوا، جس سے یہ پہلو ہمارے سامنے آیا کہ انسان فطرت کو ٹکر دیتے ہوئے ایک تسلسل کے ساتھ ارتقائی صورت میں ترقی کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ اور خوش آیند پہلو یہ ہے کہ اس سلسلے کو مزید تقویت و استحکام مل رہا ہے۔ تاریخ میں ترقی کے نظریے کی پیش کش کے ساتھ اٹھارہویں صدی کے ان مؤرخین اور تاریخ کو ایک اور نقطۂ نظر بھی میسر ہوا، جس سے تاریخ میں مزید بہتری آئی۔ **اور وہ یہ کہ اٹھارہویں صدی کے ان مفکرین نے ترقیم تاریخ کے**

حوالے سے یہ نقطہ ہائے نظر پیش کیا کہ تاریخ کو سنہ وار ترتیب سے پیش کرنا یا لکھنا کوئی بہتر عمل نہ ہے۔ بل کہ تاریخ میں وقت اور مدت کے تعین اور توضیح کے لیے سنہ وار ترتیب کی بجائے اسے علم الاقوام کے ذریعے مختلف درجہ بندیوں میں منقسم کر کے مختلف نام دیے۔ جیسے: "دورِ جہالت"، پتھر کا دور، کاشت کاری کا دور، تجارتی اور یورپی ثقافت تک یا آزاد جنسی تعلقات سے بیوی تک اور سادگی سے خمیدگی تک"، وغیرہ وغیرہ ایسے ناموں سے درجوں میں تقسیم کیا گیا اور بعد زاں ان مؤرخین نے تاریخ کو سنہ وار پیش کرنے کی بجائے انہیں کے ذریعے پیش کیا۔

تاریخ کا چوتھا اساسی نوعیت کا نظریہ: **"تاریخ کا مادی نظریہ" (Material Theory of History)** ہے جسے "تاریخی مادیت(Historical Materialism)اور"تاریخ کا معاشی نظریہ"(Economical Theory of History) کے نام سے بھی جاناجاتاہے۔ اس نظریے کو "کارل ہیزش مارکس"(Karl Henrich Marx) نے پہلے پہل پیش کیا۔ کارل ہیزش مارکس کہتے ہیں کہ اس نسقِ زیست میں بسنے والے انسانوں کے معاشرتی وسماجی تعلقات اور واسطے ومراسم کی اساس مادی وسائط ہوتے ہیں اور وہ انہیں کے مطابق اپنی اقدار و اپنے نظریات کو تشکیل دیتا ہے۔**یعنی یوں کہا جاسکتا ہے کہ زیستِ انسانی شعور(Consciousness) کی وساطت سے متعین نہیں ہوتی،بل کہ شعور سلسلۂ زیست سے متعین ہوتاہے۔** نیز سماج کے اداروں اور اقدار وروایات کے آغاز کو کسی خیال، تصور یا نظریہ میں نہیں ڈھونڈنا چاہیئے، کیوں کہ یہ سماج تغیرات مادی حالاتِ پیداوار کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ یہاں کارل ہیزش مارکس یہ کہنا چاہتاہے کہ کوئی بھی نظریہ یا تصور پہلے پیدا نہیں ہوتا بلکہ مادی حالات اور پیداواری ذرائع ایسی صورت حال پیدا کرتے ہیں کہ جس سے اُن کا جنم ہوتاہے۔ چناں چہ کسی عہد کی تاریخ کو اس وقت تک نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ اس کے عصر کے پیداواری ذرائع آلات اور ان کے تعلقات کو نہ سمجھا جائے۔ اور انہیں پیداواری ذرائعوں کے بدلنے سے انسان اپنے ہی سماجی رشتوں کے بدل لیتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ کہتاہے کہ تمام تصورات اور نظریات بھی بے ثبات

وو قتی ہوتے ہیں۔ کارل ہینز ش مارکس کے علاوہ "فریڈرش اینگلز "(Friedrich Engels) نے اس حوالے سے اپنے نظریات پیش کیے۔ ان دونوں کے نظریات کو دیکھا جائے تو یہ جہاں تاریخی عمل میں تبدیلی کی بنیادی وجہ **معاشی مفادات** قرار دیتے ہیں، وہیں یہ اس تناظر میں بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں کہ؛ معاشی مفادات اس عمل کو تیز تو کرتے ہیں لیکن صرف یہ ہی نہیں کہ اِنہیں پر تمام سلسلے کا دارومدار رہے، بل کہ دیگر عوامل بھی تاریخ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ البتہ کارل ہینز ش مارکس اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ **پرول تاری طبقہ** کو باشعور بنا کر انہیں طاقت ور کر کے سیاسی اقتدار میں لایا جائے، جس سے معاشرے میں غیر منصفانہ تقسیم اور طبقاتی جدوجہد ختم ہو گی اور نجی ملکیت کا تصور بھی اپنے انجام کو پہنچے گا، جس سے انسانیت اور اقوامِ عالم، معاشی و سماجی طور پر آزاد ہوں گی تو جنگ و جدل، غارت گری اور لوٹ مار کا تصور نہ بچے گا اور تاریخ مزید بہتری سے اپنا سفر طے کر سکے گی۔ اس ضمن میں کارل ہینز ش مارکس نے قریباً ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۰ء کے درمیان "یورپی سرمایہ داروں "(European Capitalists) کا مطالعہ کیا اور یہ ثابت کیا کہ کس طرح یہ سلسلہ بالترتیب تاریخی عمل سے پیدا ہوتا ہے اور کس طرح اس کے خاتمے سے سماج اور تاریخ کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کا مادی نظریہ، اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اگر سماج میں معاشی حقوق مساوی ہوں گے، ہر انسان کو ترقی کے مواقع میسر آئیں گے تو اس کے نتیجے میں اخلاقیات اور اقدار پروان چڑھیں گی اور ہٹ دھرمی، دھوکہ دہی، انتقام، کینہ، حسد اور لالچ جیسی عادات سے چھٹکارا ملے گا، جس کے نتیجے میں تاریخ نکھر کر بلند اخلاقی اصولوں پر تشکیل پائے گی۔ لہٰذا تاریخ کے مادی نظریے کی مدد سے تاریخ کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا اور مستقبل میں اس کے ذریعے سے تاریخی عمل میں مزید بہتری لائی جا سکتی ہے۔ جب ہم تاریخ کا، فلسفہ کی روشنی میں مزید گہرائی سے مطالعہ کرنے کی سعی کرتے ہیں تو ہمارا واسطہ افزوں اَنیک مَباحث سے پڑتا ہے۔ جو بنیادی طور پر تاریخ کی اساس، تاریخ کے ارکان، تاریخ کی بنت و تشکیل، تاریخی عمل میں حائل عوامل اور تاریخ کے اغراض وغیرہ سے رجوع کرتے ہیں۔ (اور یہی دراصل فلسفۂ تاریخ کا وصفی دائرہ عمل بھی ہے۔) اس ضمن میں ایک سوال

یہ بھی ہے کہ: تاریخی عمل میں فرد انفرادی طور پر اہمیت کا حامل ہے یا مجموعی طور پر معاشرہ اہم ؟یعنی کیا تاریخ میں فرد کا کردار اہم ہے اور اسے اولین حیثیت حاصل ہے۔ یا معاشرہ اس عمل کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے اور اس میں سے سبقت کسے حاصل ہے! تو اس کا جواب ہم یوں دے سکتے ہیں کہ تاریخ میں فرد اور معاشرے دونوں کا کردار بے حد اہمیت اور مساوی حیثیت کا حامل ہے۔ نہ ہی معاشرے کا وجود فرد کے بغیر ہے اور نہ ہی فرد معاشرے کے بغیر اپنی بقا کو یقینی بنا سکتا ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے جز لاینفک ہیں۔ معلوم تاریخ یا قبل از تاریخ میں بھی، ہر بنی نوع انسان اسی معاشرے میں جنم لیتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں سے ہی اپنے آپ کو معاشرتی اصولوں کے مطابق بسر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یعنی معاشرہ اس فرد کو ابتداء سے ہی اپنے مطابق ڈھالنا شروع کر دیتا ہے۔ نہ صرف یہ بل کہ اس کے ابتدائی فکر کی بنیادیں بھی دوسروں سے ہی اثر قبول کر کے استوار ہوتی ہیں۔ " ماہرینِ بشریات"(Anthropologists) کا عمومی خیال ہے کہ، ما قبل تاریخ و تہذیب کا قدیمی انسان، تہذیبی انسان کی نسبت اپنے سماج و معاشرے سے اثر زیادہ قبول کرتا تھا اور تہذیب یافتہ انسان کی نسبت سماج اسے اور بہتر ڈھنگ سے اپنے رنگ میں ڈھالتا تھا۔ فرد اور سماج کی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے معتمد برطانوی مورخ "ایڈورڈ ہیلیٹ کار"(Edward Hallet Carr) اپنی معروف تصنیف "What is History?" میں لکھتے ہیں:

> "The question which come first society or the individual is like the question about the hen and the egg. Whatever you treat as a logical or as an historical question, you can make no statement about it, one way or the other, which does not have to be corrected by an opposite. Society and individual are inseparable; they are necessary and complementary to each other, not opposites. No man is an island, entire of itself." (21)

ایڈورڈ ہیلیٹ کار، اس متعلق یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ ،فرد اور سماج کا سوال اسی طرح ہے کہ جیسے مرغی اور انڈے کا، کہ مرغی اور انڈے میں کون سی چیز زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور کسی کا ظہور پہلے ہوا۔ پس جیسے ان دونوں کو الگ تھلگ نہیں کیا جاسکتا اسی طرح فرد اور سماج بھی ناقابل تقسیم ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے لیے بے حد ضروری اور تکمیلی ہیں۔ کوئی بھی انسان ایسا نہیں کہ وہ اپنے اندر ایک معاشرے کی خصوصیات رکھتا ہو۔ اور کوئی بھی معاشرہ وسماج ایسا نہیں کہ جو انسانوں کے بغیر اپنی شکل ووجود برقرار رکھ سکے۔ پس یہ دونوں مل کر تاریخی تشکیل عمل میں اپنا مساوی کردار ادا کرتے ہیں۔ تاریخی عمل میں ایک اور اہم عنصر "سبب"(Causation) ہے۔ سبب ،جس کے معنی **"وجہ،علت،موجب اور کارن"** کے ہیں۔[۲۲] تاریخ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تاریخ کی تشکیل بے شمار اسباب کی وجہ سے ہوتی ہے یا دلیل کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سبب وہ عنصر ہے جو تاریخ میں تاریخی بیانیہ کو باہم مربوط رکھتا ہے۔ کیا سبب اس دنیا میں معروضی طور پر اپنا وجود رکھتے ہیں یا یہ صرف ایک زمرہ ہے کہ جسے ہمارا ذہن حسی داخلی معلومات کے لیے استعمال کرتا ہے، جس میں سبب کی صورت موضوعی ہوتی ہے۔ اس متعلق ماہرین علمیات(Epistemologists) نے جاننے کی کوشش کی کہ کس طرح سبب کے حوالے سے عمومی اور تاریخ کے تناظر میں ہم اپنے نظریات اور تصورات کا دفاع کرسکتے اور ان سے فائدہ کس طرح لیا جاسکتاہے ۔سائنس کے چند خاص شعبہ جات کے فلسفیوں جیسا کہ : "طبعیات(physics)، حیاتیات(Biology) اور تاریخ نگاری(Historiography)" کے ماہرین و فلسفیوں نے مابعد الطبعیاتی(Metaphysical) اور علمیاتی (Epistemic) نوعیت کے سوالات کا ان چند سائنس کے خاص شعبہ جات کے دائرہ اقتدار اور سیاق وسباق کے تحت، **سبب** کے عمومی فلسفیانہ مباحث کے تناظر میں جائزہ لیا۔ اس ذیل میں سبب سے متعلق دو اساسی نقطہ ہائے نظر سے سامنا ہوتا ہے۔ پہلا نقطہ نظر "ہم خیالی یا اتحادیوں"(Unificationist) کا ہے، جب کہ دوسرا "استثنائیوں"(Exceptionalists) کا ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں فلسفی اور مؤرخ "ڈیوڈ ہیوم"(David Hume) نے ہم خیالی یا اتحادی

فلسفہ(Unificationism Philosophy) کے تحت یہ دعویٰ کیا کہ **سبب اور اثر** کا تعلق مسلسل تواماں ہے۔اسباب ہمیشہ اثرات سے پہلے ہوتے ہیں،وہ ان کے ساتھ ملتے ہیں اور ایک ہی جیسا اثر ہمیشہ ایک ہی طرح کے سبب کی پیروی کرتا ہے۔مزید براں اتحادی یہ مؤقف پیش کرتے ہیں کہ سبب ایک سبب ہی ہے چاہے وہ تاریخ میں ہو،فطرت میں ہو،سائنس میں ہو یا تاریخ نگاری میں ہو۔سببی دعوے، تاریخ نگاری ہو، طبعیات ہو یا روزمرہ زندگی، تمام میں ایک جیسے منطقی اور معنوی اصولوں کی پابندی کرتے ہیں۔جیسے تاریخ دان انقلاب اور تصادم کو سبب مانتے ہیں تو وہیں ماہرین طبعیات ان کا استعمال کرتے ہیں مگر تجریدی سطح پر ان کا فلسفیانہ تجزیہ بے حد مماثلت رکھتا ہے۔اس متعلق "ایویزر ٹکر"(Aviezer Tucker)رقم طراز ہیں:

> "It is possible to distinguish two basic approches to causation in the philosophy of Historiography: Unifictionist approaches advocate a universal philosphical analysis of causation; a cause is a cause whether in history or in nature, historiography, or science. Causal assertions follow the same logical an dsemantic rules in historigraphy, physics or everday life. Historians bring revolutions and collusions as causes, while physicists use revulsions and collisions, but on a bastract level, their philosophical analysis may be quite similar." (23)

اس تصور کے تحت ہم کہہ سکتے ہیں کہ سبب واقعی اپنا وجود رکھتا ہے اور باطنی اصولوں کی پابندی تواتر سے کرتا ہے۔سبب کے حوالے سے دوسرا نقطہ نظر "استثنیٰ پسندوں"(Exceptionalists) کا ہے۔استثنائی مفکرین تاریخ نگاری کے حوالے سے سبب کی غیر معمولی نوعیت پر بحث کرتے ہیں، دوسرے سائنسی علوم کے تناظر میں۔فلسفۂ تاریخ میں قدیم استثنائی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے مفکرین اور فلسفیوں کا یہ ماننا تھا کہ تاریخ پس ماندہ اسباب کا ایک دائرہ ہے۔تاریخ واقعات ایک تو ان پس ماندہ اسباب کی وجہ سے ہوتے ہیں۔دوسرا تاریخ واقعات

اپنے انجام، مقاصد اور مصمم اغراض کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ اکثر کوئی بھی تاریخی واقعہ اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ وہ کسی پہلے کے واقعہ کی وجہ سے ہو یا بعد میں ہونے والے واقعات اس کی وجہ سے ہوں یا کوئی واقعہ ہو رہا ہو تو اس کی وجہ سے دوسرا واقعہ ہو جائے۔ **بل کہ تاریخی واقعات اُن واقعات کی وجہ سے ہوتے ہیں، جو واقعات تاریخ میں کام یاب ہوتے ہیں۔** یعنی وہ کام یابی وجہ بنتی ہے اور کام یابی ہی اس تسلسل کو جاری رکھنے کا سبب ٹھہرتی ہے۔ اسی طرح پس ماندہ اسباب کی توضیح یہ مکتبہ فکر کچھ ایسے کرتا ہے کہ یہ پس ماندہ اسباب کسی خاص نوعیت کے اسباب نہیں ہوتے، بل کہ یہ عمومی اسباب سے ملتے جلتے ہیں۔ لہٰذا ان کو کسی خاص زمرے میں متعین کرتے ہوئے ان کے بارے میں متعصب ہونے کی ضرورت نہیں۔ بل کہ ہم ان سے متعلق آزاد قوتِ ارادی کا خیال رکھ سکتے ہیں۔ اسباب کے حوالے سے اس نوعیت کے خیالات ایک وقیع فلسفی: "جارج ولہیلم فریڈرش ہیگل" (Georg Wihelm Friedrich Hegel) اور "تاریخ کے ایک دبستانِ خیال" "وگ تاریخ نگاری" (Whig Historiography) کے مؤرخین کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ دونوں آزادی یا آزاد قوتِ ارادی کو تاریخ کا آخری سبب (مختلف معنوں میں) سمجھتے ہیں۔ تاہم پس ماندہ اسباب کو سمجھنے میں قبول کرنے میں مابعد الطبیعیاتی رکاوٹیں (Metaphysical Barriers) ناقابلِ تسخیر معلوم ہوتی ہیں۔ اسباب کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے "ایویئزر ٹکر"(Aviezer Tucker) کچھ یوں لکھتے ہیں:

> “Some Philosophers of historiography, at least since the Neo-Kantians, have argued that one of the distinctive features of historiography as a human rather than natural science is the type of cause it uses. Since historiography describes largely, or some would even claim, exclusively, human actions, historians are interested in motives, reasons, interests, passions, beliefs, and so on. Since Historians and their readers, just like the agents of historical action, are human

> moved by the same types of causes, this allows on understanding historical causes in a way that natural causes can never be understood, From within or emphatically.... therefore causes in historiography are only in the sense of reasons, never deterministic or parts of law-like cause-effect regularities, never sufficient or even necessary”. (24)

ایویئزر ٹکر، یہاں یہ مؤقف پیش کرتے ہیں کہ تاریخ نگاری یا تاریخی عمل میں اسباب صرف اسباب یا وجوہات کے طور پر ہوتے ہیں، نہ کہ سبب اور اثر کے قانون (Cause Effect Law) کے تحت اس قانون کا حصہ ہوتے ہیں۔ بل کہ یہ صرف تاریخی عمل میں سبب ہوتے ہیں، ہاں تاریخی تشکیل میں ان کی وقعت ضرور ہے۔ تاریخی عمل میں اور تاریخ نگاری میں سبب کی وقعت آج سے نہیں بل کہ اس عمل کے آغاز سے ہے۔ تاریخ کا باوا آدم "ہیروڈوٹس" (Herodotus) اپنی تواریخ میں تاریخی اسباب کو بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہیروڈوٹس کی تواریخ میں تاریخی اسباب کے بیان سے متعلق "ایڈورڈ ہیلیٹ کار"(Edward Hallet Carr) اپنی رائے یوں دیتے ہیں:

> “Herodotus, the father of history, defined his purpose in the opening of his work: to preserve a memory of the deeds of the Greeks and the Barbarians, and in particular, beyond everything else, to give the cause of their fighting one another. He found few disciples in the ancient world”. (25)

ایڈورڈ ہیلیٹ کار، کی "ہیروڈوٹس" سے متعلق رائے سے ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ اولین معلوم مؤرخ کو بھی تاریخ میں اسباب کی پیش کش سے متعلق اتنی آگاہی تھی اور اس کی رائے میں اس قدر اہمیت تھی کہ اس نے بھی اپنی تواریخ میں اسباب بیان کرنے کو ترجیح دی۔ لیکن تاریخ کے ساتھ بدطالعی یہ ہوئی کہ تاریخ کے طویل وسطی

ادوار میں مؤرخین کا تاریخی بیانیہ میں اس کی طرف میلان کم ہو گیا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ تاریخ میں اسباب کا بیان بالکل کم ہو گیا، تاریخی عمل گراوٹ کا شکار ہو گیا اور تاریخ کی جزالت آہستہ آہستہ دُربل ہوتی گئی۔ اسباب سے متعلق اُوپری ردوقدح سے یہ مافی ضمیر تو منکشف ہوتا ہے کہ تاریخ میں اس کی وقعت لازم ہے۔ بل کہ مؤرخین اور فلسفیوں کی آراء میں غیر فصیح سبب بیان کرنا بھی کافی نہیں ہے، بل کہ سبب بالتفصیل اور اُنسب بیان کرنا بہتر اور موزوں عمل ہے۔ مثال کے طور پر ہم کہیں کہ "دوسری جنگ عظیم"(Second World War) اس لیے برپا ہوئی کہ "ایڈولف ہٹلر" (Adolf Hitler) اُسے برپا کرنے کا خواہاں تھا، تو یہ حقیقت تو ہے، مگر اس سے سبب کچھ واضح نہیں ہوتا۔

فلسفۂ تاریخ میں، تاریخ کا ایک اہم مسئلہ یا تاریخ کا تکنیکی تشکیلی عنصر؛ "ادغام"(Colligation) ہے، جسے "تاریخ میں ربط یا تاریخ میں ممزوج" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ مؤرخین اکثر و بیش تر تاریخ کو سوالیہ انداز میں رقم کرتے ہیں۔ جیسا کہ؛ کسی انسان نے تاریخ میں اور تاریخ سے (بعد میں لکھی گئی تواریخ سے) کیا حاصل کیا؟ کوئی بھی واقعہ کیسے رُونما ہوا؟ اس واقعے کے بعد ازاں اثرات کیا مرتب ہوئے؟ لوگوں نے یا کسی جتھے نے یا کسی قوم نے، تاریخ میں خاص رویے سے یا عمومی رویے سے برتاؤ کیسے کیا؟ لیکن بعض مؤرخین سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لیے سوالیہ انداز میں تاریخ نہیں لکھتے، بل کہ وہ ماضی میں ہونے والے واقعات کے اکتشاف کے لیے ایک خاص نمونے یا ڈھنگ (Pattern) کا سہارا لیتے ہوئے اور اُنہیں اس ڈھنگ میں ظاہر کرنے کے لیے لکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ڈھنگ یا نمونہ ہوتا ہے، جو اُن واقعات میں ہر ایک کو معنی اور اہمیت دیتا ہے، جو اس توضیح میں مددگار ٹھہرے ہیں۔ "کولی گیشن" (Colligation)، لفظ کا لفظی سطح پر جائزہ لیں، تو کسی حد تک یہ لفظ معنوی لحاظ سے مبہم نوعیت کا ہے، جس کے معنی آسان ہونے کے باوجود، آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔ یہ لفظ انگریزی میں "لاطینی زبان" (Latin Language) کے لفظ "کولی جے رے" (Colligere) سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب: "چیزوں کا اکٹھا کرنا" ہے۔ انگریزی لفظ "کولی گیشن" (Colligation) کے معنی لغت میں؛ "The State of

being Joined together, or; The connection of isolated facts by a general Hypothesis" [26] کے ملتے ہیں۔ یعنی جس سے مراد "ایک ساتھ جڑنا یا جڑنے کی حالت اور کسی مفروضے کے ذریعے الگ تھلگ حقائق کا آپس میں تعلق کے ہیں۔ کولی گیشن، جس کا متبادل اُردو میں لفظ؛ "ادغام" استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے معنی لغت میں "مل جانا، جذب ہو جانا، شامل ہو جانا" کے ملتے ہیں۔ [۲۷] چند دیگر لغات میں اس کی معنوی وضاحت یوں ہے؛ "ایک ہی جنس یا قبیل کی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کو باہم ملا دینا"۔ ادغام کے طریقہ کار کو تاریخ میں سب سے پہلے، انیسویں صدی کے تیسرے، چوتھے عشرے میں انگریز سائنس کے مؤرخ اور ہمہ دان (Polymath)؛ "ولیم ہیول" (William Whewell) (پیدائش: ۱۷۹۴ء، وفات: ۱۸۶۶ء) نے برتا۔ اُس نے اس طریق کار کے استعمال سے اس طرف توجہ دلائی کہ کس طرح سائنس دان تصورات کے ذریعے بہ ظاہر آزاد حقائق کو جوڑتے اور تقابل کرتے ہیں۔ ادغام کا سب سے بہترین استعمال اور اس کی موزوں مثال ہمیں؛ "ڈیوڈ ہیکیٹ فشر" (David Hackett Fischer) کی ۲۰۰۵ء میں پہلی بار شائع شدہ کتاب "Liberty and Freedom: A Visual History of America's Founding Ideas". میں ملتا ہے۔

یہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تاریخ میں رہائی اور آزادی سے متعلق علامات، تحاریر اور واقعات کی ایک یادگار دستاویز ہے۔ جس میں وہ ان تمام کو امریکہ کی تاریخ میں تبدیلی کے خیالیہ ڈھنگ (Theme) یا نمونے (Pattern) کے طور پر دکھاتا ہے۔ وہ اپنی منتخب علامات، تصورات اور نظریات کے مجموعے کو ترقی پذیر آزادی کے موضوع سے جوڑ کر ان میں سے ہر ایک کو اہمیت دیتا ہے، جو اس تبدیلی میں معاون ہیں۔ اور یوں ادغام کا استعمال کرتے ہوئے ایک نمونہ تخلیق کرتا ہے۔

اِدغام (Colligation) کے متعلق "ہیری رٹر" (Herry Ritter) اپنی تصنیف "Dictionary of Concepts in History" میں یوں ارقام ہیں:

> "COLLIGATION. A method of historical intepretation in which a past event is concidered to have been

understood when it has been related to the particular context of events and circumstances in which it occured. The word colligation was introduced to vocabulary of critical PHILOSOPHY OF HISTORY in 1942 by the British Philosopher W. H. Walsh (1942: 133-34) and later popularized in Walsh's widely read Philosophy of History: An introduction (1960: 23, 57-64) as part of the author's effort to augment the COVERING LAW theory of historical EXPLANATION...... Walsh borrowed the word from the nineteenth-century philosopher William Whewell...... Who first introduced colligatin as a technical philosphical term". (28)

ہیری رٹر، کے مطابق کولی گیشن، تاریخی تفہیم و تشریح کا ایک عمل ہے، جس میں ماضی کے واقعات کو ایک خاص ڈھنگ سے بیان کر کے سمجھا جاتا ہے اور اس کا تعلق واقعات اور حالات کے مخصوص تناظر سے ہوتا ہے، جس میں وہ وقوع پذیر ہوئے ہوں۔ اِدغام(Colligation) کی تکنیک ایک طور سے اہم ہے اور یہ نسبتاً جدید طرز ہے، مگر اس کے ذریعے تاریخ نگار تاریخ کو ملاتے ہوئے چند عمومی غلطیاں بھی کرتے ہیں۔ یہ غلطیاں عام طور پر "تین"(۳) طرح کی ہوتی ہیں۔ **پہلی**؛ عموماً تاریخی عمل میں ادغام کے ذریعے مؤرخین کسی خاص موضوع کے تحت لکھتے ہیں تو اس کو عمومی مفاہیم میں استعمال کرتے ہوئے کسی حد تک محدود کر دیتے ہیں۔ یعنی جب کوئی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس کو مخصوص معنوں میں لیتے ہیں، جب کہ انہیں اس اصطلاح کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا چاہیے۔ **دوسری**؛ مؤرخین واقعات کا ایک خاص نمونہ ہونے کا فرض کریں گے، کہ واقعات میں یہ یہ خاص نمونہ تھا۔ اور اپنے اس مفروضے کی تائید کے لیے کچھ ثبوت تلاش کریں گے، لیکن یہ جانچنے اور بیان کرنے میں ناکام ہوتے ہیں کہ اسے کس حد تک برقرار رکھا گیا تھا۔ اس پالغز واتیج کو "نُزولی تاریخ نویسی" (Top-

(Down Historiography بھی کہا جا سکتا ہے۔ جو ایک عام تفہیم سے شروع ہوتی ہے اور پھر واقعات کے ایک خاص گروہ کو عظیم نمونے میں پیوست کرتی جاتی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ بہتر "صُعودی تاریخ نویسی" (Bottom-Up Historiography) ہے، جو واقعات کے ایک نچلے گروہ کے اراکین کا تفصیلی جائزہ لیتی ہے اور پھر ان پر غور و خوض کے بعد فیصلہ کرتی ہے کہ آیا ان میں کوئی مستقل نمونہ پایا جاتا ہے یا نہیں! تاہم کولی گیشن کے عمل میں بھی نیچے سے اوپر واقعات کا جائزہ لینا اور انہیں بیان کرنا بہتر طریق ہے، تاکہ دیکھا جا سکے کہ ان میں کوئی نمونہ (Pattern) ہے بھی یا نہیں اور ہے تو کیا برقرار رہ سکے گا! **تیسری؛** بعض اوقات مؤرخین کسی تاریخی پہلو یا موضوع کی متعدد خصوصیات کو یکجا کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ مثال کے طور پر؛ کسی شخص کا کردار، کسی عمل کے محرکات یا حکومتی پالیسی وغیرہ۔۔۔ تاکہ ان کی براق تفہیم کی جا سکے۔ مگر اس میں مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ موضوع کی وہ خصوصیات جنہیں مؤرخ ملا کر بیان کرتے ہیں، اُن سے موضوع کے بارے میں گمراہ کن خیالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس کی سب سے اہم مثال تاریخ کی تفہیم میں لوگوں کے کردار سے متعلق ہے۔ مثال کے طور پر مؤرخ جن لوگوں کو پسند کرتا ہے، یعنی جو لوگ اس کے نزدیک اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، تو وہ اُن کا بیان کرتے ہوئے صرف ان کے قابلِ تعریف پہلوؤں کا ذکر کرتا ہے اور اُنہیں پر زور دیتا ہے۔ اس کے برعکس جن لوگ کو وہ ناپسند کرتا ہے یا کسی قابل نہیں سمجھتا تو وہ اُس تاریخ میں ان کی برائیوں اور کمزوریوں کے ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اُنہیں ہی اس میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پس اس سے توازن رکھنا بہت مشکل ہو سکتا ہے اور قارئین گم راہی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ جس واسطے مؤرخ کو اس تناظر میں احتیاط برتنے کی ضرورت ہے کہ وہ خصوصیات کو یک جا کر کے پیش تو کرے، مگر ایسا غیر جانب دارانہ انداز رکھے کہ اس سے کسی قسم کا شُبہ باقی نہ رہے اور اس غیر جانب داری (Neutrality) کی وجہ سے اس کی ذاتی پسند و ناپسند بھی حائل نہ ہو۔ ان تینوں اغلاط کے علاوہ فلسفۂ تاریخ میں "اِدغام" (Colligation) سے متعلق ایک بحث یہ بھی ملتی ہے کہ؛ کیا یہ ادغام کے نمونے (Colligatory Patterns) حقیقت میں بھی اپنا وجود رکھتے ہیں؟ اس حوالے سے ملی جلی آرا سے سامنا ہوتا

ہے، بعض ان کے وجود کا قائل ہیں تو بعض نہیں اور بعض ایسے ہیں کہ ان کا ماننا ہے کہ ان کے ذریعے تفہیمات تو کی جا سکتی ہیں، مگر وہ حقیقت میں نہیں ہوتے۔ اسی تناظر میں بیسویں صدی کے تاریخ کے فلسفی؛"فرینکلن ریوڈولف اینکرسمیٹ" (Franklin Rudolf Ankersmit) یہ استدلال کرتے ہیں کہ؛ اِدغام کے نمونے (Colligatory Patterns) مؤرخین کے بیانیہ میں تلاش کیے جا سکتے ہیں، جن سے وہ تفہیمات کو تشکیل اور بیان کرتے ہیں، لیکن وہ حقیقت خود ماضی میں حقیقی طور پر ان میں موجود نہیں ہوتی۔"فرینکلن ریورڈ ولف اینکرسمیٹ" کی اس رائے کو "سی-بیہان میک کُلا"(C. Behan Mccullagh)یوں پیش کرتے ہیں:

> "F.R. Ankersmit once argued that colligatory patterns can be detected in the narratives historians write, constituting the interpretations they provide of the events they describe, but they do not really exist in the past itself". (29)

فلسفۂ تاریخ (Philosophy of History) ،کے اساسی مباحث میں، تاریخ کے حوالے سے "معروضیت" (Objectivity) کے مباحث کا بہت عمل دخل ہے، جس کا تعلق عمومی فلسفے میں ہونے والی "معروضیت" سے متعلق بحثوں سے بھی ہے۔ نہ صرف یہ بل کہ فلسفۂ تاریخ میں معروضیت کے مسئلے کو سب سے حیران کن اور اہم کہا گیا۔ جس بنا پر فلسفۂ تاریخ میں یہ مسئلہ انتہائی وقعت کا حامل ٹھہرتا ہے۔ معروضیت، کے لغت میں معنی؛"۱: معروضی ہونا، خارجیت۔۔۔ ۲:(فلسفہ) یہ نظریہ کہ اشیاء خیال سے باہر اپنا حقیقی وجود رکھتی ہیں، داخلیت کی ضد"، کے ملتے ہیں۔ (۳۰) اور انگریزی لغات میں بھی "Objectivity" کے قریباً یہی معنی دیے گئے ہیں۔ چوں کہ تاریخ کی معروضیت کے مباحث از خود فلسفیانہ معروضی مباحث سے ہی متصل ہیں۔ اس لیے ہمیں پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ معروضیت کو فلسفے میں کس طرح زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ معروضیت کے حوالے سے فلسفے میں کلاسیکی نوعیت کا سوال یہ رہا ہے کہ؛ جس چیز کو بھی ہم اپنا علم مانتے ہیں اس کا انحصار صرف استفسار کے مقصد پر ہے اور اس

لیے وہ اس سے آزاد ہے، جو ہم سوچتے ہیں، امید کرتے ہیں، یا تلاش کرنے کی توقع رکھتے ہیں؟ معروضی علم سے متعلق یہ ادراک، اکثر متضاد ہوتا ہے ۔ موضوعات کے دعوؤں سے جو کسی شخص کی رائے یا قیاس پر منحصر ہوتا ہے۔ جیسا کہ کوئی فلم دیکھنے کے قابل ہے یا نہیں! یعنی وہ اس لائق ہے یا نہیں! کل کا طلوع آفتاب آج سے اچھا ہے یا نہیں! کسی سیاحتی مقام پر سیر کی غرض سے جانا بہتر ہے یا نہیں! اسی طرح فلسفی فلسفیانہ مباحث میں بحث کرتے ہیں کہ آیا "اقرار" اور " صحیح یا غلط" کا کوئی معروضی علم ہے یا نہیں؟ آیا اخلاقیات کی کوئی عقلی بنیاد ہے یا نہیں؟ کچھ فلسفیوں کا خیال ہے کہ " صحیح یا غلط"، "اقدار" اور "اخلاقیات" اپنا وجود رکھتے ہیں۔ وہ الگ بات ہے کہ ہم اُن سے متفق ہوں یا نہ ہوں۔ جب کہ بہت سے فلسفی اور مفکرین "لِڈوگ جوزف جوہان وٹگن سٹائین" (Ludwig Jasef Johann Wittgenstein) کی پیروی کرتے ہوئے یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ: **"کچھ بھی اچھا یا برا نہیں ہوتا، بس ہمارا تعقُّل انہیں ایسا بنا دیتا ہے۔ یعنی وہ حقیقت میں کچھ نہیں ہیں، بل کہ ہمارے تعقُّلات کی پیداوار ہیں اور ہمارا تعقلاتی کالبُد ہی صرف ان میں تمیز کرتا ہے، جب کہ حقیقت میں ان کی حیثیت نہ ہے"**۔ فلسفیوں نے اسی طور دنیا اور مختلف مظاہر پر بات کی اور مباحث سے معروضیت کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور یہ بھی رائے دی کہ کسی قسم کی معروضی رائے اور کسی بھی چیز کے متعلق معروضیت کا نظریہ یا تصور اپنا وجود رکھتا ہے اور رکھتا تھا، چاہے کسی اور نے اس کا مشاہدہ کیا یا نہیں یا بے شک وہ رائے آنے والے وقتوں میں دی گئی ہو، مگر ان سے متعلق معروضی تحرک اس وقت اور اس زمانے میں بھی تھا، جب کوئی بھی موجود نہ تھا۔ اسی طرح کے ملتے جلتے مباحث فلسفۂ تاریخ میں بھی تاریخ کی معروضیت سے متعلق ملتے ہیں۔ جیسا کہ تاریخ کے فلسفی سوال اٹھاتے ہیں کہ: کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماضی سے متعلق ہمارے عقائد اور نظریات سچے یا جھوٹے (صحیح یا غلط) ہیں؟ یا وہ صرف ہمارے تعصبات کے عکاس ہیں؟ کیا تاریخ نگاری کے کچھ نمونے دوسروں سے بہترین یا سب ہی ایک جیسے ہیں؟ کیا تاریخ نگاری ایک نظام کا نام ہے، جس کی ہم تلاش کر رہے ہیں، یا ماضی ایک ایسی معروضی حیثیت کا حامل ہے کہ جس کا سائنسی طور پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے؟ ان اساسی سوالات کے جوابات دیتے ہوئے تاریخ نگاری کے مباحث

اور تاریخ کے فلسفہ میں معروضیت کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے اور متعدد مفکرین کی اس متعلق فلسفیانہ پس منظر کے لحاظ سے مختلف آرا اور تصورات ہیں۔ تاہم ان مباحث کا بنیادی سروکار عام طور پر معروضیت سے غیر جانب داری (Neutrality) کے تعلق، سے متعلق ہے۔ استدلال کے طور پر اگر مؤرخ غیر جانب دار نہیں ہو سکتا، کیوں کہ وہ اپنے قدری فیصلوں (Value Judgments) کو مکمل یا جزوی طور پر ختم کرنے سے قاصر ہے، تو مؤرخ اس صورت میں مثالی مقصد تک بھی پہنچنے سے پَربُریدہ رہے گا۔ اسی تناظر میں "موریس مینڈل بام" (Maurice Mandelbaum) بھی تاریخی معروضیت کو غیر جانب داری سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "When the question of the objectivity of historical knowledge is raised, the issue is one concerning the accuracy or reliability of that knowledge: but not all uses of the concept of objectivity are equally concerned with theis problem, which has to do with the truth of what is actually affirmed or denied in the judgments we make..... It is in the sense that we say that a person has been objective if he has tried not to let self-interest or fear of anger influence his judgment". (31)

موریس مینڈل بام، کہتے ہیں کہ تاریخ میں معروضیت اس طور ہے کہ اگر کوئی شخص ترقیم کے دوران اپنے فیصلوں میں خود غرضی، خوف اور غصے وغیرہ کو نہ آنے دینے کی کوشش کرتا ہے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ معروضی رہا ہے۔ یا مزید یہ کہ وہ مخصوص افراد کے لیے ان کے پیشے، اُن کی قومیت، اُن کی نسل اور ان کے مذہب کی وجہ سے تعصب کا شکار نہ ہوا ہو اور اُن سے متعلق فیصلوں کو بھی مقصد سمجھ کر برتے، تو اس کو بھی ہم معروضی کہہ سکتے ہیں۔ موریس مینڈل بام مزید کہتے ہیں کہ؛ معروضیت کا تعلق تمام معاملات میں تحفظات، جذبات اور

احساسات سے روکنے سے ہے، یعنی نہ ہی کسی پسندیدہ کی خوبیوں کو نمایاں کرے اور نہ ہی کسی ناپسند کی خامیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرے اور کم از کم اور کچھ نہ بھی ہو تو بھی اگر مؤرخین اپنی **ناگزیر اقدار (Inevitable Values)** کو اپنی تحقیق سے الگ کرلیں تو بھی تاریخ میں معروضیت کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ کچھ تاریخی حکمتی تاریخ کی معروضیت سے متعلق بحث کرتے ہوئے اسے سائنس کے مترادف بھی قرار دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں معروضی علم کو بھی سائنسی علم، کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور اس سے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ معروضیت کی سائنسی حیثیت اور فطرت ہونے کی وجہ سے، تاریخ کو معروضیت کی بجائے "موضوعیت"(Subjectivity) سے بیان کرنا چاہیے۔ جب کہ تاریخ کے حوالے سے بالکل ایسا نہ ہے۔ دیکھا جائے تو سائنس میں بھی متعلقہ حقائق کا انتخاب خود سائنس دان کرتے ہیں اور یہ حقائق اکثر ایک مخصوص نظریاتی کالبُد (Theorectical Framework) کے اندر ہی معنی رکھتے ہیں۔ اور نہ ہی سائنس دان اس حیثیت میں ہوتے ہیں کہ مطالعہ کے دوران "پوری سچائی"(The Whole Truth) کو کھول کر بیان کرسکے۔ پس سائنسی علم بھی اس لحاظ سے نامکمل ہے اور جزوی سچائیوں پر مشمول ہے۔ لہٰذا جس طرح سائنسی علم خود جزوی سچائیوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح تاریخ کو بھی اس کی منتخب اور نامکمل نوعیت کی وجہ سے موضوعیت سے منسوب کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اس حوالے سے ڈین مارک کے سائنس کے مؤرخ؛ "ھیلج سٹیرن ہولم کراج"(Helge Stjernholm Kragh) یوں رقم طراز ہیں:

> "When Sceptical historians assert the subjective nature of historical knowledge, it is usually conceived in relation to scientific knowledge with whose reliability and objectivity it is contrasted. In other words, 'objective knowledge' is regarded as being synonymous with 'scientific knowledge'. But facts are not, in themselves, given in science either. Just as in history though not in precisely the same way as in

history relevent facts are selected by the scientist and these facts aften only have a meaning within a specific theorietical framework. Nor is the scienctist in a postion to unravel 'the whole truth' about the phenomena being studies. Scientific knowledge is incomplete, too, in the sense that is consist of partial truths. There is, therefore, no reason for attributing an especially subjective nature to history because of its selective and incomplete nature."(32)

علومِ سائنس کے مؤرخ اور سائنسی متعلقات کے تاریخ نگار؛ "ھیلج سٹیرن ہولم کراج" تاریخ کے حوالے سے معروضیت کے تناظر میں تین اعتراضات کا دفاع یوں پیش کرتے ہیں (جن میں سے ایک کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) وہ کہتے ہیں؛ نہ ہی یہ جواز درست ہے کہ تاریخ کا علم نامکمل اور جزوی سچائیوں پر مشمول ہے، تو اس بنا پر اس کا معروضی جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ نہ ہی یہ درست ہے کہ تاریخ کا علم اُن ذرائع پر مبنی ہے کہ جن کی صداقت کو سختی سے ثابت نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی یہ درست ہے کہ تاریخی واقعات کا مزاج ایسا ہے کہ ان کا براہ راست مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان تمام اعتراضات کے جوابات میں وہ کہتے ہیں کہ ایک تو سائنس کا اپنا کالبُد نامکمل اور جزوی سچائیوں پر مشتمل ہے، پس اس نامکمل اور جزوی نوعیت کی بنا پر تاریخ کے حوالے سے بھی کوئی جواز نہیں بنتا کہ اُسے موضوعیت سے منسوب کیا جائے، جیسے ان خصائص کی بنا پر سائنس کو مخصوص و محدود نہیں کیا جا سکتا، ویسے ہی تاریخ کا بھی کوئی جواز ہے ہی نہیں۔ دوسرا دیکھا جائے تو دیگر تجرباتی علوم و سائنس میں بھی حالات مختلف نہیں ہیں، وہ بھی ہمیشہ مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں اور اصولی طور پر اِن سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ پس وہ بھی اسی اصول پر کار فرما ہیں تو کوئی ایسی اِباحَت نہ ہے۔ تیسرا یہ کہ تاریخی واقعات کا براہ راست مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا، تو یہاں بھی اعتراض کرنے والے تاریخ کو سائنس سے کم تر ثابت کرنے کے لیے اس کو سائنس کے خلاف رکھتے ہیں۔ "ھیلج سٹیرن ہولم کراج" کہتے ہیں کہ، دیکھا جائے تو سائنسی علم بھی براہ راست مشاہدات کی پیداوار نہ ہے،

بل کہ یہ ایک ایسے عمل کی پیداوار ہے جس کے دوران مشاہدات کو (مختلف اعتبار کے) ثبوت کے طور پر منتخب کیا اور جانچا جاتا ہے۔ پس یہ جواز بھی غلط ثابت ہوتا ہے اور ان تینوں اعتراضات کے غلط ثابت ہونے پر تاریخ کو معروضیت سے بے تامل جوڑا جاسکتا ہے اور تاریخ کا معروضی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ پس ہم اس ساری بحث کا اختتام ان الفاظ سے کرسکتے ہیں کہ معروضیت تاریخ کے لیے ضروری ہے، جو تاریخ میں ایک "مثالی" (Ideal) کردار ادا کرتی ہے اور مورخین کو "اضافی تجرباتی عوامل" (Extra-Empirical Factors) کے اثر کو دُور یا کم کرنے کی ترغیب دیتی ہے، لیکن صرف اس وقت تک جب وہ ایسا کرنے کے قابل ہوں۔

تاریخ نگاری میں معروضیت سے ہی ملتا جلتا ایک مسئلہ "ماضی کے بارے میں حقیقت پسندی" (Realism About the Past) ہے۔ روایتی طور پر حقیقت پسند کو ان معنوں میں لیا جاتا ہے کہ حقیقت آفاقی ہے یا نہیں؟ لیکن تاریخ نگاری اور فلسفۂ تاریخ میں مؤرخین اور فلسفیوں نے اسے ان معنوں میں نہیں برتا۔ بل کہ مؤرخین اور تاریخ کے فلسفی اس تناظر میں؛ ماضی، ماضی کے افراد، واقعات، سماجی ڈھانچے، سماجی قوتوں اور ثقافتوں کی حقیقت کا سوال اٹھاتے ہیں کہ ان کا حقیقی وجود کیا ہے؟ اور کیا ان میں کوئی حوالہ در حقیقت موجود ہے یا ماضی میں کسی وقت موجود تھا؟ "برٹرینڈ آرتھر ولیم رسل" (Bertrand Arthur William Russell) حقیقت پسند کی اصطلاح کے معنی یوں بتاتے ہیں کہ؛ "تاریخ میں اس اصطلاح "حقیقت پسندی" کا مطلب ماضی اور ماضی کے افراد اور ماضی کے واقعات کی حقیقت ہے"۔ [۳۳] یعنی وہ انتہائی سادہ وضاحت پیش کرتے ہوئے صرف یہ مؤقف پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اس اصطلاح سے مراد تاریخ سے متعلقہ ماضی کے افراد، واقعات اور ماضی کی حقیقت ہے اور اُسی سے بنیادی سروکار بھی ہے۔ ماضی کے افراد اور واقعات کی حقیقت کو باعمل مؤرخین عالمی سطح پر تسلیم کرتے ہیں۔ تا آں کہ فلسفیوں اور مؤرخین نے ماضی کی حقیقت پر سنجیدگی سے کبھی سوال بھی نہ اٹھایا۔ یہ "برٹرینڈ ولیم آرتھر رسل"، ہی پہلا فلسفی تھا کہ جس نے ماضی کی حقیقت پر سنجیدگی سے سوال اٹھایا۔ (جس تناظر میں وہ توضیح پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ مختلف اوقات کے درمیان ہونے والے واقعات کا کوئی آپسی منطقی

تعلق نہ ہے)۔ہاں جو سوال اٹھایا گیا وہ گہرے تاریخی ماضی کی وسعت سے متعلق تھا، یعنی جو ماضی زندہ یادوں کی پہنچ سے باہر ہے۔یعنی ماضی وماضی بعید کے وہ افراد، حالات اور واقعات کہ جن کا اب کوئی وجود نہیں، ہم اُن کے بارے میں کیا کیا جان سکتے ہیں اور کیسے جان سکتے ہیں؟ چوں کہ یہ ایک فلسفیانہ نوعیت کا سوال ہے اور فلسفے میں ہی اسے زیرِ بحث لایا گیا، پس فلسفے نے اس کا جواب چار صورتوں میں یوں دیا:(۱) حقیقی لوگوں اور حقیقی واقعات کے ساتھ، ایک حقیقی ماضی ہوتا ہے۔(۲) ہم اس حقیقی ماضی تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں، اُن دستاویزات کے حسی تجربات(Sensory Experiences) اور موجودہ نوادرات (Artefacts) کے ذریعے جو ہمارے پاس محفوظ ہیں اور اُن شواہد سے جو حقیقی ماضی سے منتقل ہونے والی معلومات کو محفوظ رکھتے ہیں۔(۳) ان معلومات میں سے، اگر یہ کافی ہیں تو ہم ماضی میں جو کچھ ہوا ہے اُسے دوبارہ تشکیل دیے سکتے ہیں۔(۴) ہماری یہ تشکیلِ نو اگر نامکمل بھی ہو، لیکن موزوں اعداد و شمار کی بنا پر وہ قریباً درست اور حقیقت سے قریب تر ہو گی۔یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ اور تاریخی عمل میں حقیقت اپنا وجود رکھتی ہیں اور اُسے بہتر پرکھ سے اور موزوں طرائق کو برتتے ہوئے ماضی کی تعمیرِ نو کی جا سکتی ہے۔ عمومی حقیقت پسندی کے علاوہ "عام عقلی حقیقت پسندی (Commonsense Realism)، نمائندہ حقیقت پسندی(Representative Realism)، تجزیاتی حقیقت پسندی (Analytic Realism) اور مخالف-حقیقت پسندی(Anti-Realism)" ، حقیقت پسندی کی چند دیگر صورتیں ہیں۔

فلسفۂ تاریخ میں زیرِ بحث لائے گئے مباحث میں ایک بحث تاریخ میں "بیانیہ"(Narrative) کے مسئلہ اور کردار سے متعلق بھی ملتی ہے۔تاریخی عمل میں "بیانیہ" اہمیت کا حامل ہے، جو تاریخی تاویل (Historical Interpretation) میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔بیانیہ کے لفظ معنی اُردو لغت میں؛"وہ تحریر (نظم و نثر) یا تقریر جس میں حقیقتِ حال مذکور ہو، وہ بیان جو ذکرِ واقعہ پر مشتمل ہو" کے بتائے گئے ہیں۔[۳۴] جب کہ بیانیہ کے ہم پلہ انگریزی زبان میں لفظ؛ ''Narrative'' استعمال ہوتا ہے، جو لاطینی زبان (Latin Language) کے لفظ؛ ''Narrare'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی؛"بتانے کے لیے، تعلق اور بیان کرنا" کے ہیں۔[۳۵] تاریخی بیانیہ سے

متعلق عمومی مباحث، تاریخ کے فلسفے میں کسی حد تک عدم اطمینان سے شروع ہوئے، جن کا ارتکاز تاریخ کی تفہیم اور توضیح سے متعلق تھا۔ (جیسا کہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں کے درمیان نام نہاد "کوورنگ لاء ماڈل" (Covering Law Model) کی بحث کا معاملہ تھا، جو ایک وضاحت کا نمونہ تھا۔) دیکھا جائے تو بیانیہ سے متعلق اہم مسئلہ یہ رہا ہے کہ آیا تاریخی بیانیہ اور تاریخ میں حقیقتاً کوئی ٹھوس تعلق ہے یا وہ تعلق برائے نام ہے؟ یا کیا مؤرخین ماضی اور ماضی کے پہلوؤں کو ویسے ہی بیان کرتے ہیں کہ جیسے وہ تھے یا ان کا بیان غیر متعین رہتا ہے؟ یعنی اس بیانیہ اور ماضی کے درمیان کوئی رشتہ ہے یا وہ رشتہ غیر متعین ہے۔ "لوئی اومنک جونیئر" (Louis O. Mink Jr.) کا خیال ہے کہ ان کے درمیان کوئی خاص متعین تعلق نہ ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ تاریخ کا فلسفہ عصرِ رواں (لوئی اومنک جونیئر کا عہد: ۱۹۲۱ء تا ۱۹۸۳ء) میں بھی ویسا ہی زندہ ہے، جیسے "کانٹ" (Kant)، "ہیگل" (Hegel) اور "مارکس" (Marx) کے دور میں زندہ تھا۔ یعنی اس میں کوئی مثبت بڑی تبدیلی نہ آئی ہے۔ یہاں تاریخ کا فلسفہ عمومی طور پر ہمیں ماضی کی کہانی بتانے کا دعویٰ کرتا ہے، جو ماضی میں موجود بیانیہ کی درست طریقے سے عکاسی کے معنی میں ہے، جب کہ "لوئی اومنک" کا خیال اس کے برعکس ہے۔ وہ اس کی درست عکاسی کا قائل نہیں ہے۔ نہ صرف یہ بل کہ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ ہمیں اس خیال کو یکسر ترک کر دینا چاہیے کہ ایک طے شدہ تاریخی حقیقت ہے۔ نیز کہانیوں کے بارے میں اُس کا خیال ہے کہ کہانیاں زندہ نہیں ہوتیں، بل کہ بتائی جاتی ہیں۔ "ڈیوڈ کار" (Daid Carr) اور "پال ریکور" (Paul Ricoeur) نے "لوئی اومنک" سے اختلاف کیا۔ اس حوالے سے "فرینکلن ریوڈولف اینکرسمیٹ" یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> “David Carr and Paul Ricoeur attacked Mink’s position (Shared by Arthur Danto, Hyden White, and Frank Ankersmit.) From a phenomenological point of view. They argued that narrative inheres already in life. We perceive everyting narratively, as a story, just as we can only become aware of a melody by holding

together the different tones constituing it in our mind. Indeed, we live and conceive of our lives narratively; narrative is the ineluctable pattern organizing all our actions and thinking.” (36)

ڈیوڈ کار، "لوئی اومنک" کی رائے کے حوالے سے اسی تناظر میں یوں لکھتے ہیں:

“Louis Mink was thus operating with a totally false distinction when he said that stories are not lived but told. They are told in being lived and lived in being told. The actions and sufferings of life can be viewed as a process of telling ourselves tories, listening to those stories, and acting them out or living them though.” (37)

ڈیوڈ کار، پال ریکور اور فرینکلن ریوڈولف اینکر سمیٹ، "لوئی اومنک" کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ نقطہ نظر پیش کرتے ہیں کہ "بیانیہ" کا وجود ہماری زندگی میں پہلے سے ہی ہے اور ہم اسی کے اندر جیتے ہیں۔ نیز ہم ہر شئے کو بیانیہ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ بالکل اُسی طرح جس طرح ہم اپنے ذہن میں مختلف طرزوں کو جوڑ کر راگ سے واقف ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہم اس سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ مزید براں وہ کہتے ہیں کہ بیانیہ ایک ناگزیر نمونہ ہے، جو ہماری سوچ اور اعمال کو منظم کرتا ہے۔ ڈیوڈ کار یہ استدلال کرتے ہیں کہ؛ "لوئی اومنک" کا یہ ازحد غلط تصور ہے کہ: "کہانیاں زندہ نہیں ہوتیں، بل کہ بتائی جاتی ہیں، یعنی بسر نہیں کی جاتیں، بل کہ بولی جاتی ہیں"۔ جب کہ ڈیوڈ کار کہتے ہیں کہ کہانیاں وجودی طور پر بسر کی جاتی ہیں، کردار (عمومی طور پر انسان وچند دیگر) جو مختلف کردار نبھاتے ہوئے نظر آتے ہیں، تو وہی عمل ان کا بیانیہ ہوتا ہے، جسے وہ اپنے وجود اور اپنے افعال کے ذریعے بیان و اظہار کرتے ہیں۔ لہٰذا انہیں علاحدہ بیان کرنے کی ضرورت نہ ہے۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ کہانیاں ازخود زندہ ہوتی ہیں۔ تاریخی بیانیہ سے متعلق مباحث کے حوالے سے امریکی مؤرخ "ہیڈن وی وائٹ"

(Hayden V. White)(پیدائش:۱۹۲۸ء،وفات:۲۰۱۸ء)سب سے زیادہ بااثر رہا، جس نے تاریخی بیانیہ سے متعلق لطیف اور امید افزا وضاحت پیش کی۔ ہیڈن وی وائٹ نے بیانیہ کے تناظر میں "میٹا ہسٹری" (Meta History)کا تصور پیش کیا، جو اصطلاح مخصوص طور پر قبول شدہ ایک نمونہ کی نشان دہی کرتی ہے اور یہ واضح کرتی ہے کہ ایک مخصوص تاریخی وضاحت کیسے ہونی چاہیے۔ بیانیہ کے حوالے سے اپنی فکر کا خلاصہ کرتے ہوئے "ہیڈن وی وائٹ" کچھ یوں لکھتے ہیں:

> "But there is one problem that neither philosphers nor historians have looked at very seriousely and to which literary theoriests have given only passing attention ...... nor is it to say that literary theoriests have naver studied the structure of historical narratives. But in general there has been a reluctance to consider historical narratives as what they most manifestly are: verbal fictions, the contents of which are as much invented as found and the forms of which have more in common whith their counterparts in literature than they have with those in the sciences." (38)

ہیڈن وی وائٹ، کے مطابق تاریخی بیانیہ کی حیثیت (جسے خالصتاً ایک زبانی نمونے کے طور پر سمجھا جاتا ہے، جو کہ ماضی کے ڈھانچے اور عمل کا ایک نمونہ ہے اور اس لیے یہ تجرباتی یا مشاہداتی انصرام کے تابع نہیں۔) سے متعلق نہ کبھی تاریخ کے فلسفیوں نے توجہ دی، نہ کبھی مؤرخین نے توجہ دی، ہاں اس کی طرف تھوڑا بہت دھیان گیا ہے، تو وہ بھی ادبی نظریہ سازوں کا۔ اس ضمن میں وہ بالا اقتباس میں اس طرف نشان دہی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کہنا درست نہیں کہ ادبی نظریہ نگاروں (Literary Theoriests) نے کبھی تاریخی بیانیے کی ساخت کا مطالعہ نہیں کیا۔ بل کہ دیکھا جائے تو دوسروں کی نسبت انھوں نے ہی اس موضوع کو زیادہ زیر بحث لایا ہے۔ پس اس تناظر میں جو مسئلہ رہا ہے اور جسے سمجھنے میں ہچکچاہٹ رہی ہے وہ یہ کہ بیانیہ واضح یعنی ظاہری طور پر کیا

ہے؟ کیا یہ "زبانی افسانے" (Verbal Fictions) ہیں؟ ہیڈن وی وائٹ کے بالا اقتباس میں لفظ "Verbal Fictions" کا ابہام تاریخی بیانیہ کے "فلسفیانہ" (Philosphical) اور "بیاناتی نقطہ نظر" (Rhetorical Approach) کے درمیان فرق کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایک طرف، یہ اصطلاح کسی ایسی شئے کی نشان دہی کرتی ہے، جو اس طرح سے "بنائی" یا "ایجاد" کی جارہی ہے، جیسے سائنس دان ایک نظریہ کو "بناتا" یا "ایجاد" کرتا ہے۔ نظریات خود کو اس طرح واضح اور پیش نہیں کرتے، جیسے درختوں یا پہاڑوں کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ سائنس دان کو اپنے تجرباتی بنیاد پر اپنے نظریات تیار کرنے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف، یہ اصطلاح افسانوی ادب سے متعلق بھی ہے، جس تناظر میں اس کا مفہوم خیالی ہونے اور حقیقی حقائق سے متفق نہ ہونے، کا ہے۔ ہیڈن وی وائٹ، اس اصطلاح کے دونوں مفاہیم کو یکجا کرکے استعمال کرتا ہے اور یہ تاثر دیتا ہے کہ تاریخی بیانیہ ہمیں اس طرح قائل کرسکتا ہے، جس طرح ایک ناول کرسکتا ہے۔ اور ایسی صورتوں میں قارئین مؤرخ کے تاریخی بیانیے سے قائل ہوجاتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے ایک باصلاحیت سیاسی خطیب ہمیں اس کے تجویز کردہ عمل سے متفق کرسکتا ہے، نہ کہ حقیقت (امر) یا ثبوت سے۔۔۔ اس ساری حیص بیص سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تاریخ کے فلسفے میں بیانیہ سے متعلق مباحث حیرت انگیز طور پر سائنس (Science) اور زبان (Language) کے فلسفوں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ نہ صرف یہ بل کہ عموماً زبان کے عصری فلسفے کی مذمت کی جاتی ہے، کہ یہ اُس وقت تک بغیر بازؤں اور ٹانگوں کے محض ایک بے کار دھڑ ہے کہ جب تک اس کے ماہرین اُنہیں ضوابط پر ڈٹے رہیں اور اپنے تصورات پر نظرِ ثانی نہ کریں۔ تو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بھی تاریخی بیانیہ سب سے اہم و بہترین توَسُل ہے۔ بایں ہمہ ہم اگر تاریخ اور بیانیہ کے اصل تعلق پر غور کریں تو اس تمام رد و قدح کے بعد تاریخ اور بیانیہ کی دو صورتیں یا حالتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک، وہ کہ جس کے تحت بیانیہ تاریخی عمل میں ایک معاون تشکیلی عنصر کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو تاریخ کی بُنت میں تصریح کا باعث بنتا ہے۔ اس صورت کے حوالے سے بحث پیچھے تفصیل میں کی جاچکی ہے۔ دوسری، بیانیہ کی وہ حالت ہے کہ جس میں بیانیہ تاریخ کی باقاعدہ تکنیکی لحاظ

سے ایک قسم کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ جس کو فنی طور پر برتتے ہوئے باقاعدہ کہانی پر مبنی شکل میں بیانیہ تاریخ لکھی جاتی ہے۔ اس میں قلیل مدتی واقعات کی تشکیلِ نو کو بنیاد بنا کر تاریخ کی ترقیم کی جاتی ہے۔ اگر چہ تاریخ کو ایک لحاظ سے سماجی سائنس سمجھا جاتا ہے، مگر تاریخ کی کہانی پر مبنی صورت تاریخی علم کی تجزیاتی یا تشریحی توضیح کے علاوہ بیانیہ کو بھی اہمیت دیتی ہے اور بیانیہ کو اپنے اندر سما جانے کی اجازت بھی دیتی ہے۔ بیانیہ تاریخ کی اصطلاح بیسویں صدی میں فرانسیسی مؤرخ "فرنینڈ براڈیل" (Fernand Braudel) نے سب سے پہلے متعارف کروائی۔ بیانیہ تاریخ کی یہ اصطلاح فرانسیسی اصطلاح: "Historie Evenementielle" جس کے معنی "واقعہ کی تاریخ" ہے، سے متراکب ہے۔ بیانیہ تاریخ کو دو ذیلی اقسام میں مزید تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جو کہ "روایتی بیانیہ" (Traditional Narrative) اور "جدید بیانیہ" (Modern Narrative) ہیں۔ روایتی بیانیہ تاریخ کی زمانی ترتیب پر مرکوز ہے، یہ واقعہ پر مبنی ہے اور اس کا مرکز فرد، عمل اور ارادہ پر ہے۔ اس کے برعکس جدید بیانیہ عام طور پر ڈھانچے اور عمومی رجحانات پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔

تاریخ (History) ،کے بالا بیان کیے گئے عناصر اور تشکیلی عوامل کے علاوہ ایک انتہائی اہم عُنصر "ثقافت" (Culture) ہے، جو تاریخی تشکیل میں انتہائی اہم کردار ادا کرتا۔ اس کی اہمیت نہ صرف تاریخ کے تناظر میں ہے، بل کہ یہ 'نو تاریخیت' کے تناظر میں بھی انتہائی اہمیت کا حامل عنصر ہے۔ یہاں تک کہ "ڈاکٹر ناصر عباس نیّر" کے مطابق تو "نئی تاریخیت کا بنیادی سروکار ادب اور تاریخ (و ثقافت) کی ہم رشتگی ہے۔" [۳۹] یعنی نو تاریخیت کا اساسی واسطہ و غرض ہی ادب کو تاریخ اور ثقافت کے ساتھ نتھی کرنا ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ تینوں کو آپس میں ایک ہی دھاگے میں پرونا ہے، یعنی ہم رشتہ کرنا ہے۔ یہاں پر ہمیں ثقافت کی اہمیت مزید افشا ہوتی ہے کہ اسے ایک لحاظ سے نو تاریخیت کی رُو سے قریباً تاریخ کے ہم پلہ سمجھا جا رہا ہے اور تاریخ کے علاوہ واحد ثقافت کو ہی ادب سے جوڑنے پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ (اسی بنا پر ثقافت کو بابِ ہٰذا کے اس ضمنی عنوان میں اخیر پر زیرِ بحث لایا جا رہا ہے کہ اس پر نسبتاً تفصیل سے بحث کی جا سکے)۔ ثقافت کے ہم پلہ اُردو میں لفظ "کلچر" بھی رائج ہے۔ کلچر،

انگریزی زبان کے لفظ: ''Culture'' کی بعینہ اُردو میں مستعمل صورت ہے۔ یوں اُردو میں "ثقافت" اور "کلچر" دونوں ایک جیسے معنی رکھتے ہیں۔ اُردو زبان کی معروف لغت: "اُردو لغت (تاریخی اصول پر)" میں ثقافت کے معنی: "کسی قوم یا گروہ انسانی کی تہذیب کے اعلیٰ مظاہر جو اس کے مذہب، نظام اخلاق، علم و ادب اور فنون میں نظر آتے ہیں" کے دیے گئے ہیں۔[۴۰] ساتھ ہی اسی لغت میں یہ وضاحت بھی دی گئی ہے کہ ثقافت کا لفظ ایجاد ہی پچھلے "بیس" سے "پچیس" سال کی ہے اور ساتھ توضیح یہ بھی دی گئی ہے کہ میں (لکھاری و مرتبینِ لغت) ثقافت کی بجائے لفظ "تہذیب" استعمال کروں گا۔ "اُردو لغت (تاریخی اصول پر)" کی اس "جلد ششم" کی اشاعت ۱۹۸۴ء میں ہوئی، جس سے اس لفظ کے رواج کے عرصے کا عصرِ رواں میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صاحبِ لغت کے نزدیک ثقافت کے لفظ نے ۱۹۸۴ء میں قریباً صرف "بیس" سے "پچیس" سال پہلے رواج پایا، تو آج اس حساب سے قریباً "اُنتالیس" سے "چالیس" سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ مابعد جدید تنقید کے معتمد نقاد: "ڈاکٹر محمد نعیم ورک" اپنی کتاب: "اُردو ناول کا ثقافتی مطالعہ (۱۸۶۹ء تا ۱۹۴۷ء)" میں لفظ: "ثقافت" اور "کلچر" (Culture) کے معنوں اور اشتقاق پر روشنی ان الفاظ سے ڈالتے ہیں:

> "اُردو کی کم از کم پانچ لغات ایسی ہیں، جو ثقافت کے معنی میں تہذیب و تمدن کو درج کرتی ہیں۔ مہذب لکھنوی نے اس کے معنی "استحکام اور تعلیم یافتہ طبقے کی زبان" دیے ہیں۔۔۔۔ آکسفورڈ کی طرز پر تیار کی گئی ضخیم اُردو لغت: "تاریخی اصول پر ثقافت کی وضاحت میں "تہذیب کے اعلیٰ مظاہر" کو درج کرتی ہے ۔۔۔۔ اب کچھ مطالب انگریزی لفظ ''Culture'' کے بھی جس کے اُردو مترادف کے طور پر لفظ ثقافت کا چلن ہوا۔ آکسفورڈ کی کبیر لغت تفصیل سے لفظ کلچر کی وضاحت کرتی ہے: Culture کے معنی میں اولاً کاشت کرنا، دیکھ بھال کرنا شامل تھا، زمانہ آگے بڑھا تو اس میں جانوروں کو پالنے کا عمل بھی شامل ہوا، پھر انسان میں تعلیم و تربیت کے ذریعے بہتری اور نفاست لانے کے معنی بھی کلچر

سے مراد لیے جانے لگے اور سائنس میں مصنوعی طریقے سے خود بینی جانداروں کی پرورش کرنا بھی اس کے مفہوم کا حصہ بن گیا۔ اس لغت میں اطوار کی نشوونما اور ترقی، افزائش اور ترقی کے ساتھ ساتھ کلچر کے معنوں میں ایک مخصوص قسم کی دانش ورانہ افزائش کا اندراج بھی کیا گیا ہے"۔(۴۱)

ثقافت و کلچر (Culture) کے قدیم و جدید نیز اُردُو و انگریزی مطالب سے اس کی وسعت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بہ ظاہر یہ ایک لفظ کس قدر وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ ثقافت اور ثقافت و تاریخ کے تعلق پر مزید تمحیص سے قبل چند مفکرین کی آرا میں اِس کی تعریف جاننے کی کوشش کریں تو اس ضمن میں: " جسٹس ایس اے رحمان " اس کی تفصیلی تعریف یوں کرتے ہیں:

"ثقافت سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کی پوری زندگی کا بھرپور نمونہ پیش کرتی ہے، جو قوم کی حیثیت سے مل جل کر رہتے سہتے ہیں اور جن کو معاشرے میں سرایت کر جانے والا ایسا ہمہ گیر نقطہ نظر باہم متحد کر دیتا ہے، جسے یہ لوگ شعوری طور پر اپناتے یا خاموشی سے قبول کر لیتے ہیں"۔(۴۲)

جسٹس ایس اے رحمان، کی ثقافت کی اس کبیر تعریف سے اس کے مفہوم کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ثقافت کس طرح کسی ایک خطے کے ایک بڑے جتھے کے لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور ان کی عکاسی کرتی ہے۔ یوں یہ دوہرا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ ایک طرف یہ اُن کی عکاسی کرتی ہے، تو دوسری طرف وہ لوگ اسی بنا پر مشترکہ اقدار کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپناتے ہیں۔ یہاں غیر شعوری اپنانے سے اس کی اہمیت اور بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ ایک عرصے بعد لوگوں کے اندر خود بخود سرایت کر جاتی ہے۔ جسٹس ایس اے رحمان، مزید یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ اس کا دائرہ عمل صرف یہاں تک نہ ہے، بل کہ یہ "انسانی سرگرمیوں، دل چسپیوں، رسم و رواج، مذہب، فنون لطیفہ، سیاست اور سیاسی اداروں کو بھی اپنے تصور میں شامل کرتی ہے۔ یہاں

لفظ "قوم" اس لیے استعمال کیا ہے کہ بالا اقتباس جس مضمون سے لیا گیا ہے، اس میں بحث پاکستان کی قومی ثقافت سے متعلق ہے۔ جسٹس ایس اے رحمان کی اس تعریف کے علاوہ ثقافت کی چند دیگر تعریفات کا جائزہ لیا جائے، تو اس ضمن میں، اُردو ادب میں ثقافت کے جدید مباحث کا آغاز کرنے والے نام ور ادیب اور نقاد: "ڈاکٹر محمد نعیم ورک" کچھ یوں لکھتے ہیں:

> "انسان ثقافتی جان دار ہے۔ ثقافت وہ بنیادی خوبی ہے، جو انسان کو دیگر مخلوقات سے ممتاز بناتی ہے۔ گروہ کی صورت میں جانور بھی رہتے ہیں، مل جل کر وہ بھی خوراک کا انتظام اور رہنے کے لیے ٹھکانے کا بندوبست کر لیتے ہیں، ان میں کسی نہ کسی سطح کا ابلاغ بھی موجود ہوتا ہے، تو پھر کیا ہے جو انسان کو جانوروں سے ممیز کرتا ہے۔ وہ علامتی ابلاغ ہے، ایسا ابلاغ جس میں مظاہر کسی اور شے کی نمائندگی کا فریضہ انجام دیتے ہیں"۔(۴۳)

ڈاکٹر محمد نعیم ورک، ثقافت کی اساسی نوعیت کی تعریف کرتے ہوئے ثقافت کو انسانوں کے حوالے سے یہ خوبی بتاتے ہیں کہ جو اسے دیگر مخلوقات سے اَوّل پہچان کا باعث ٹھہراتی ہے۔ اس سے ایک تو یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ ثقافت کا دائرہ عمل صرف انسانوں تک محیط ہے اور دوسرا یہ ان اساسی اوصاف کی حامل ہے کہ جو انسان کو انسان سمجھے جانے کے لیے ضروری ہیں اور دیگر مخلوقات سے فرق رکھنے کے لیے بھی اس کا اساسی نوعیت کا کردار ہے۔ اسی تناظر میں اُردو کے معروف ادیب کہ جنہوں نے اُردو ادب میں ثقافت کے مباحث کا آغاز کیا اور "رفیق سندیلوی" کے مطابق ثقافت ان کا محبوب ترین موضوع ہے۔ جن کو ہم "ڈاکٹر وزیر آغا" کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ "ثقافت"(Culture) اور "فطرت"(Nature) کے تعلق کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

> "نیچر اور کلچر کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ نیچر سے مراد زمین اور اس کے مظاہر مثلاً: جنگل، صحرا، پہاڑ و وادیاں نیز طوفان، زلزلے اور موسمی تغیرات ہی نہیں؛ اس

سے مراد زمین پر جان دار اور آسمان پر بادل، چاند، سورج، سیارے، ستارے اور کہکشاں۔۔۔ یہ سب کچھ ہے۔ اپنے ابتدائی ایام میں آدم زاد، نیچر سے پوری طرح ہم رشتہ تھا، مگر دوسرے جاندار کے مقابلے میں وہ جسمانی طور پر اس حد تک کم زور تھا کہ اس کے لیے اپنا تحفظ کرنا بھی مشکل تھا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے ساری کمک اس کے داخلی نظام نے مہیا کی؛ یعنی تقلیب یا Mutation نے اس کے دماغ کی توسیع کا اہتمام کیا، جس کے نتیجے میں اسے بایاں دماغ(Left Brain) عطا ہوا، جو ایک طرح کا کمپیوٹر تھا۔۔۔ یہ ایک طویل مدت سے اس کی تحویل میں تھا، لیکن اس نے آج سے صرف چند ہزار سال پہلے کام کرنا شروع کیا۔۔۔ یہی کلچر کی ابتداء تھی"۔(۴۴)

ڈاکٹر وزیر آغا، کے مطابق ثقافت کی اس ابتداء نے فطرت اور ثقافت کو جوڑے دار متخالف، جسے وہ "Binary Opposites" کہتے ہیں، کی صورت میں ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ جس کے نتیجے میں ثقافت اور فطرت کے درمیان برگشتگی اور مواقفت کے کئی زاویے اُبھر آئے۔ اسی طرح "ڈیوڈ ماٹسو موٹو" (David Matsumoto) اور "لنڈا جوآن" (Linda Juang) اپنی کتاب "Culture and Psychology" میں ثقافت کی تعریفوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"Over the years, many Scholars have attempted to define culture. Well ovwr 100 years ago, for example, Tylor (1865) defined culture as all capabilities and habits learned as members of a society. Linton (1936) referred to culture as a scoial heredity. Kroeber and Kluckholn (1952/1963) defined culture as patterns of and for behavior acquired and transmitted by symbols, consituting the distinet acchievements of human

groups, including their embodiments in artifacts. Rohner (1984) defined culure as the totality of equivalent and complementry learned meanings maintained by a human population, or by identfiable sygments of a population, and transmitted from one generation to next…...Beaumeister (2005) defined cutlure as an information based system that allows people to live together and satisfy their needs.” (45)

ڈیوڈ ماٹسو موٹو اور لنڈا جو آن، کی یہ کتاب پہلی بار بیسویں صدی کے اواخر میں قریباً ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔ (زیرِ تحقیق چھاپ، اس کا پانچواں ایڈیشن ہے، جو ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا) اس میں انہوں نے تین صدیوں یعنی: "انیسویں"، "بیسویں" اور "اکیسویں" صدی میں کی گئی ثقافت کی اہم تعریفات کو پیش کیا ہے، جس سے واضح اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط سے پہلے انگریزی میں ثقافت کا لفظ رائج تھا۔ ۱۹۶۵ء میں "ٹیلر" (Tylor) ثقافت کو معاشرے کے ارکان کے طور پر سیکھی جانے والی تمام صلاحیتوں اور عادات سے تعبیر کرتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں "لنٹن"(Linton) ثقافت کی تعریف کرتے ہوئے اسے "سماجی وراثت" کہتا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں "الفریڈ کروبر"(Alfred Krober) اور "کلائیڈ کلاک ھوہن"(Clyde Cluckohn) نے ثقافت کی تعریف علامتوں کے ذریعے حاصل اور منتقل کیے جانے والے رویے کے نمونوں کے طور پر کی ہے، جو مختلف انسانی گروہوں کی امتیازی کام یابیوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں "روہنر یا جرمن میں: ہونر"(Rohner) نے ثقافت کو، انسانی آبادی یا آبادی کے قابلِ شناخت طبقات کے ذریعے، برقرار رکھنے والے مساوی اور تکمیلی، سیکھے ہوئے معنی، کے مجموعے کے طور پر بیان کیا ہے، جو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ۲۰۰۵ء میں "بومائیسٹر یا بومیسٹر"(Baumeister) نے ثقافت کی تعریف، ثقافت کو ایک معلوماتی نظام قرار دیتے ہوئے یوں کی ہے کہ، ثقافت ایک معلومات پر مبنی نظام ہے، جو لوگوں کو ایک ساتھ رہنے اور اِن کی ضروریات پورا کرنے کی سہولت (اجازت) دیتا ہے۔ "ڈیوڈ ماٹسو موٹو" اور "لنڈا جو آن" کی پیش کردہ ۱۸۶۵ء سے ۲۰۰۵ء کی

ثقافت کی یہ تعریفات مختلف "ادبا، مفکرین، ماہرین سماجی علوم اور ماہرینِ نفسیات" کی ہیں۔ ان تمام سے جو ایک پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ کہ یہ ایک علامتی نظام ہے، جو نسل در نسل منتقل ہوتا ہے اور جو ایک خاص پیرائے میں جینے کا ڈھب سکھاتا ہے۔

پس ہم مجموعی تناظر میں جائزہ لیں تو "ثقافت"(Culture) کے چند عوامل ہمارے سامنے آتے ہیں، جو کہ یہ ہیں: اگر ہم جُملگی تناظر میں ثقافت کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ایک نقطۂ نظر سے ثقافت کا ایک اساسی وصف اس کی "ہمہ گیری"(Universality) ہے۔ جس کے تحت انسانی زیست کے تمام پہلو ثقافت کا حصہ سمجھے جاتے ہیں، یعنی ثقافت محض؛ "رسم ورواج، عادات واطوار، عقائد، مجموعی معاشرتی رویوں اور فنونِ لطیفہ "تک ہی محدود نہیں، بل کہ انسان کے **زندگی کرنے** کو ہی ثقافت قرار دیا جاتا ہے۔ اس لیے متعدد تعریفات اس حوالے سے ثقافت کو "طرزِ حیات"(Life-style) قرار دیتی ہیں۔ اسی طرح ثقافت کو ایک "کش مکش" کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے، جو انسانوں کے مختلف گروہوں اور طبقات میں مسلسل جاری ہے، کہ کس طرح مختلف طبقات اپنے ہی "ثقافتی سرمائے"(Cultural Capital)، جسے وہ "گلی، بازار، گھر، مدرسے اور سکول" سے اکٹھا کرتے ہیں اور خود کو دوسروں سے نیارا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ثقافت کے اس وصف کی طرف نشان دہی معروف ماہرِ عمرانیات: "پیئر بورڈیو یا بوردیو"(Pierre Bourdieu) نے کی۔ وہ ثقافت کو ایک "کھیل"(Game) تصور کرتا ہے اور اس کے مطابق یہ ایک ایسا کھیل ہے کہ جس میں مختلف طبقات اپنے "جمالیاتی تصورات" (Conceptions of Aesthetics) کے فروغ کی کوشش کرتے ہیں کہ خود کو دوسرے طبقات سے الگ تھلگ کر سکیں۔ "سائمن سوزن"(Simon Susen) اور "برائن ایس۔ ٹرنر"(Bryan S. Turner)، کی "بوردیو" پر مرتبہ کتاب: "The Legacy of Pierre Bourdiev: Critical Essays"، میں "ہنس جواس"(Hans Joas) اور "وولف گینگ نوبل"(Wolfgang Knobl) اپنے مضمون: "Between Structuralism and Theory of practice: The Cultural Sociology of Pierre

"Bourdieu"، جس کے مترجم:"ایلیکس سکنر"(Alex Skinner)ہیں،"بوردیو" کے اس موقف کو یوں بیان کرتے ہیں:

> "Bourdieu, 'culture' is no more than a game in which different classes enforce their particular conceptions of asethetics in an attempt to set themselves apart from other classes."(46)

ثقافت(Culture)، کو عموماًفنونِ لطیفہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔یعنی ثقافت کا ایک پہلو اور اس کے تحت ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ فنونِ لطیفہ ہی ثقافت ہے،یعنی ایک ثقافتی مرکز یا ادارہ، ثقافتی سرگرمیوں کے نام پر مختلف فنونِ لطیفہ کی صورتوں کو ہی جمع کرتا ہے اور اِن افراد کی سرپرستی کرتا ہے جو فنون سے وابستہ ہوں۔ "اسلم انصاری" اس ضمن میں یوں رقم طراز ہیں: " ثقافت کسی قوم کی تخلیقی عمل کا اجتماعی ظہور ہے، جس کے ذریعے انسانوں کے خواب، ان کی آرزوئیں، ان کی تخلیقی امنگیں، ایک خاص پیرایہ اختیار کرتی ہیں"۔(۴۷) جیسے "خالد سعید" پاکستانی ثقافت کے تناظر میں "ساز، آواز اور ادا" کے ذریعے پاکستانی ثقافت کے حسین و جمیل نقوش متعارف کروانے کے خواہاں ہیں۔یعنی کہ ثقافت کو جمالیات کے ذیل میں سمجھتے ہوئے اس کی تفہیم بھی جمالیاتی آلوں سے کرنی چاہئے۔ثقافت کے متعدد عوامل میں " ثقافتی اقدار" کو(Cultural Values) کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ثقافت، سے متعلق ہر بحث میں قریباًان کا ذکر ملتاہے۔ان پر روشنی:"ڈاکٹر محمد نعیم ورک "یوں ڈالتے ہیں:

> "اقدار کسی ثقافت کا سرمایہ ہیں۔ قدریں، ثقافت کا حاصل ہیں۔ قدریں افراد کو اقدام پر اکساتی اور بعضے اقدامات سے ان کی طبیعت میں اِبا پیدا کرتی ہیں۔ محمد نجیب کے نزدیک ثقافتی اقدار دو طرح کی ہوتی ہیں: داخلی اور خارجی، داخلی اقدار میں وہ افراد کی ذہنیت، علم، استعداد، احساسات، حوصلوں اور ان اصولوں کو شامل کرتے ہیں جن کی روشنی میں افراد کے باہمی تعلقات متعین ہوتے ہیں،

جب کہ خارجی اقدار میں ملک، معاشرتی ادارے، فنون، محنت اور اکتساب کا شوق
شامل ہیں۔ یہ دونوں طرح کی اقدار مل کر ثقافت کی تشکیل کرتی ہیں۔" (۴۸)

ڈاکٹر محمد نعیم ورک، کی پیش کردہ "محمد نجیب" کی ثقافتی اقدار، ثقافت کی اقدار کی اساسی قسمیں ہیں۔ ان میں داخلی اقدار افراد کے لیے راستے مختص کرتی ہیں اور ان کے مقاصد واضح کرتی ہیں۔ جب کہ خارجی ان کو عملی صورت کے لیے میدان فراہم کرتی ہیں۔ بالا سطور میں رقم کئے گئے ثقافتی عوامل کی چند صورتیں، جو ثقافت کی اجمالی حالت ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ اس کے مطابق ہم ثقافت کو کچھ اس طرح سے سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں: ثقافت(Culture)، کسی بھی خطے، علاقے یا ملک کے باسیوں کے خاص طور طریقے، رہن سہن کے ڈھنگ، عقائد اور رسم و رواج، وغیرہ وغیرہ کا نام ہے۔ اس کا مظہر اس قوم یا گروہ کے باسیوں میں ان کے اعمال، اخلاق، علم، ادب اور فنون میں ہوتا ہے۔ اِنہیں اس قوم یا خطے کی تہذیب (مذہب ہونا) کے اعلا مظاہر سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کی تشکیل میں تاریخ، جغرافیہ اور عقیدہ وغیرہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی تعمیر ایک "سماجی منطقے" (Social Space) کے اندر تاریخی ہوتی ہے، جو تشکیلی اعتبار سے زمان و مکان کی پابند ہوتی ہے۔ اس کے مسلسل بننے اور وجود میں آنے کی بنا پر اسے معنی کے ایک پیداواری عمل کے طور پر بھی تصور کیا جاتا ہے۔ اس تناظر میں بعض اسے نامکمل اور ناہموار(Uneven) عمل بھی قرار دیتے ہیں۔ پس ہمہ گیری، الگ شناخت کی پہچان، فنون لطیفہ کا مظہر، اقدار، معنوی جال، معنی کی تخلیق اور علامتوں کے بننے کا عمل، وغیرہ وغیرہ، اس کے اوصاف و عوامل ہیں۔

جب ثقافت(Culture)، اس قدر وسیع مفہوم کی حامل ہے اور اس کی تعمیر بھی تاریخی ہوتی ہے، تو تاریخ سے اس کا تعلق کیوں کر نہ ہو! اور تاریخ کے تشکیلی عناصر اور عوامل میں اس کا شمار کیسے نہ ہو! اس بنا پر تاریخی عمل میں اور تاریخی تشکیل میں ثقافت انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خاص کر "جدید یا نو تاریخی طریق رسائی" میں ثقافت کو بے حد اہمیت دی جاتی ہے۔ جدید مباحث میں ثقافت اور تاریخ کے تعلق کو، مختلف زاویوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی میں سے ایک زاویہ یہ ہے کہ "تاریخ میں ثقافت، معنی کی پیداوار کی 'عملیدگی'(Process) کے طور پر

ہے اور یہ عملیدگی مخصوص سماج اور زمانے میں وقوع پذیر ہو رہی ہے"۔ (۴۹) (اس طرح کے متعدد زاویے اور ہیں کہ جنہیں یہاں بے جاطوالت سے بچنے کے لیے بیاں نہیں کیا جارہا)۔ تاریخ کے مسلسل تشکیلی عمل اور اس میں ثقافت کے کردار و ثقافت کی توضیح کرتے ہوئے، "ڈاکٹر مبارک علی" اپنی کتاب: "In Search of History" میں یوں رقم طراز ہیں:

> "When we talk about culture, it includes literature, paintings, music, dance, sculpture, folklores, festivals, and celebrations. It creates such traditions, institutions, values, norms and customs, which become marks of identification and characteristic of a society and its members. As culture is created, developed and used according to the needs of a community, it, on one hand, makes attempts to sustain, conserve, and preserve the old traditions and values in the interest of privileged groups who derive their power and influence from them. On the other hand, it challenges out- dated customs and traditions and introduces new social values to adjust according to the requirements and change of time. Therefore, society remains in conflict between forces of continuity and change. History progresses because of this conflict. It gives society a new life, a new energy, and a new vitality to resist and to change. If there is an end to conflict, it means stagnation, deterioration and decline". (50)

ڈاکٹر مبارک علی، ثقافت کے ارکان اور اس کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے، بحث کا رُخ اس طرف موڑتے ہیں کہ ثقافت دوہرا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ ایک طرف یہ پرانی اقدار و روایات کو (تاریخی تناظر میں)

بر قرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے، تو دوسری جانب یہ فرسودہ رسم ورواج کو للکارتی ہے۔ اور عصر کے تقاضوں کے مُطابق تبدیل کر کے انہیں نئی سماجی اقدار کی صورت میں سامنے لاتی ہے۔ اسی عمل سے معاشرہ تسلسل اور تبدیلی کی قوتوں کے درمیان کش مکش میں رہتا ہے اور "تاریخ" (History) اس "کش مکش" کی وجہ سے آگے بڑھتی ہے۔ یہ معاشرے کو ایک نئی زندگی، نئی توانائی، مزاحمت اور تبدیلی کے لیے نئی قوت بخشتی ہے۔ اور یہی تمام اسباب تاریخ کے عمل کو جاری و ساری رکھنے کا باعث ٹھہرتے ہیں۔ مزید براں ڈاکٹر مبارک علی کا موقف ہے کہ اگر تنازعات وغیرہ کا کاتمہ ہو جائے تو اس کا مطلب جمود، بگاڑ اور زوال ہے۔ اس تمام حیص بیص سے یہ واضح انکشاف ہوتا ہے کہ ثقافت، تاریخ کے متوازی اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے، تاریخی تشکیل میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

بالا سطور میں، "تاریخ" (History) اور "فلسفہ تاریخ" (Philosophy of History) کا ایک اجمالی منظر نامہ بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ اس سے تاریخ، تاریخ کے عناصر و عوامل، تاریخ کے تشکیلی عمل، تاریخ کے بیان (جب کہ جدید مباحث کی رُو سے تاریخ از خود بیان ہے، اور تاریخ کا بیان کہنا مناسب نہیں۔) اور فلسفہ تاریخ سے اساسی تعارف ہو سکے۔ اس ضمن میں جو مباحث پیش کیے گئے ان میں: "تاریخ لفظ کا اشتقاق اور اشتقاقی پس منظر، تاریخ کی مختلف فلسفیوں کے نزدیک تاریخ کی حیثیت اور تاریخ کا کردار، تاریخ کو محفوظ کرنے کا عمل، تاریخ اور فلسفے کا تعلق، فلسفۂ تاریخ کا تعارف، تاریخ کے تناظر میں عصری ترتیب کے لحاظ سے دانش وروں، مؤرخوں اور تاریخ دانوں کے ناموں کی فہرست اور اُن کا ذکر، تاریخ کی اقسام، تاریخ کے اہم نظریات، تاریخ کی حرکت، تاریخ کے تشکیلی عناصر و عوامل کے مفصل مباحث، فرد، سماج اور تاریخ کا تعلق، سبب (Causation)، ادغام (Colligation)، معروضیت (Objectivity)، ماضی سے متعلق حقیقت پسندی (Realism About Past) "بیانیہ" (Narrative) اور "ثقافت" (Culture)، ہیں۔ ان کی مدد سے ہم سے "تاریخ" (History) اور "فلسفہ تاریخ" کی اساس سے شناسا ہوئے ہیں۔ جب ہمیں تاریخ اور فلسفہ تاریخ سے واقفیت ہو گی، تبھی ہم آگے

"تاریخیت" (Historicism) اور بالخصوص: "نو تاریخیت" (New Historicism) جیسے نظریات سے بحث کر سکیں گے۔ کیوں کہ تاریخیت اور نو تاریخیت کی اساس "تاریخ" پر ہی ہے۔

ج۔ تاریخیت: مختصر تعارف

"تاریخ" (History) کی "مطالعاتی حکمت عملیوں" (Study Strategies) پر دال "تاریخیت" (Historicism) ایک "کثیر الجہتی / جہاتی" (Multilateral) اور "بین العلومی" (Interdisciplinaty) اصطلاح ہے۔ جس کا دارومدار صرف تاریخ تک ہی نہیں، بل کہ "فلسفہ، ادب اور ثقافت" سے بھی ہے۔ تاریخیت، پر بحث سے قبل، اگر ہم اس کے لفظی مطلب کو جاننے کی کوشش کریں تو اُردو کی کسی بھی وقیع و مستند لغت میں اس لفظ کا وجود نہ ہے۔ تا آں کہ "اُردو لغت (تاریخی اصول پر)" میں بھی اس لفظ کا اندراج نہیں ہے۔ (لغات، کسی بھی زبان کے ماضی کا اثاثہ ہوتی ہیں۔ امید واثق ہے کہ آئندہ لغات میں اس کو درج کیا جائے گا۔) لیکن لفظ "تاریخیت" کے مادہ پر غور کریں تو وہ: "ا، راور خ" ہے۔ اسی بنا پر "تاریخیت بھی "تاریخ" سے مشتق ہے۔ جو انگریزی زبان کے لفظ: "Historicism" کے ہم پلہ اُردُو میں رائج ہے۔ (یہاں پر لفظ "تاریخیت" کے اشتقاقیات کو زیر بحث لانے کی وجہ، صرف تاریخیت یا اس کی اہمیت نہیں ہے، بل کہ ہمارا اصل مدعا: "نو یا نئ تاریخیت" (New Historicism) بھی یہی لفظ ہے۔ جس کے آغاز میں "نو" یا "نئ" کا اضافہ کر دیا ہے۔ اور وہ معمولی سے سابقہ کے اضافے کے ساتھ، قریباً ایک جیسا ہونے کے باوجود بھی ایک منفرد اصطلاح کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ جب کہ سابقہ: "نو" کے معنی بھی "نئے یا نئ" کے ہیں۔ ان دونوں اصطلاحات کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے "تاریخیت" کے اشتقاقیات کا یہاں جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اور یہاں پر مفصل بیان کے پیش نظر، باب ہٰذا کے جز: "د" میں، "نو تاریخیت" کے بیان میں، اُنھیں زیرِ بحث نہیں لایا جائے گا۔ تاکہ دوہرائی سے بچا جا سکے اور ان کا مفہوم و پس منظر بھی واضح ہو جائے۔) جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ تاریخیت کے اُردُو لغات میں لغوی معنی نہیں ملتے، البتہ تعریفات بہت سے لکھاریوں نے کر رکھی ہیں۔ (جن کا اگلی سطور میں بیان کیا جائے گا)۔ اسی لیے ہم

تاریخیت کے ہم پلہ انگریزی زبان میں رائج لفظ: "ہسٹوریسزم" (Historicism) کا جائزہ لیتے ہیں، جس سے تاریخیت کے لغوی معنی بھی معلوم کیے جاسکیں۔ لفظ: "Historicism" کے انگریزی کی مختلف لغات میں ایسے معنی دیے گئے ہیں، جن کا اردو ترجمہ یہ ہے: "کہ یہ ایک نظریہ ہے، جس کے مطابق ثقافتی اور سماجی واقعات اور حالات کی وضاحت تاریخ سے کی جاسکتی ہے"، "ایک نظریہ یا تصور کہ تاریخ کا تعین ناقابلِ تغیر قوانین سے ہوتا ہے نہ کہ انسانی 'ادارہ' (ایجنسی) سے"۔ "یہ عقیدہ کہ قدرت کے قوانین تاریخی واقعات کو قابو میں رکھتے ہیں، اور بدلے میں سماجی اور ثقافتی مظاہر کا تعین کرتے ہیں"۔ "تاریخ اور ماضی کے واقعات پر زیادہ ارتکاز"، "ایک تصور اور طریقہ کار جو تاریخ کی اہمیت پر زور دیتا ہے" اور "ایک تصور کہ جس کے تحت تاریخ کو اقدار (قدر) کے معیار یا واقعات کے تعین کے طور پر دیکھا جاتا ہے"۔ اس ضمن میں "میریم ویبسٹر ڈکشنری" (Merriam Webster Dictionary) میں لفظ "Historicism" کے معنی یوں دیے گئے ہیں:

> "A theory, doctrine, or style that emphasizes the importance of history: such as, a: A thoery in which history is seen as a standard of value or as a determinant of events, b: A style (as in architecture) Characterized by the use of traditional form and elements." (51)

اسی طرح "کولنز ڈکشنری" (Collins Dictionary) میں "تاریخیت" (Historicism) کے یہ معنی دیے گئے ہیں:

> "1. The belief that natural laws govern historical events which in turn determine social and cultural phenomena. 2. The doctrine that each period of history has its own beliefs and values inapplicble to any other, so that noting can be understood independently of its historical context. 3. The conduct of any enquity in

accordance with these views. 4. Excessive emphasis on history, historicism, past styles, etc.” (52)

جب کہ "کیمبرج ڈکشنری"(Cambridge Dictionary)، جیسی ثقہ، وقیع اور مفصل لغت میں بھی "Historicism" کے معنی نہیں دیے گئے۔ البتہ "آکس فرڈ لرنز ڈکشنریز" (Oxford Learner's Dictionaries)، میں اس کے معنی دیے گئے ہیں:

“The theory that cultural and social events and situations can be explained by history.” (53)

"ہسٹوریسزم"(Historicism)، یعنی "تاریخیت" کا لفظ کے اِن لغات میں مجموعی طور پر معنی کچھ اس طرح سامنے آتے ہیں: کہ "Historicism" ایک تصور یا نظریہ ہے۔ (راقم کے نزدیک 'Historicism' کو اُردو میں نظریہ سے زیادہ 'تصور' کہنا مناسب ہے۔) اور یہ نظریہ یا تصور ایسے اساسی اصول وضع کرتا ہے کہ جن کے تحت ہم تاریخ کا مُطالعہ کر سکتے ہیں۔ نیز تاریخیت یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس مطالعہ میں مؤرخین ہر دور کا الگ الگ جائزہ لیں، کیوں کہ ہر دور کے اپنے الگ الگ معاملات ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں اس مُطالعہ میں مؤرخین کو "معروضیت" (Objectivity) کا راستہ اختیار کرتے ہوئے، ذاتی پسند و ناپسند کو شامل نہیں کرنا چاہیے۔ ہم "تاریخیت"(Historicism) پر مزید بحث و تمحیص سے قبل اگر لفظ "Historicism" کے "رواج" پر غور کریں تو کچھ ایسا منظر نامہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ کہ اس سے متعلق ابتدائی نقوش "مشیل ڈی مونٹیگن" (Michel de Montaigne) اور "جیامباتیستا ویجو"(Giambattist Vico) کی تحاریر میں ملتے ہیں، مگر اس لفظ کو پہلی بار استعمال جرمن فلاسفر: "کارل ولہیلم فریڈرش شلیگل" (Karl Wihelm Friedrich Schlegel) نے کیا۔ عصرِ رواں کے معروف انسائیکلوپیڈیا: "Wikipedia" میں، اس متعلق یوں لکھا ہے:

"The term historicism (Historismus) was coined by German philosopher Karl Wilhelm Friedrich Schlegel. Over time, what historicism is and how it is practiced

have developed different and divergent meanings. Elements of historicism appear in the writings of French essayist Michel de Montaigne (1533-1592) and Italian philosopher G. B. Vico (1668-1744), and became more fully developed with the dialectic of Georg Wilhelm Friedrich Hegel (1770-1831), influential in 19th-century Europe. The writings of Karl Marx, influenced by Hegel, also include historicism. The term is also associated with the empirical social sciences and with the work of Franz Boas. Historicism tends to be hermeneutic because it values cautious, rigorous, and contextualized interpretation of information; or relativist, because it rejects notions of universal, fundamental and immutable interpretations."(54)

یعنی "Historicism" کے لفظ یا اصطلاح کے باقاعدہ سامنے آنے یا پہلی بار استعمال ہونے سے قبل ہی فرانسیسی فلسفی: "مشیل ڈی مونٹیگن" اور اطالوی فلسفی: "جیامباتیستا ویچو" کی تحریروں میں اس کی ابتدائی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ (جن کا عصر سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی ہے۔) اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں تو جرمن فلسفی: "کارل ولہیلم فریڈرش شلیگل" کے ہاں باقاعدہ اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس بحث سے نہ صرف "Historicism" لفظ کا چلن واضح ہوتا ہے، بل کہ اس سے متعلق بھی آگاہی ملتی ہے کہ اس لفظ کو اٹھارہویں صدی عیسوی سے باقاعدہ استعمال میں لایا گیا اور یہ لفظ پہلی بار "فلسفہ" (Philosophy) میں متعارف ہوا اور وہیں سے اس نے رواج پکڑا۔ اشتقاقی تناظر میں یہ لفظ "جرمن زبان" (German Language) کے لفظ "Historismus" سے انگریزی میں آیا ہے۔ چوں کہ اسے پہلی بار استعمال کرنے والا فلسفی جرمن یعنی موجودہ "جرمنی" (Germany) سے تھا۔ انگریزی زبان میں لفظ: "Historic" ہے، جو کہ ۱۶۶۰ء میں "تاریخ سے

تعلق" کے معنی رکھتا تھا اور "صفت" کی حیثیت سے تھا۔ اسی کے ساتھ لاحقہ: "ism" لگا کر اسے "Historicism" کر دیا گیا۔ جو جرمن لفظ "Historismus" کے مترادف قرار پایا۔ اس متعلقہ وضاحت: "Online etymology Dictionary" میں کچھ یوں دی گئی ہے:

"Historicism (n.) 1856, translating German historismus (by 1835), from historic + -ism. Given various senses 20c. In theology, philosophy, architecture, etc.also from 1856. Historic (adj.) 1660s, "of or belonging to history," probably a back- formation from historical, perhaps influenced by French historique. Meaning "what is noted or celebrated in history" is from 1794.Though both historic and historical have been used in both senses by respected authors, now the tendency is to reserve historic for what is noted or celebrated in history; historical for what deals with history. The earliest adjective form of the word in English was historial (late 14c., from Late Latin historialis), which meant "belonging to history; dealing with history; literal, factual, authentic," and also "of historical importance" (early 15c.). -ism word-forming element making nouns implying a practice, system, doctrine, etc., from French -isme or directly from Latin -isma, - ismus (source also of Italian, Spanish -ismo, Dutch, German -ismus), from Greek -ismos, noun ending signifying the practice or teaching of a thing, from the stem of verbs in -izein, a verb-forming element denoting the doing of the noun or adjective to which it is attached. For distinction of use, see-ity. The

related Greek suffix -isma (t) - affects some forms."(55)

یوں یہ لفظ:''Historicism'' مختلف زبانوں اور صورتوں سے گزر کر انگریزی میں وجود میں آیا اور بعد ازاں "تاریخیت" کو اسی کے متبادل لفظ کے طور پر اُردو میں برتا جانے لگا۔ اُردو میں اس لفظ کو پہلے پہل استعمال:"ڈاکٹر وزیر آغا" نے اپنی معروف کتاب "دستک اس دروازے پر" میں کیا جو کہ "۱۸ مئی ۱۹۹۳ء" میں لکھی گئی اور "ستمبر ۱۹۹۳ء" میں چھپ کر پہلی بار سامنے آئی۔ یہ ڈاکٹر وزیر آغاز، کی، میں اور تو، کی صورت میں خود سے مکالمے پر مبنی تنقیدی تصنیف ہے۔ جسے "نو دنوں" یعنی "نو" (۹) ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آٹھواں دن، یعنی آٹھویں باب میں، ڈاکٹر وزیر آغا، تاریخیت اور نو تاریخیت پر بحث کرتے ہیں۔ "علاوہ ازیں دریدا" تاریخیت" کے تصور کی بھی نفی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تاریخ بھی مابعد الطبعیات کا حصہ ہے اور سیدھی لکیر پر چلنے کا انداز ہے ۔ دریدا کے فکری نظام میں سیدھی لکیر پر چلنے کی کوئی تک نہیں۔ "[۵۶] اس کے علاوہ اردو میں باقاعدہ کسی تاریخیت یا نو تاریخیت کی تحریر یعنی مضمون یا کتاب کی شکل میں، اس لفظ کو ابتدا میں: "ریاض صدیقی" نے اپنے مضمون "نو تاریخیت" میں ۱۹۹۳ء میں ہی استعمال کیا۔ جو مضمون "اوراق" کے شمارہ "نومبر، دسمبر ۱۹۹۳ء" میں شائع ہوا۔ یہ لفظ "تاریخیت"، فرانسیسی، اطالوی، جرمن اور انگیزی زبان" سے ہوتا ہوا، " اردو میں رواج پایا۔ لفظ و اصطلاح اور ہمارا اصل مدعا:" نو یا نئی تاریخیت (New Historicism) بھی اسی لفظ :" تاریخیت " (Historicism) کی وساطت سے وجود میں آیا۔ چاہے اس کی جہات الگ ہیں۔ یا وہ کسی اور نظریے کے رد عمل کے طور پر رواج پایا۔ مگر اشتقاقی روایت اس کی بھی یہی ہے۔ جس تناظر میں اردو میں اس میں "نو" کا سابقہ کا اضافہ کیا گیا۔ جب کہ انگریزی میں سابقہ :" ''New'' کا اضافہ ہوا۔ (اسی پس منظر کے پیش نظر باب ہذا کے جز:"د" میں نو تاریخیت کے لفظ کی اشتقاقی روایت کو بیان نہیں کیا جائے گا۔ ہاں نو تاریخیت کی عمومی روایت تو ظاہر ہے کہ بیان کی جائے گی۔)

ہمارے ہاں، خاص کر کے اُردُو ادب و تنقید میں :" تاریخیت " (Historicism) کا تعارف کرواتے ہوئے، اس کا حدودِ اربعہ محدود کر کے اسے صرف ادب تک مُقفل کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ اس کا تعلق متعدد دیگر

شعبہ جات سے بھی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا آغاز ہی "فلسفہ "(Philosophy)سے ہوا۔ نہ صرف فلسفہ بل کہ اس کی ابتداء جرمنی میں فلسفے سے ہونے کے بعد، "تاریخ، معاشیات، عمرانیات اور قانون "وغیرہ کے شعبہ جات اور ان کے مفکرین کے افکار کے توسط سے ہوئی۔ اور اِن تمام شعبہ جات کے وسیلے سے یہ سلسلہ ارتقائی سفر طے کر تے ہوئے مسلسل پھیلتا چلا گیا۔ یہاں تلک کہ اس نے ادب کی سرحدوں کو بھی آکر چھوا۔ فلسفے میں سترہویں صدی عیسوی کے فلسفی: "جیامباتیستا ویچو"(Gimabattista Vico)اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے فلسفی "جوہان گوٹ فریڈون ہرڈر " نے اس کے قدیم ابتدائی نمونے (Archetypal Models)استوار کیئے۔ جیامباتیستا ویچو، نے اس تصور پر تنقید کی کہ سچائی تاریخ سے ماوراہے۔ اور دلیل دی کہ سچائی انسانی تاریخ سے مشروط ہے۔ جوہان گوٹ فریڈون ہرڈر، نے "روشن خیالی"(Enlightement)کے بنیادی نظریات جیسا کہ: "انسانیت کا تاریخی نظریہ (Historical View of Humanity)اور "عالم گیر عقلیت کے تصور" (Concept of Universal Rationality)کو مسترد کر دیا۔ اور وجوہات کی ترقی کے تناظر میں انسانی تاریخ کی ترقی پر یقین کیا۔ "روشن خیالی" (Enlightement)کے نظریات ان مفروضات پر استوار تھے کہ تمام لوگوں اور ثقافتوں پر ایک خاص قسم کی عقلیت کا اطلاق ہوتا ہے اور انسانی تاریخ ترقی کا عمل ایک خطی عمل ہے۔ جس کی ترقی کا نمونہ سب کے لیے یکساں ہے۔ جوہان گوٹ فریڈون ہرڈر، نے یہ استدلال کیا کہ ہر تاریخی دور اور ثقافت میں ایک منفرد قدر کا نظام ہوتا ہے، لہٰذا اس نے تاریخ کو متنوع، منفرد تاریخوں کے مجموعے کے طور پر تصور کیا۔ یہ پہلو تاریخیت کی بعد میں ایک اہم جہت کے طور پر سامنے آیا۔ ہرڈر، نے ماضی کی مستند تفہیم کرنے کے لیے ہر تاریخی دور کے منفرد سیاق وسباق کو سمجھنے کی اہمیت پر زور دیا۔ انیسویں صدی کے یورپ خاص طور پر جرمنی میں تاریخیت مختلف نظم وضبط کے شعبوں میں پروان چڑھی۔ قانون کے میدان میں "فریڈرش کارل ون سیوگنی" (Fredrich Carl Von Savigny)نے روشن خیالی کے قدرتی قانون کے نظریہ سازوں کے خلاف "جرمن ہیسٹوریکل اسکول آف لاء"(German Historical School of Law) کی بنیادرکھی۔ جس میں اس نے دلیل دی

کہ زبان کی طرح قوانین بھی ہر علاقے یا نسل کی منفرد تاریخ اور رسم و رواج کی عکاسی کرتے ہیں۔ "معاشیات" (Economics) میں "فریڈرش لسٹ" (Fredrich List) نے کلاسیکی معاشیات کے عالم گیر معاشی قوانین (The Universal Economics Law of Classical Economic) کے خیال پر تنقید کی اور دلیل دی کہ معاشی اصولوں اور پالیسیوں کو منفرد تاریخی سیاق و سباق کے مطابق ہونا چاہیے۔ فریڈرش کے خیالات نے "گستاؤون شمولر" (Gustav Von Schmoller) کے خیالات کو متاثر کیا۔

اہم تاریخی نظریہ سازوں میں "لیوپولڈوان رینکے" (Leopold Von Ranke)، "جوہان گستاؤ ڈراوئسن" (Johann Gustav Drogsen) اور "فریڈرش مینیک" (Friedrich Meinecke) شامل ہیں۔ جنہوں نے تاریخ کے ایک ترقی پسند نظریہ کی مخالفت کی، جو تاریخ کو عقل کی ترقی کی بنیاد پر یکساں ترقی کے عمل سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ تاریخ کی قیاس آرائی پر مبنی تفہیم پر بھی تنقید کرتے تھے، جس کی مثال "جارج ولہیلم فریڈرش ہیگل" نے بھی دی۔ انہوں نے استدلال کیا کہ ہر علاقے اور لوگوں میں منفرد خصوصیات پائی جاتی ہے، جو فلسفے میں تجریدی قیاس آرائیوں پر مبنی تجریدی یکساں نمونوں کے لیے ناقابل تلافی ہیں۔

اسی طرح "ولہیلم ڈلتھی" (Whilhelm Dilthey) نے فلسفے میں تاریخیت کی ایک تصوراتی تشکیل قائم کرنے کی کوشش کی۔ ولہیلم ڈلتھی، نے استدلال کے تصور کو تفہیم سے پاک و غیر جانب دار طور پر دیکھا۔ ولہیلم ڈلتھی کا براہ راست ہدف "کانٹ" (Kant) تھا، جو عقلیت کا وہی تصور رکھتا تھا، جو روشن خیال رکھتے تھے۔ ولہیلم ڈلتھی نے دلیل دی کہ تاریخی واقعات منفرد ہیں اور اُنہیں دہرایا نہیں جا سکتا۔ واقعات کو سمجھنے کے لیے موجود سیاق کو چھوڑ کر اُنہیں تاریخی تناظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح "نیوکانٹیوں" (Neo-Kantians)، "ولہیلم ونڈیل بینڈ" (Wilhelm Windelband) اور "ہیزش جاہن ریکرٹ" (Henrich John Rickert) نے تاریخی سائنس اور قدرتی سائنس کے درمیان فرق واضح کرنے کی کوشش کی اور تاریخی علوم کو نظم و ضبط کی ایک خاص قسم کے طور پر بیان کیا جو واقعات اور قدرتی علوم کی منفرد انفرادی خصوصیات کو

بیان کرتا اور قوانین کے ذریعے مظاہر کی توضیح کرتا۔ اسی طرح ایک جرمن "ماہرِالٰہیات" (Theologian) "ارنسٹ ٹرلٹسش" (Ernst Troeltsch) نے تاریخیت کی تعریف عقلیت پسندی کے برعکس کی اور مشترکہ آفاقی قانون تلاش کرنے کی سعی کی۔

پس اِس طرح "تاریخیت" (Historicism) نے مختلف شعبۂ جات سے گزر کر موجودہ شکل اختیار کی۔ اس ضمن میں جو اہم مفکرین ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں :"کارل پوپر" (Karl Popper) ،کارل مارکس" (Karl Marx) اور "جارج ولہیلم فریڈرش ہیگل" (Georg Wilhelm Friedrich Hegel) ،ہیں۔ جنہوں نے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تاریخیت کے رواج میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی کے ساتھ تاریخیت کی کچھ بڑی 'صورتیں' یا' قسمیں' بھی ہیں۔ جن میں "ہیگل کی تاریخیت " (Hegelian Historicism)، "بشریاتی تاریخیت" (Anthropological Historicism)، "نئی تاریخیت" (New Historicism)، "جدید تاریخیت" (Modern Historicism) اور "عیسائیوں یا بائبل کی تاریخیت" (Christian or Biblical Historicism) ، تاریخیت کی اہم صورتیں ہیں۔ ہیگل کی تاریخیت؛"جارج ولہیلم فریڈرش ہیگل" (Georg Wilhelm Friedrich Hegel) کے تاریخیت سے متعلق نظریات پر مشتمل ہے۔ ہیگل، کے نزدیک تاریخ کا حتمی مقصد :"انسانی آزادی" (Human Freedom) ہے۔ جو کامل ریاست کے قیام سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ہیگل، تاریخیت کے تناظر میں یہ خیال کرتا ہے کہ کسی بھی انسانی معاشرے اور تمام انسانی سرگرمیوں جیسے :"فلسفہ ، ادب، فنونِ لطیفہ اور مصوری" وغیرہ، کی تعریف اُن کی تاریخ سے ہوتی ہے۔ اور اُن کے جواہر کو، تاریخ سمجھ کر ہی، تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اوراسی طرح انسانی کوششوں کی تاریخ نہ صرف جاری رہتی ہے بل کہ اُس کے خلاف ردِ عمل بھی ظاہر کرتی ہے، جو پہلے سے ہو چکا ہو۔ اس کی وضاحت کچھ یوں کی گئی ہے:

> "Hegel's historicism also suggests that any human society and all human activities such as science, art, or philosophy, are defined by their history. Consequently,

their essence can be sought only by understanding said history.”(57)

بشریاتی تاریخیت (Anthropological Historicism)، تاریخیت کی وہ صورت ہے کہ جس کے تحت؛"بشریات، ثقافت اور جدید علوم "کے تناظر میں ماضی کا مُطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز انیسویں صدی عیسوی کے وسط اور بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ہوا۔ بشریاتی تاریخیت کے تین اہم دبستان ہیں۔ جو کہ "برٹش سکول آف ڈفیوژنزم" (British School of Diffusionism)،"جرمن سکول آف ڈفیوژنزم"(German School of Diffusionism) اور " تاریخی تفریق پسندی" (Historical Particularism)، ہیں۔ اس مکتبۂ فکر کے اہم مفکرین میں:" فرانز یوری بوئس"(Franz Uri Boas)، "رتھ بنی ڈکٹ"(Ruth Benedict)،"الفریڈ لوئس کروبر"(Alfred Louis Kroeber) ، "سر گرافٹن ایلیٹ اسمتھ"(Sir Grafton Elliot Smith) اور"رابرٹ فرٹز گریبنر"(Robert Fritz Graebner)، شامل ہیں۔ اس تناظر میں "فرانز یوری بوئس"(Franz Uri Boas)نے عملی طور پر بہت سی خدمات سرانجام دیں۔ جیسا کہ اُس نے مختلف اور مخصوص ثقافتوں کی تاریخوں کی تشکیلِ نو کی۔ اِس متعلق "دی یونیورسٹی آف الاباما"(The University of Alabama) کے : شعبۂ بشریات " سے تعلق رکھنے والے " ڈینا اسمتھ"(Deanna Smith) ، "جوزف سکرگس"(Joseph Scruggs) ، اور "جوناتھن بیری" (Jonathan Berry)لکھتے ہیں:

"Historical particularism was an approach popularized by Franz Boas as an alternative to the worldwide theories of socio-cultural development as promoted by both evolutionists and extreme diffusionists, which he believed were simply improvable. Boas argued that in order to overcome this, one had to carry out detailed regional studies of individual cultures to discover the

distribution of culture traits and to understand the individual processes of culture change at work. In short, Boas sought to reconstruct the histories of specific cultures. He stressed the meticulous collection and organization of ethnographic data on all aspects of many different human societies. Only after information on the particulars of many different cultures had been gathered could generalizations about cultural development be made with any expectation of accuracy." (58)

(کچھ مفکرین "نَو یا نئی تاریخیت" (New Historicism) کو بھی "تاریخیت" کی ہی ایک صورت یا قسم گر دانتے ہیں۔ جس تناظر میں چند صفحات پہلے تاریخیت کی صورتیں بیان کرتے ہوئے، نو تاریخیت کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ پس نو تاریخیت کا تفصیلی تعارف باب ہٰذا کے جُز: "د" میں، آگے کر یا جائے گا۔ اس لیے یہاں پر اس کا تعارف پیش نہیں کیا جارہا، تاکہ دوہرائی سے بچا جاسکے۔)

جدید تاریخیت (Modern Historicism)، بھی تاریخیت کی ہی ایک اور صورت ہے۔ اسے تاریخیت اور نئی یا نو تاریخیت کی درمیانی کڑی بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کا رواج بیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور اکیسویں صدی عیسوی کے اوائل سے ہوا۔ اس کے تحت جو مطالعات کیے جانے لگے۔ ان میں اس بات پر زور دیا گیا کہ پڑھت اس طور کی جائے کہ ماضی کے عناصر کو حال میں ضم کر دیا جائے۔ اسے متعدد مفکرین کوئی خاص طریقہ کار نہیں سمجھتے۔ جدید تاریخیت، کے علم برداروں میں "بنی ڈیٹو کروچے" (Benedetto Croce) کا نام بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے اس تناظر میں جو تفہیمات پیش کی، اُن سے ایک طرف تاریخ کی اہمیت واضح ہوئی اور ساتھ ہی تاریخی تناظرات کی اہمیت بھی اجاگر ہوئی۔ اس ضمن میں "نیو ورلڈ انسائیکلوپیڈیا" (New World Encyclopedia) میں یوں لکھا ہے:

"Within the context of twentieth century philosophy, the conflict over whether a-historical and immanent methodologies such as positivism and linguistic analysis were sufficient or whether context, background, and culture are important beyond the mere need to decode words, phrases, and references. While post- structural historicism is relativist in its orientation, that is, it sees each culture as its own frame of reference, a large number of thinkers have embraced the need for understanding historical context. This is not because culture is self-referential, but because there is no more compressed means of conveying all of the relevant information except through history. This view is often seen as being rooted in the works of Benedetto Croce."(59)

تاریخیت کی مختلف صورتوں یا قسموں میں ایک: "عیسائیوں یا بائبل کی تاریخیت" (Christian or Biblical Historicism) بھی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ اس کا تعلق مذاہبِ عالم کے ایک بڑے مذہب "عیسائیت" سے ہے۔ اور یہ اُنہیں کے عقائد سے متعلق ہے۔ عیسائی حلقوں میں اور بالخصوص اُن کے غیر مقلد فرقہ: "پروٹسٹنٹ" (Protestant) میں تاریخیت سے مراد خداوند کے پیغام یا پیش گوئی (Prophecy) کا وہ مسلسل عمل ہے، جو تاریخ میں جاری و ساری ہے۔ یعنی یہ نظریہ یہ مانتا ہے کہ انجیل مقدس (Holy Bible) کے ذریعے انسانوں کو خداوند کے پیغام کی ترسیل تاریخی طور پر آج بھی ہو رہی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس دوسرا نظریہ اس پیغام کے مکمل ہو جانے پر یقین رکھتا ہے اور اسے ماضی تک محدود کر دیتا ہے۔ یوں اسے مسلسل تاریخی منظر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں اسے بائبل کے پیغامات یا پیش گوئیوں کی تفہیم کا ایک طریقہ بھی مراد لیا

جاتا ہے۔ جس میں تفہیم کے دوران علامتوں کو تاریخی افراد، قوموں اور واقعات کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

> "In Christian eschatology, historicism is a method of interpretation of biblical prophecies which associates symbols with historical persons, nations or events. The main primary texts of interest to Christian historicists include apocalyptic literature, such as the Book of Daniel and the Book of Revelation. It sees the prophecies of Daniel as being fulfilled throughout history, extending from the past through the present to the future. It is sometimes called the continuous historical view." (60)

بالا سطور میں تاریخیت کے اہم مفکرین اور ناقدین کا ذکر کیا گیا ہے۔ (ابھی تلک زیادہ بحث مفکرین سے متعلق رہی ہے) اس تناظر میں "تاریخیت" (Historicism) کے ضمن میں ایک نام: "سر کارل ریمنڈ پوپر" (Sir Karl Raimund Popper)، کا بھی ہے۔ جو بیسویں صدی عیسوی کے نام ور "آسٹرین -برطانوی" (Austrain British) فلسفی، نقاد اور تعلیمی و سماجی مبصر تھے۔ یہ تاریخیت کے اہم نقاد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ سر کارل ریمنڈ پوپر نے اس ضمن میں ایک کتاب: "The Poverty of Historicism"، لکھی۔ جس کا شاید اُردو میں ترجمہ (مفہوم) "تاریخیت کی غربت یا مفلسی یا تنگ حالی" بنتا ہے۔ یہ اسے ہم مزید بہتر طریقے سے "تاریخیت کا افلاس" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب کا انگریزی ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں پہلی بار چھپ کر سامنے آیا۔ جس میں سر کارل ریمنڈ پوپر نے اسے چار حصوں یا ابواب میں تقسیم کر کے تاریخیت کے افلاس کو بیان کیا۔ وہ چار ابواب یہ ہیں:

1. THE ANTI-NATURLISTIC DOCTRINES OF HISTORICISM.
2. THE PRO-NATURALLISTICS DOCTORINES OF HISTORICISM.

3. CRITICISM OF THE ANTI-NATURALISTIC DOCTRINES.
4. CRITICISM OF THE PRO-NATURALISTIC DOCTIRNES.

سر کارل ریمنڈ پوپر، ان "چار"(۴) ابواب میں قریباً "تینتیس"(۳۳) ضمنی موضوعات کو بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں اس نے تاریخیت کی نشان دہی کرتے ہوئے اسے "Inexorable Laws of Historical Destiny" قرار دیا اور اس کے خلاف خبر دار کیا۔ اس حوالے سے کارل ریمنڈ پوپر اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں:

> "In fact, some influential historicist writers have optimistically foretold the coming of a realm of freedom, in which human affairs could be planned rationally. And they teach that the transition from the realm of necessity in which mankind at present suffers to the realm of freedom and reason cannot be brought about by reason but- miraculously only by harsh necessity, by the blind and inexorable laws of historical development, to which they counsel us to submit." (61)

اپنی اس کتاب کے محاکمہ میں "سر کارل ریمنڈ پوپر"، تاریخیت کو ایک بہت ہی پرانی تحریک قرار دیتے ہیں۔ اس تناظر میں وہ لکھتے ہیں:

> "Historicism is a very old movement. Its oldest forms, such as the doctrines of the life cycles of cities and races, actually precede the primitive teleological view that there are hidden purposes behind the apparently blind decrees of fate. Although this divination of hidden purposes is far removed from the scientific way of thinking it has left unmistakable traces upon even the most modern historicist theories. Every version of

historicism expresses the feeling of being swept into the future by irresistible forces." (62)

چند ناقدین "سر کارل ریمنڈ پوپر" کے تاریخیت سے متعلق خیالات کو کھلم کھلا "تاریخیت پر حملہ" سمجھتے ہیں اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ افکار سر کارل ریمنڈ پوپر کی تاریخیت پر تنقید نہیں بل کہ اس پر حملے کے مترادف ہیں، اور اس کی وجہ وجہ یہ بتاتے ہیں کہ "سر کارل ریمنڈ پوپر" نے اپنی دوسری کتاب: "The open society and its enemies" میں تاریخیت کے حامیوں "افلاطون" (Plato) ، "ہیگل" (Hegel) اور "مارکس" (Marx) پر تنقید نہیں کی بل کہ انہیں "معاشرے کے کھُلے دشمن"(Enemies of the open society) قرار دیا ہے۔ اس بنا پر چند ناقدین سر کارل ریمنڈ پوپر کی تنقید کو، تنقید کی بجائے حملہ تصور کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سر کارل ریمنڈ پوپر کا خیال تھا کہ یہ معاشرے کے دشمن اس لیے ہیں کہ یہ تاریخ کو ایک متعین نمونہ قرار دے کر ہر انسان سے اس کا جمہوری حق چھین لیتے ہیں۔ کہ اگر تاریخ کوئی طے شدہ نمونہ ہے، تو انسان معاشرے کے ارتقا میں اپنی آزادانہ شرکت کیسے کر سکتے ہیں؟ سر کارل ریمنڈ پوپر، کا خیال تھا کہ یہ تصور معاشرے کو "مُطلق العنایت"(Totalitarianism) کی طرف لے جاتا ہے۔

تاریخیت(Historicism) ، بالا سطور میں بیان کردہ پڑاؤ طے کر ادب اور ادبی تنقید تلک پہنچی۔ جس کا مجموعی منظر نامہ ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ اس کا آغاز پہلے پہل "فلسفے"(Philosophy) میں جرمن فلسفی: "کارل و لہیلم فریڈرش شلیگل"(Karl Wilhelm Friedricb Schlegel) نے کیا۔ اور بعد ازاں متعدد شعبہ جات سے گزر کر اس کا وُرُود ادب اور ادبی تنقید میں ہوا اور اس کے تحت مطالعات کیئے جانے لگے۔ اس ضمن میں یہ ایک ایسی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے کہ تاریخیت ایک ایسا تصور و نظریہ کہ جس کا اساسی تعلق "تاریخ"(History) سے ہے۔ یاد رہے کہ اس کا اساسی تعلق تاریخ سے ہے مگر یہ از خود اپنی اصلیت و فطرت میں تاریخ نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ واقعات کو بیان کرنے کے لحاظ سے، تاریخ کے بیان کی حیثیت رکھتی ہے۔ (جدید مباحث کی رُو سے تاریخ از خود بیان ہوتی ہے، اسے الگ سے بیان کہنا درست نہیں ہے۔ اس لیے جب اِس کی

حیثیت تاریخ کی نہیں ہے تو یہ اِس تناظر میں تاریخ کا بیان بھی نہیں ہے۔) بل کہ تاریخیت، تاریخ کی پڑھت کا نام ہے کہ جس کے متعین کردہ اصول و ضوابط کے تحت تاریخ کو پڑھنے، پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کا عمل کیا جاتا ہے۔اسے اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ تاریخیت، تاریخ کی مُطالعاتی تدبیروں پر دال ہے۔یہ مطالعے کے منفرد رخ کے طور پر سامنے آئی ہے کہ جس کا تعلق نہ صرف تاریخی تناظر میں تاریخی متون سے ہے بل کہ یہ دیگر علوم کی تفہیم میں بھی مدد گار ہے۔جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ جرمن مفکرین کے نزدیک تاریخیت صرف تاریخ کو ہی محیط نہیں بل کہ بیش تر عمرانی و ثقافتی علوم اس کے دائرۂ اثر سے فرار حاصل نہیں کرسکتے۔تاریخیت، کے تناظر میں اہم لکھاری: "پال ہملٹن"(Paul Hamilton) اپنی تصنیف: ”Historicism“ میں تاریخیت کا تعارف یوں کراتے ہیں:

> “What is historicism? Historicism (or 'historism' in this translation of Curtius' Historismus) is a critical movement insisting on the prime importance of historical context to the interpretation of texts of all kinds. It has enjoyed a long tradition of influence upon many disciplines of thought, recently experiencing a lively renewal in contemporary literary criticism. The most prominent late 20th-century critical fashions, poststructuralism and postmodernism, have ended up being understood through the images of history they imply. Yet this historical turn rejoins a well-worn tradition of historicism. At present, historicism is tempted to present itself as 'new', the latest way forward for literary theory. That alone might be a good reason for a book on it. In addition, though, to briefing students on the current state of the critical art, a book on historicism should identify an underlying pattern of

historical explanation recurring at different times in different forms”. (63)

تاریخیت، کے تحت ادبی متون کے مطالعے کی چند جہات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ تاریخیت کسی بھی ادبی متن کی حیثیت خود مختار گردانتی ہے۔ یعنی اگر تاریخیت کے تحت کسی بھی ادبی متن کا مطالعہ کیا جائے تو اس ادبی متن کی حیثیت انفرادی و خود مختار ہوگی۔ تاریخیت، تاریخی تناظر میں حقائق کو جانچنے کے لیے، اس کا تقابل دیگر سماجی و ثقافتی علوم سے کرنے کی حامی نہیں ہے۔ بل کہ جو کچھ ادبی متن میں بیان ہے بس اسی کے تاریخی مطالعہ کا تقاضا کرتی ہے۔ اس تناظر میں تاریخیت کے تحت صرف سامنے آنے والے حقائق کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ پس پشت عوامل کو اس مطالعہ میں نہیں پرکھا جاتا۔ تاریخیت کے مطابق تاریخ کی حیثیت ماضی کے واقعات کی ہے۔ یعنی تاریخ صرف خالص ماضی کے واقعات کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا یہ تصور کیا جاتا ہے کہ تاریخ تک درست رسائی اور اس کی پیش کش انہیں واقعات کے توسط سے ممکن ہے۔ پس تاریخ کو واقعات پر مبنی ایک سلسلہ سمجھا جائے۔ اور متون کا مطالعہ بھی اسی تناظر میں کیا جائے۔ اس ضمن میں تاریخیت یہ بھی تقاضا کرتی ہے کہ کسی بھی مطالعے کے دوران تاریخی تناظر میں تاریخی متون اہمیت کے حامل ہیں نہ کہ ادبی تاریخی متون۔ اس لیے مطالعے کے دوران ان کی پرکھ خالص تاریخی متون کے مدنظر رکھ کر کی جانی چاہیے۔ نہ کہ صرف ادبی تاریخی متون کے تناظر میں۔ یعنی اس مطالعے میں حوالہ کی حیثیت خالص تاریخی متون کی ہوگی۔ اور یہ مطالعہ خالص داخلی عناصر کی بنا پر ہوگا۔ یعنی خارجی عناصر کا اِس مطالعے سے کوئی واسطہ نہیں۔ پس تاریخیت کا اصرار ہے کہ صرف داخلی عناصر اور اقدار کو ہی مُطالعہ کے دوران پرکھا جائے۔

تاریخیت (Historicism) ثقافت (Culture) کو مُطالعہ یا پڑھت کے دوران اہمیت دیتی ہے۔ یعنی تاریخیت تقاضا کرتی ہے کہ تاریخی پڑھت ثقافتی تناظر میں کرنی چاہیے۔ مگر اس ضمن میں تاریخیت ثقافت کو ایک نظام (System) سمجھنے پر مصر ہے۔ اور نظام بھی واحدانی نظام۔ جس سے یہ ثقافت کو قدرے محدود کر دیتی ہے۔ جب کہ ثقافت کا مفہوم جدید مباحث اور علوم میں اس کے برعکس ہے۔ اسی طرح تاریخیت تاریخ کر پڑھت

"معروضی" (Objectively) طریقے سے کرنے کی حامی ہے۔ اور تاریخیت کے مفکرین یہ خیال کرتے ہیں کہ تاریخ کا معروضی مُطالعہ ممکن ہے۔ ساتھ ہی وہ تاریخ اور تاریخی متون کو بھی مکمل سمجھتے ہیں۔ کہ ان میں کوئی خاص "خلا" نہیں ہے۔ تاہم تمام تاریخی ادوار کو باہم مربوط سمجھ کر اس پڑھت کے عمل کو آگے بڑھانا چاہیے۔ ان تمام حسن و قبح کے ساتھ ساتھ تاریخیت نے ایک اہم نکتہ بھی واضح کیا۔ جس کے مطابق تاریخیت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ کسی بھی عہد کے اہم واقعات اُس عصر کی غالب سیاسی اور سماجی قوتوں اور مقتدر طبقوں کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ پس ہمیں مطالعے میں اُن عوامل کی نشان دہی کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

اُردو ادب و تنقید میں "تاریخیت" (Historicism) کے نظری مباحث کو پہلی بار باقاعدہ "ڈاکٹر وزیر آغا" نے اپنی تصنیف "دستک اس دروازے پر"، میں ۱۹۹۳ء میں پہلی بار پیش کیا۔ بعد ازاں "نو تاریخیت" (New Historicism) کے تحت مختلف نظری مباحث کے مضامین میں "تاریخیت" کو ضمنی طور پر زیر بحث لایا جاتا رہا۔ البتہ جن تین مضامین میں باقاعدہ "تاریخیت کا عنوان" دے کر تاریخیت کے مباحث کو پیش کیا گیا ہے ان میں "پروفیسر عتیق اللہ" کا: "تاریخیت و نو تاریخیت" (۲۰۰۲ء) اور انہیں کا دوسرا مضمون: "نو تاریخیت اور اس کا پیش و پس" (۲۰۰۵ء) اور "الطاف انجم" کا "نئی تاریخیت" (۲۰۱۳)، شامل ہیں۔ **اس تناظر میں الطاف انجم کا مضمون اہمیت کا حامل ہے۔** ایک اور مضمون کہ جس کا عنوان "مابعد جدیت تاریخیت، نئی تاریخیت" ہے اور اس کے لکھاری "وہاب اشرفی" ہیں، جو ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں راقم کو عنوان اور پہلی سطر کے علاوہ کہیں تاریخیت سے متعلق کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ اُردو میں تاریخیت کے تحت اطلاق مطالعات کے دو نمونے، دو کتابی صورتوں میں سامنے آئے۔ اس ضمن میں پہلی کتاب "اسلم سراج الدین" کی "تنقید اور تاریخیت" کے عنوان سے ہے۔ جو ۲۰۱۳ء میں پہلی بار "مثال پبلشرز، فیصل آباد" سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب "سولہ" (۱۶) مضامین پر مشتمل ہے۔ جن کے عنوان: "حسین بن منصور حلاج، ہو موہیو مو، "ٹانواں ٹانواں تارا" پر ایک نظر، اس شام کا جواز، اکبر حمیدی کا شہر غزل، کندن، سلطنت، نالۂ گرم، آہِ سرد، میلہ اکھیاں دا، اسحاق محمد (تاریخی مادیت کے حوالے سے)، قفس،

خانہ ساز، جہنم اور صندل کی چھڑی: شاہد جمیل احمد کا فکشن، برناب، تعزیت نامہ (محترمہ سبط الحسن کے انتقال پر برادرم پرویز مجید کے نام ایک خط)، اور اسلم سراج الدین کی تنقید (ڈاکٹر محمد علی صدیقی)، ہیں۔ دوسری کتاب :"ڈاکٹر ناہید قمر" کی "اُردو ادب میں تاریخیت" کے عنوان سے ہے۔ جو ۲۰۱۷ء میں "پورب اکادمی، اسلام آباد" سے پہلی بار شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھی ڈاکٹر ناہید قمر کے اطلاق مضامین پر مشتمل ہے جن کی تعداد، ابتدائیہ، کے علاوہ "گیارہ" (۱۱) ہے۔ اِن کے عنوان: "اُردو ناول میں تاریخیت، تہذیبی آویزش اور اقبال، قرۃ العین حیدر، جلاوطنی اور تہذیبی بکھراؤ کا المیہ، 'راکھ' میں تاریخی و سیاسی شعور، پس نو آبادیاتی ادب کا دائرہ کار، جدید اُردو نظم اور سلیم الرحمٰن کی شعری کائنات، اُردو افسانے کا جہانِ معنی، 'بہاؤ' تاریخ اور مابعد تاریخ، تصوف کا جمالیات اور دشتِ سوس، ن م راشد کے فکری سروکار، اور انتظار حسین کا تصورِ تہذیب، ہیں۔ اس کے علاوہ وہ "سید ازور عباس" کا ایم۔ فل کی سطح کا ایک سندی تحقیقی مقالہ بعنوان: "اُردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث" ہے۔ یہ مقالہ "پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران" کی نگرانی میں ۲۰۱۸ء میں شبۂ اُردو، اوری اینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور"، میں سند کے حصول کی غرض سے رقم کیا گیا۔ اس مقالے میں بالا بیان کردہ دونوں کتب کے مضامین کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ پس اُردُو ادب و تنقید میں "تاریخیت"(Historicism) کے تناظر میں تاحال یہ کل سرمایہ ہے۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ "تاریخیت" کے تناظر میں اُردُو ادب و تنقید میں بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ اُردو ادب و تنقید میں بدقسمتی سے ایک مضمون ایسا نہیں ملتا کہ جو تاریخیت کا پورا منظر نامہ واضح کر سکے۔ یا منظر نامہ تو دور اس کی دھندلی سی روایت ہی پیش کر سکے۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخیت دراصل صرف ادب تک ہی محیط نہیں، بل کہ اس کا دائرہ عمل بے حد وسیع ہے۔ اور یہ ان متعدد سماجی علوم سے گزر کر آج اس صورت میں ہم تلک پہنچی ہے۔ تاہم ہمیں تاریخیت کو مزید سمجھنے کے لیے؛ فلسفہ، سماجی علوم، سائنس اور ادب' کے بالا بیان کیے گیے مفکرین سے آگاہی حاصل کرنے کی ضرورت ہے کہ جن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم "تاریخیت"(Historicism) سے مزید آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔

د۔ نظریۂ نو تاریخیت: تعارف

ایک ادبی لکھت یا متن (Writing or Text) صرف فن و متن کا ملغوبا نہیں، بل کہ یہ اُس وقت، مقام، ثقافت اور تاریخی حالات کی پیداوار (Production) ہے، کہ جب وہ تخلیق رقم ہوئی ہو، یہ ماننا ہے؛"نو تاریخیت" (New Historicism) کے مفکرین کا۔۔۔اس خیال سے "تاریخ" (History) اور "ثقافت"(Culture) ،ادب کے اساسی تشکیلی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے مُتعدد افکار و خیالات کے ساتھ: "نظریۂ نو تاریخیت"(The Theory of New Historicism) ، "اَسی کی دہائی" (The Eighties) میں "مغرب"(West) میں اُبھر کر سامنے آیا۔ جس کی اساس، ادب، تاریخ اور ثقافت کے رشتوں اور اُنہیں ہم رشتہ کرنے پر استوار کی گئی اور اِسی ہم رشتگی کے حوالے سے نَو تاریخیت نے ادب و تاریخ کے ضمن میں قرأت کے جدید طرائق وضع کیے۔ جن کی بنا پر ادبی متون کی تاریخی تناظر میں مزید عمدہ اور توضیحی؛"تفہیم و تعبیر"(Elucidation and Interpretation) ،کی جانے لگی۔ یوں افشا ہوا کہ نظریۂ نَو تاریخیت ادب سے پَچی ہے اور پڑھت کی جدید تدبیروں سے متعلق ہے۔

دیکھا جائے تو کوئی بھی ادبی نظریہ و تصور دفعتاً ارتجالاً اُبھر کر سامنے نہیں آتا، بل کہ اس کے پیش کرنے کے اور سامنے آنے کے پسِ پشت مقاصد کے ساتھ ساتھ اِس کے پس منظر میں مُتعدد افکار و نظریات اور مفکرین کی آرا شامل ہوتی ہیں، جنہیں ردو قبول کر کے وہ پروان چڑھتا ہے۔ اسی طرح کسی ایک نظریہ کے "تھیسس" (Thesis) کے متبائن نیا سامنے آنے والا نظریہ اُس کے "اینٹی تھیسس"(Antithesis) کی حیثیت رکھتا ہے۔ (تھیسس اور اینٹی تھیسس، عمومی و ادبی اصطلاحات اور تکنیکیں ہیں، جو کسی موضوع سے متعلق بحث، گفتگو یا تحقیق کے دوران ایک نقطۂ نظر قائم کرنے اور پھر اُسے رد کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ تھیسس، زیرِ بحث نقطہ کا نظریہ یا تعریف(Definition) ہے۔ جب کہ اینٹی تھیسس، اس کے برعکس، اس نقطۂ نظر کو رد کرنے کے لیے اصطلاح ہے۔ اُردُو میں تھیسس کے لیے؛"دعویٰ" اور اینٹی تھیسس کے لیے؛"ضدِ دعویٰ" کی اصطلاحیں استعمال

کی جاسکتی ہیں۔ البتہ عمومی مروج 'تھیسس' اور 'اینٹی تھیسس' ہی ہے۔ اس کے علاوہ "فرضیہ" اور "ردِ فرضیہ" کی اصطلاحات بھی استعمال ہوتی ہیں، مگر "فرضیہ"، "Hypothesis" کے لیے زیادہ مناسب ہے۔) پس نَو تاریخیت کے ساتھ بھی ایسا ہی ماجرا ہوا کہ یہ مختلف نظریات اور تحریکات کے "اینٹی تھیسس" کے طور پر سامنے آیا۔ لہٰذا ہم یہاں نَو تاریخیت پر مزید بحث سے قبل، اس کے پسِ پشت محرکات اور اس کی لفظی حیثیت کا جائزہ لیتے ہیں اور بعد ازاں نَو تاریخیت پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔ نظریۂ نو تاریخیت کے سامنے آنے میں بھی چند ادبی تحریکوں، نظریات اور مفکرین کا کردار ہے۔ نظریۂ نو تاریخیت (New Historicism) کو ویسے تو پہلی بار باقاعدہ امریکی ادبی مؤرخ، نقاد اور ادیب: "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" (Stephen Jay Greenblatt)، نے اَسی کی دہائی میں پیش کیا۔ مگر اس کے عقب میں چند اہم مفکرین کے نظریات بھی شامل ہیں، جن میں: "مشل فوکو" (Michel Foucault)، "لوئی آلتھیو سے" (Louis Althusser)، "مورس ڈکسٹین" (Morris Dickstein)، "کلیفرڈ گیرٹز" (Clifford Geertz) اور "میخائل میخائیلویچ باختین" (Mikhail Mikhailvoich Bakhtin)، کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ مفکرین "تاریخ، فلسفہ، ادب، پسِ ساختیات، ثقافت اور بشریات" سے تعلق رکھتے ہیں۔ نو تاریخیت کی فکر کی ابتدائی جھلک اِن مفکرین کے افکار میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جنہیں بعد ازاں نَو تاریخیت نے اپنے اندر ضم کر کے اپنے توسط سے پیش کیا۔ اِن مفکرین کے نظریات کے علاوہ چند ادبی میلانات اور تصورات جیسا کہ: "پسِ ساختیات" (Post-Structuralism)، "مابعد نو آبادیات" (Post Colonialism) اور "تانیثیت" (Feminism) وغیرہ، کے اثرات کو بھی قبول کر کے اپنا ارتقائی سفر طے کیا۔ البتہ چند ایسی تحریکات اور چند ایسے نظریات بھی ہیں کہ جن کے مُقابل رویے کے طور پر نو تاریخیت کا ظہور ہوا۔ اِن میں ؛ "جدیدیت اور جدیدیت کی تحریک" (Modernism)، "ہیئت پسندی اور روسی ہیئت پسندی" (Formalism and Russian Formalism) اور "امریکی نئی تنقید" (American New Criticism)، کے نام شامل ہیں۔ اس واسطے نو تاریخیت کو ان کا "ضدِ دعویٰ" (Antithesis) بھی کہا جا سکتا ہے۔

اس ضمن میں "روسی ہیئت پسندی" اور "امریکی نئی تنقید" اس قدر اہمیت کی حامل ہیں کہ چند ناقدین کے نزدیک نظریۂ نو تاریخیت کو پیش کرنے کی وجہ ہی یہی ادبی تحریکیں اور اُن کے نظریات بنے۔ لہٰذا ہم نَو تاریخیت پر مزید بحث سے قبل اِن کا پس منظر جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ "روسی ہیئت پسندی" (Russian Formalism) ایک ادبی دبستان کی شکل میں ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۰ء کے عرصے میں قائم رہا۔ اس نقطۂ نظر کا باقاعدہ آغاز ۱۹۱۵ء میں روس کے شہر "ماسکو" (Moscow) میں قائم ہونے والے "دی ماسکو لینگوسٹک سرکل" (The Moscow Linguistic Circle) سے ہوا، جو کہ ۱۹۲۴ء تک قائم رہا۔ ۱۹۱۶ء میں روس کے ہی شہر: "سینٹ پیٹرز برگ" (Saint Petersburg)، میں بھی "اوپوجاز" (OPOJAZ) کے نام سے ایسی ہی ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا، جس کا پورا نام: "Obscestro Izucenija Poetic eskogo Jazyka; Society for the study of Poetic Language"، تھا۔ اس نے ہیئت پسندی کے نظریات کو فروغ دیا۔ ہیئت پسندی، کی اصطلاح سے متعلق دل چسپ امر یہ ہے کہ اسے سب سے پہلے اسی تحریک کے مخالفین نے استعمال کیا۔ ہیئت پسندوں کے ایک اہم مفکر: "بورس اے کین بام" (Boris Eikhenbaum) کے مطابق یہ بعینہٖ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ سب سے پہلے یہ نام کس نے وضع کیا۔ لیکن اِس کے خیال میں یہ کوئی بہت خوش کن اصطلاح نہ تھی۔ اس تنقیدی مکتبۂ فکر کے مفکرین میں: "وکٹر بوریسووچ شکلووسکی" (Viktor Borisovich Shklosky)، "یوری نکولاویچ ٹینیا نوف" (Yury Nikolaevich Tynyanov)، "ولادی میر یاکو لیوچ پروپ" (Vladmir Yakovlevich Propp)، "بورس اے کین بام" (Boris Eikhenbaum)، "رومن اوسیپووچ جیکب سن" (Roman Osipovich Jakabson)، "بورس وکٹورووچ توماشیوسکی" (Boris Viktorovich Tomashevsky) اور "گریگوری الیگزینڈرووچ گووسکی" (Grigory Alexandrovich Gukavsky)، کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ روسی ہیئت پسندی، عام طور پر ادبی تکنیکوں کے فعال کردار اور ادبی تاریخ کے اصل تصور پر زور دینے کے لیے جانی جاتی ہے۔ یہ فن پارے کو نامیاتی وحدت تصور کرتے ہوئے، اُس کی عملی تنقید پر

زور دیتی ہے۔ عملی تنقید کا طریقِ کار معروضی اور سائنسی انداز کا حامل ہوتا ہے۔ چناں چہ روسی ہیئت پسندوں نے متن کی بجائے اس کی ہیئت پر زور دیا اور ادبی تنقید میں ہیئت کے تجزیاتی مُطالعے پر ہی ارتکاز کیا۔ اُن کے خیال میں کوئی بھی ادبی ناقد جب تجزیے کے دوران ہیئت کا جائزہ لیتا ہے، تو اس سے متن کی تخلیق اور اس کے پس پشت کار فرما عوامل کی تعبیر آسان ہو جاتی ہے۔ اُن کا ماننا تھا کہ ادبی متون اور ادب پارے ثانوی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں، جب کہ ہیئت کو اولین اور اساسی مقام حاصل ہے، جس کے مُطالعے سے تخلیقی عمل کو معرضِ تفہیم میں لایا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ روسی ہیئت پسندی کے مفکرین نے ادب میں زبان کے خاص انداز پر بھی زور دیا۔ وہ عام بول چال اور ترسیلی وظیفے سے ہٹ کر زبان کے استعمال کے حامی تھے اور ادب میں انفرادیت پیدا کرنے کی غرض سے ادب میں عمومی بول چال کی زبان کو استعمال کرنے کے حق میں نہ تھے۔ ہیئت پسند ادبی تنقید کو بھی ایک خاص فن کے حیثیت سے دیکھتے تھے۔ یعنی ان کے مطابق ادبی متون کی تفہیم و تشریح مخصوص، واضح اور معروضی کسوٹی کے پیمانے پر کرنی چاہیئے اور اس میں ناقد کے ذاتی تاثرات، پسند اور ناپسند اور داخلیت وغیرہ کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔ ہیئت پسند ادب اور ادبی فن پاروں کو کسی بھی مصنف کی ذات کا اظہار یا اس کا انسانی زیست و دنیا کے بارے میں نقطۂ نظر کی حیثیت سے نہیں دیکھتے اور نہ ہی وہ ادب کو حقیقی دنیا کی نقالی سمجھتے ہیں۔ بل کہ اُن کے نزدیک یہ مُطالعات آزادانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اِنھیں نظریات کے ساتھ ہیئت پسندی نے فروغ پایا اور جب ۱۹۳۰ء میں مارکسیت (Marxism) کا شُہرہ ہوا تو ہیئت پسندی زوال کی طرف گام زن ہوئی۔ ہیئت پسند، مارکسی ناقدین کو اپنا ادبی حریف اور نظریاتی دشمن سمجھتے تھے۔ اسی تناظر میں جب روسی ہیئت پسندی کے نظریات پر مارکسی ناقدین نے دھاوا بولا اور بے حد تنقیص کرنے لگے تو روسی ناقدین نے روسی حدود سے باہر نکل کر اپنے نظریات کو فروغ دینے سے متعلق سوچا۔ اس ضمن میں روس سے باہر نکلے تو پہلے "چیکو سلواکیہ" (Czechoslovakia) اور پھر "امریکہ" (America) میں "ہیئتی تنقید" کے دبستان کو فروغ دیا۔ جسے بعدازاں "امریکی نئی تنقید، تنقیدِ نو اور نئی تنقید" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یوں "امریکی نئی

تنقید"(American New Criticism) کا نظریہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائیوں میں "امریکی جامعات" (American Universities) سے اُبھرا۔ اس کے ابتدائی نمونے "تھامس سٹیرنز ایلیٹ" (Thomas Stearns Eliot)اور" آئیور آرم سٹر انگ رچرڈز"(Avor Armstrong Richards) کی تنقید میں "جنگ عظیم دوم" سے قبل ملتے ہیں، جب کہ اسے اصل شہرت جنگ عظیم دوم کے بعد ملی۔ نئی تنقید کی اصطلاح باقاعدہ پہلی بار "جان کرورینسم"(John Crowe Ransom) کی کتاب:"The New Criticism" کے عنوان میں برتی گئی اور وہیں سے اِس نے رواج پایا۔ اس کے اہم ناقدین میں: "جان کرورینسم" (John Crowe Ransom)،"جان اورلی ایلن ٹیٹ"(Johan Orley Allen Tate) ،"کلینتھ بروکس" (Cleanth Brooks)، "رابرٹ پین وارن"(Robert Penn Warren)، "ولیم کرٹز ومسٹ جونیئر" (William Kurtz Wimsatt Jr.) اور "منرو کرٹس بیئرڈسلی" (Monroe Curtis Beardsley)کے نام شامل ہیں۔ نئی تنقید متن یا تحریر کو اعتنائی سے پڑھنے پر اصرار کرتی ہے۔ ایسا مطالعہ کرنے کے لیے "کلوز ریڈنگ" (Close Reading) کا طریق کار اپنایا جاتا ہے۔(کلوزریڈنگ، کی اصطلاح سے مراد ہے کہ مُطالعہِ اس طور کیا جائے کہ اس مُطالعہ کے دوران مصنف کے حالات ،اس کے دور اور اپنے تاثرات کو پسِ پشت ڈال کر مُطالعہ کی روش اختیار کی جائے۔ اس عمل میں متن کو ایک الگ تھلگ شے سمجھ کر اس کے عناصر کو انفرادی طور پر دیکھا جاتا ہے۔اس مطالعہ کی مثال " آئیور آرم سٹر انگ رچرڈز"(Ivor Armstrong Richards)کے ہاں ملتی ہے۔وہ اپنے طلباء کو مصنف کے نام اور نظم کے عنوان کے بغیر تخلیقات پڑھنے کے لیے دیتا، اور اُن سے اس کی تنقید کا مطالعہ کرتا تھا۔یوں ایک ہی نظم پر متعدد آرا سامنے آتیں۔وہ ان آرا کا موازنہ کرتا اور متن کی خصوصیات کو "کلوز ریڈنگ" کی مدد سے سامنے لانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔) نئی تنقید، متون کی اندرونی اقدار پر اصرار کرتی ہے اور انفرادی طور پر متن کو ایک آزاد اکائی سمجھ کر اُسی پر ارتکاز کرتی ہے۔اس کا ماننا ہے کہ متن کی ساخت اور معنی اس قدر جڑے ہوتے ہیں کہ اُن کا الگ تجزیہ ممکن نہیں۔یعنی اس کے ناقدین کے مطابق کسی بھی متن کو سمجھنے کے لیے

ضروری ہے کہ وہ سب تحریر کے اندر یعنی متن کے اندر موجود ہوتا ہے۔اس تناظر میں قاری یا ناقد کو متن کو سمجھنے کے لیے کسی بیرونی ذرائع کی طرف نہیں دیکھنا پڑتا۔ تنقیدِ نو، کے نظریات کے تحت تاریخ اور ثقافت کے مطالعے کے حوالے سے بھی اِکہرا اسارویہ سامنے آتا ہے۔ جس تناظر میں یہ متن یا ادب پارے کو ایک جمالیاتی شے کے طور پر دیکھتے ہوئے تاریخی سیاق سے آزاد اور بذات خود مکمل اور مربوط تصور کرتی ہے اور کسی بھی ادب پارے کی تاریخی و سوانحی لحاظ سے تعبیر و تفہیم کی مخالفت کرتی ہے۔اس تناظر میں "اورنگ زیب قاسمی" لکھتے ہیں:

> "ادبی مطالعات میں متن کے تجزیہ کو توجہ کا مرکز بنانے کی غرض سے اس نے قاری کے رد عمل، مصنف کے ما فی الضمیر، تاریخی اور ثقافتی سیاق اور اخلاقی تعصبات کو اپنے تجزیات سے دیس نکالا دے دیا۔ اس کے مطابق کسی متن کو سمجھنے کے لیے جو کچھ بھی ضرویر ہوتا ہے، وہ سب کچھ اس متن کے اندر موجود ہوتا ہے۔ قاری کو متن سمجھنے کے لیے بیرونی ذرائع کی طرف نہیں دیکھنا پڑتا۔ اس نے بعض "ادبی آلات" جیسے استعارہ، طنز/ ہجو، تناؤ، متناقضہ پر توجہ دی۔ اس نے متن کے گہرے مطالعہ اور ہیئت و معنی کے قریبی تعامل کو مرکز نگاہ بنایا۔"(٦٤)

نئ تنقید، نے یہ کام کیا کہ خود کو صرف متن اور متناقضہ، ابہام، استعارہ وغیرہ، کے مطالعے تک محدود کر دیا۔اس سے قبل سوانحی اور تاریخی تنقید کا رواج تھا، مگر نئ تنقید نے اسے صرف متن کے مطالعہ تک محدود کر دیا اور اس تناظر میں مصنف کی زندگی، اس متن کی لکھت کا عصر اور اس کے تاریخی تناظر و سماجی حالات کو مطالعہ سے بے دخل کر دیا۔ جس کی بنا پر یہ مطالعات ہیئتی عناصر کے ارد گرد مرکوز ہوگئے۔ نئ تنقید کا شہرہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان رہا۔ نئ تنقید نے اپنے وسیلے سے متن کی جس قرأت پر توجہ دلائی وہی پہلو اس کے زوال کا سبب بنا۔ اور ۱۹۶۰ء میں اس کا سورج غروب ہونا شروع ہوگیا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں مختلف تنقیدی دبستانوں کے

ناقدین نے ادبی متن پر سماجی اور معاشرتی اثرات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ جو مقصد ظاہر ہے کہ "نئی تنقید" سے حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ "نئی تنقید" متن کو یک معنوی اور الگ تھلگ جمالیاتی شے سمجھ کر اسکے تجزیے پر زور دیتی تھی۔ پس یہ تمام حالات تھے کہ جن کی بنا پر "نَو تاریخیت" جیسے نظریے کا منظر عام پر آنا ضروری تھا۔ اور اسی تمام پس منظر اور ان حالات کے پیش نظر "نو تاریخیت" کو ورود ہوا۔ اسی حوالے سے: "ڈاکٹر گوپی چند نارنگ" "اس وقت کے ادب کے محققین اور ناقدین سے یہ شکوہ بھی کرتے ہیں کہ جب مغرب میں جدیدیت، ہیئت پسندی اور امریکی نئی تنقید، زوال پذیر ہو رہی تھی، تب اُردُو ادب میں کس بنیاد پر اس کا آغاز ہو رہا تھا؟ اس ضمن میں: "ڈاکٹر گوپی چند نارنگ" رقم طراز ہیں:

> "لطف کی بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جب اردو میں امریکی نیو کریٹسزم کی بنیادوں پر جدیدیت کا آغاز ہو رہا تھا، مغرب میں جدیدیت کا زوال ہو رہا تھا اور نیو کریٹسزم کو چیلنج کیا جا رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں جن لوگوں نے جدیدیت کو نظریاتی بنیادوں پر استوار کیا تھا، ان سے سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اردو والوں کو یہ بتانے کی زحمت کیوں گوارا نہیں کی کہ مغرب میں جدیدیت اور نیو کریٹسزم کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں اور خالص فارملزم جس پر اردو میں زور دیا جا رہا تھا، اسکا نظری دفاع تقریباً ناممکن ثابت ہو چکا ہے۔ بہر حال ترقی پسندی کی ضد میں ان حقائق کو یا تو دبا دیا گیا یا نظر انداز کر دیا گیا"۔(۶۵)

اس تمام پس منظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ۱۹۸۰ء کے آس پاس "امریکہ "(America) سے تعلق رکھنے والے "ادیب"(Author) "ادبی مؤرخ"(Literary Historian) اور "شیکسپیئر کے مطالعہ کے ماہر" (A Specialist in Shakespearean Study): "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" (Stephen Jay Green Blatt)، نَو تاریخیت کی جہات کی طرف راغب ہوئے اور انہوں نے اپنی تحاریر و تصانیف میں اس کا پرچار شروع

کر دیا۔ (اسٹیفن جے گرین بلاٹ کی زندگی، شخصیت اور نو تاریخیت کے علاوہ دیگر تحاریر کا مختصر تعارف، مقالہ ہٰذا کے باب دوم میں پیش کیا جائے گا۔ یہاں پر اُنھیں صرف نظریۂ نَو تاریخیت کے ارتقا اور اُس کی مُتعلقہ تحاریر کے حوالے سے زیر مطالعہ لایا جائے گا۔) اِس تناظر میں اُن کی پہلی کتاب: "Renaissance Self-Fashioning: From More to Shakespeare" ہے، جو ۱۹۸۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ یہ کتاب سولھویں صدی عیسوی کی اہم ادبی تحاریر سے متعلق تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس سولھویں صدی عیسوی کے ادب اور زندگی کے مطالعے نے علمی تحقیقات کے ایک نئے دور کو جنم دیا۔ اس میں اسٹیفن گرین بلاٹ، نے سماجی طور پر قابلِ قبول معیارات کے مطابق، اپنی شخصیت اور عوامی شخصیت کی تعمیر کے عمل کو بیان کرنے کے لیے، "سیلف-فیشننگ" (Self-Fashioning) کی اصطلاح استعمال کی۔ اور معاشرے میں ایک قابلِ تعریف ماڈل کی نقل کرنے کی شعوری کوشش کی۔ یہ ہی وہ پہلی تصنیف تھی کہ جس میں نَو تاریخیت کے نظریات کی دھندلی سی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ ۱۹۸۲ء میں "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" نے: "The Power of Forms in English Renaissance" کے عنوان سے کتاب مرتب کی، جو قریباً "تیرہ" (۱۳) ناقدین کے مضامین پر مشتمل تھی۔ یہ کتاب ایک عمدہ مضامین کے انتخاب کے علاوہ "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" کے اپنے رقم کیے پہلے تعارفی مضمون (تعارف نامے): "Introduction" اور آخری مضمون: "King learned Harnett's Devil-Fiction"، کی وجہ سے مزید اہمیت کی حامل ہے۔ یہ بھی نَو تاریخیت کے ابتدائی نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ البتہ اسی سال یعنی ۱۹۸۲ء میں ہی اور اسی ملتے جلتے عنوان سے "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" نے "یونیورسٹی آف اوکلاہوما" (University of Oklahoma) کے معروف جریدے: "GENRE" کے خصوصی جریدے "شمار:۱۵" میں: "The Forms of Power and the Power of forms in the Renaissance" کے عنوان سے مضمون لکھا۔ یہ وہ پہلا مضمون تھا کہ جس میں "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" نے باقاعدہ "نو تاریخیت" کا لفظ پہلی بار استعمال کیا۔ اس میں نو تاریخیت پر بحث کے علاوہ "چار" (۴) نکات میں ادب

اور تاریخ کے تعلق اور حدود کو بیان کیا۔ نو تاریخیت کی ذیل میں ادب و تاریخ کے حوالے سے:" اسٹیفن جے گرین بلاٹ "نے اپنے اس باقاعدہ پہلے مضمون میں یہ چار نکات اس طرح بیان کیئے:

1. Literature has a historical base and literary works are not the products of a single consciousness but many social and cultural forces. In order to understand literature one has to take recourse to both culture and society that gave rise to it in the first place.
2. Literature is not a distinctive human activity hitherto believed, but another vision of history. This has obvious implications for both literary theory and the study of literary texts.
3. Since literature and human beings are both shaped by social and political forces, it is not possible to talk of an intrinsic human nature that can transcend history. And since history is not a continuous series of events but ruptures, there is no link between one age and another or between men belonging to different ages. This being the case, a Renaissance man is rooted in his Renaissance idiosyncrasies just as a modern man is rooted in his. A modern reading of a Renaissance text cannot be the same as a Renaissance reading. At most a literary interpretation can reconstruct the ideology of the age through a given text.
4. Caught in his own historicity, a historian cannot escape the social or ideological constraints of his own formation. And, therefore, he cannot fully understand the past objectively on its own terms. (66)

اسٹیفن جے گرین بلاٹ، کے درج بالا چار نکات کا اُردو ترجمہ:

ا. ادب کی ایک تاریخی بنیاد ہوتی ہے اور ادبی تخلیقات کسی ایک شعور (ایک انسان کے شعور) کے پیداوار نہیں ہوتیں، بل کہ کئی سماجی اور ثقافتی قوتیں (اس پیداوار کی وجہ) ہوتیں۔ ادب کو سمجھنے کے لیے ثقافت اور معاشرت دونوں کا سہارا لینا پڑتا ہے، جس نے اسے پہلی جگہ پر (پہلے) جنم دیا ہو۔

۲. ادب ایک (کوئی) مخصوص انسانی سرگرمی نہیں جیسے ادب تک مانا جاتا ہے، بل کہ تاریخ کا (ہی) ایک اور نقطۂ نظر ہے۔ ادبی تھیوری (نظریہ) اور ادبی متن کے مُطالعہ، دونوں پر اس کے واضح مضمرات ہیں۔

۳. چوں کہ ادب اور نسل انسانی دونوں سماجی اور سیاسی قوتوں سے تشکیل پاتے ہیں، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ انسانی فطرت کے بارے میں بات کی جائے، جو تاریخ سے ماورا ہو۔ اور چوں کہ تاریخ واقعات کا مسلسل سلسلہ نہیں، بل کہ شِگافتہ سلسلہ ہے۔ اس لیے ایک زمانے سے دوسرے یا مختلف زمانوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ اسی بنا پر، ایک نشاۃُالثانیہ کا آدمی اپنے نشاۃُالثانیہ کے انوکھے مزاج سے اسی طرح جڑا ہوا ہے، جس طرح ایک جدید آدمی (اپنی جدت سے) جُڑا ہے۔ نشاۃُالثانیہ کے متن کی جدید پڑھت، نشاۃُالثانیہ (کے دور) جیسی نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ ایک ادبی تفہیم، کسی دیئے گئے متن کے ذریعے، اس زمانے کے نظریے کی تشکیلِ نو کر سکتی ہے۔

۴. اپنی تاریخی مقدرت میں اٹک کر، ایک مؤرخ اپنی تشکیل کی سماجی یا نظریاتی رکاوٹوں سے نہیں بچ سکتا۔ اور اس لیے وہ ماضی کو معروضی طور پر اپنی شرائط پر پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔

بادیُ النظر میں تو درج بالا "چار" (۴) نکات، "چار" (۴) سُطور ہی ہیں۔ مگر اصلاً، نو تاریخیت کی نیو رکھنے میں ان کا انتہائی اہم کردار ہے۔ پس ازاں، تاریخیت نے فکری طور پر اِنہیں سے فروغ پایا۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے "۴ ستمبر ۱۹۸۶ء" میں "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" نے: "دی یونی ورسٹی آف ویسٹرن آسٹریلیا" (The University of Western Australia) میں "Towards a Poetics of Culture" کے عنوان سے ایک "درس" (Lecture) دیا۔ جسے بعد میں آسٹریلیا کی: "دی رائل میلبورن انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، المعروف بہ: آرایم آئی ٹی یونیورسٹی" (The Royal Melbourne Institute of Technology, also known as: RMIT University) کے ریسرچ جرنل: "Southern Review" کے "شمارہ:۲۰، نمبر:۱"، میں "یکم مارچ ۱۹۸۷ء" میں شائع کیا گیا۔ یہ لیکچر جس نے بعد ازاں "تیرہ"

(۱۳) صفحات پر مشتمل مضمون بعنوان: "Towards a Poetics of Culture" ، کی صورت اختیار کر لی، آج تک نَو تاریخیت کی بنیاد مانا جاتا ہے۔ انگریزی و اُردو کے قریباً ہر محقق اور نقاد نے نو تاریخیت کے تناظر میں، اس مضمون کا ذکر کیا ہے۔ مگر سِتم گری یہ ہے کہ اُردو میں ایک بھی ناقد نے اس کا جائزہ پیش نہیں کیا۔ جب یہ مضمون شائع ہوا تو اس کے خالق "یونی ورسٹی آف کیلی فورنیا، برکلے، امریکہ " (University of California, Berkeley, America) ،سے وابستہ تھے۔ مگر اَچرَج اتفاق یہ ہے کہ "امریکہ " سے تعلق رکھنے والے اِس مضمون کے خالق اور نَو تاریخیت کے بنیاد گزار اور "امریکہ " سے ہی پھوٹنے والی "نو تاریخیت "کا سب سے اہم اساسی نوعیت کا لیکچر دیا بھی " آسٹریلیا" میں گیا اور بعد ازاں شائع بھی " آسٹریلیا" سے ہی ہوا۔ اس مضمون کو اشاعت کے ساتھ ہی شہرتِ دوام حاصل ہوئی اور اسے نو تاریخیت کے تناظر میں بارہا زیرِ مُطالعہ لایا جانے لگا۔ بعد میں "ہیرولڈ ارم ویزر"(Harold Aram Veeser) کی مرتبہ کتاب:"The New Historicism" میں شمولیت سے مزید وسیع پیمانے پر قارئین نے اِس کا مُطالعہ کیا۔ یہاں اس مضمون: "Towards a Poetics of Culture" کا انتہائی اختصار کے ساتھ احوال بیان کیا جارہا ہے۔ اور اس کے لیے "ہیرولڈ ارم ویزر" کی کتاب میں دیئے اس مضمون کے متن سے رجوع کیا جائے گا۔ اس مضمون کے عنوان: "Towards a Poetics of Culture" جسے اُردو میں ہم: "ثقافت کی شعریات کی طرف "، کہہ سکتے ہیں، سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ثقافت کی "ساخت، ہیئت اور بیان" وغیرہ، سے متعلق ہے۔ جب ہم مضمون کا سر سری مُطالعہ کرتے ہیں تو ماسوائے پہلے صفحے اور چند ایک سُطور کے، ہمیں "نَو تاریخیت "کا کوئی خاص ذکر نہیں ملتا۔ مگر جب ہم اس کا عَمیق مُطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ یہ تمام قصہ ہی نو تاریخیت کے آغاز، اس کے پس منظر، اس کے عقب میں موجود نظریات، مفکرین کی آرا، تحریکات اور وجوہات سے متعلق ہے۔ علاوہ بریں چوں کہ یہ مضمون اصل میں "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" کے ایک "درس"(Lecture) کی تحریری صورت ہے، اس لیے صاحب مضمون (مُدرِس) نے

اس میں اپنے مُعلمی کے سفر اور مختلف شخصیات و نظریات سے متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اسی تناظر میں وہ اپنی تنقید پر "مشل فوکو" (Michel Foucault) کے اثرات کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

> "Certainly, the presence of Michel Foucault on the Berkley Campus for extended visits during the last five or six years of his life, and more generally the influence in America of European (and especially French) anthropological and social theorists, has helped to shape my own literary critical practice." (67)

اسٹیفن جے گرین بلاٹ، خود اعتراف کرتے ہیں کہ "مشل فوکو" کی زندگی کے آخری "پانچ، چھ "(۵،٦) سالوں کے "یونیورسٹی آف کیلی فورنیا" کے "برکلے کیمپس" کے دوروں اور یورپی بال خصوص "فرانسیسی"، "ماہرین بشریات" اور "سماجی نظریہ نگاروں" کے نظریات نے اُن کی ادبی عملی تنقید پر اثر انداز ہوئے۔ اس سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ نو تاریخیت پر براہ راست "مشل فوکو" کے اثرات ہیں۔ اسٹیفن جے گرین بلاٹ، اپنے اِس مضمون سے متعلق چند مزید انکشاف بھی کرتے ہیں کہ کچھ عرصہ قبل میں مجھے معروف جرنل: "Genre" نے نشاۃُ الثانیہ کے حوالے سے مضامین جمع کرنے کو کہا۔ میں نے کہا، میں کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں میں نے کہا کہ مضامین کا یہ انتخاب، اس کی نمائندگی کرتا ہے کہ جسے میں نو تاریخیت کہتا ہوں (New Historicism) کہتا ہوں اور آسٹریلیا میں اِسے: "Neo Historicism" کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں کہتے ہیں کہ میں نے حامی بھری کہ میں اِس نو تاریخیت کی نظریہ کے طور پر تعریف کر سکوں یا نہیں کم از کم اِسے عملی طور پر پیش کرنے کی کوشش ضرور کروں گا، جسے وہ "Practice" کہتے ہیں۔ مارکسی اخلاقیات (Marxist Aesthetics) کے کورس کو پڑھانے پر نادِم ہونے، وہاں سے "برکلے کیمپس" میں "ثقافتی شعریات" (Cultural Poetics) کو پڑھانے اور اپنے "مینشویک" (Menshevik) ہونے سے متعلق یوں لکھتے ہیں:

“In the 1970s I used to teach courses with names like “Marxist Aesthetics” on the Berkeley campus. This came to an inglorious end when I was giving such a course it must have been the mid-1970s and I remember a student getting very angry with me. Now it’s true that I tended to like those Marxist figures who were troubled in relation to Marxism Walter Benjamin, the early rather than the later Lukacs, and so forth and I remember someone finally got up and screamed out in class “You’re either a Bolshevik or a Menshevik make up your fucking mind,” and then slammed the Dorr. It was a little unsettling, but I thought about it afterwards and realized that I wasn’t sure whether I was a Menshevik, but I certainly wasn’t a Bolshevik. After that I started to teach courses with names like ‘Cultural Poetics’. ” (68)

اس مضمون میں: "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" کی بحث کا زیادہ ارتکاز "مارکس ازم" (Marxism)، "سرمایہ داری" (Capitalism)، "مارکسی جمالیات"، (Marxist Aesthetics)، کے نظریات نیز "فریڈرک جیمسن" (Fredric Jameson) اور "ژاں-فرانسکوئس لیوٹارڈ" (Jean-Francois Lyotard) کے افکار و نظریات کے گرد مرکوز رہا ہے۔ اس مضمون میں صاحبِ مضمون نو تاریخیت کی عجیب بے چیدگی سے متعلق یہ اظہار خیال کرتے ہیں کہ یہ ادبی مطالعات میں شروع سے قطعی طور پر غیر حل شدہ رہا ہے اور کچھ لحاظ سے "بے بنیاد"(Disingenuous) بھی۔

۱۹۸۸ء میں: "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" نے: “Shakespearean Negotiations The Circulation of Social Energy in Renaissance England” کے عنوان سے رقم کی۔ جو کہ

نو تاریخیت کے تناظر میں ایک اور اہم سنگِ میل ثابت ہوئی۔ خاص کر اس کا باب سوم: "Fiction and Fiction" انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔اس کے بعد ۱۹۹۰ء میں: "Learnng to Curse: Essays in Early Modern Culture" اور ۲۰۰۱ء میں "کیتھرین گیلی غر" (Catherine Gallagher) کے اشتراک سے گرین بلاٹ نے: "Practicing New Historicism" کے عنوانات سے کتب لکھیں۔ یہ دونوں کتب بھی نو تاریخیت کے حوالے سے انتہائی اہم ثابت ہوئیں۔ بالا بیان کیے گئے "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" کے مضامین اور کُتب سے نَو تاریخیت نے اپنا ارتقائی سفر طے کیا۔ اس سفر میں "اسٹیفن نے گرین بلاٹ" کے یہ افکار و نظریات "نو تاریخیت کے امریکی دبستان" (American School of New Historicism) کی حیثیت اختیار کر گئے۔ جس میں بعد ازاں: "کیتھرین گیلی غر" (Catherine Gallagher)، "جوناتھن گولڈ برگ" (Jonathan Gold Berg)، "اسٹیفن اور گل" (Stephen Orgel)، "لوئی مانٹروس" (Louis Montross) اور "لیزا جارڈائن" (Lisa Jardine) وغیرہ، جیسے اہم ناقدین بھی شامل ہو گئے۔ اسی کے ساتھ "نو تاریخیت" کا ایک "برطانوی دبستان" (British School) بھی معمولی سے فرق کے ساتھ سامنے آیا۔ جس کا نام "ثقافتی مادیت" (Culture Materialism) رکھا گیا۔ اس دبستان کے بنیاد گزار: "ریمنڈ ہنری ولیمز" (Raymond Henry Williams) تھے اور اس کے اہم رفقا میں "کیتھرین بیلسی" (Catherine Belsey)، "جوناتھن ڈولی مور" (Jonathan Dollimore) اور "ایلن سن فیلڈ" (Alan Sinfield) وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ (نو تاریخیت کے اِن دونوں دبستانوں کا احوال مقالہ ہٰذا کے باب دوم میں پیش کیا جائے گا۔) اس کے علاوہ مغرب میں نو تاریخیت کے حوالے سے جو اہم کتب سامنے آئیں، ان میں: "ہیرولڈ ارم ویزر" (Harold Aram Veeser) کی "The New Historisim" ($1989_{A.D}$) اور "The New Historicism and Reader" ($1994_{A.D}$)، "بروک تھامس" (Brook Thomas) کی "The New Historicism and other Old- Fashioned Topics" ($1991_{A.D}$)، "کلیئر کولبروک" (Claire

Colebrook) کی “New Literary Histories New Historicism and Contemporary Criticism” (1997 A.D)، "ویزلی مورس" (Wesley Morris) کی “Toward a New Historicism” (1972 A.D) "کیرنن ریان" (Kiernan Ryan) کی “New Hitoricism and Cultural Materialism: A Reader” (1996 A.D)،"جان برنیگن"(John Brannigan) کی “New Historicism and Cultural Materialism” (2016 A.D)اور"نیما پروینی" (Neema Parvini) کی “Shakespeare and Contemporary Theory, New Historicism and Cultural Materialism” (2012 A.D)،اہمیت کی حامل ہیں۔

مغرب (West) میں ۱۹۸۰ء میں شروع ہونے والا سلسلہ، ان تمام پڑاؤ سے گزر کر ۱۹۹۳ء میں اردو ادب و تنقید میں آن پہنچا۔ ۱۹۹۳ء میں سب سے پہلے "ڈاکٹر وزیر آغا" نے اپنی معروف کتاب "دستک اس دروازے پر" میں مختصراً ذکر کیا اور اس کے بعد "ریاض صدیقی" نے ۱۹۹۳ء میں ہی، ڈاکٹر وزیر آغا سے متاثر ہو کر ہی باقاعدہ پہلا نظری مباحث کا مضمون بعنوان: "نو تاریخیت" لکھا۔ اُردو ادب و تنقید میں یہ نو تاریخیت کا آغاز تھا۔ اس کے بعد نظری تناظر میں جو مضامین سامنے آئے، اُن کی تعداد آج تلک "چودہ" (۱۴) کے قریب ہے۔ ان میں ریاض صدیقی کا "اُردو تنقید کا مسئلہ اور نو تاریخیت" (۱۹۹۵ء)، پروفیسر عتیق اللہ کا "تاریخیت و نو تاریخیت (۲۰۰۲ء)، ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کا "نئی تاریخیت" (۲۰۰۴ء)، وہاب اشرفی کا "مابعد جدیدیت۔۔۔ تاریخیت، نئی تاریخیت" (۲۰۰۴ء)، گوپی چند نارنگ کا "تاریخیت اور نو تاریخیت: ادبی تھیوری کا ایک اہم مسئلہ" (۲۰۰۵ء)، پروفیسر عتیق اللہ کا "نو تاریخت اور اس کا پیش و پس" (۲۰۰۵ء)، "ڈان ای۔ وین، مترجم: فرحت احساس کا "نئی تاریخیت" (۲۰۰۶ء)، ڈاکٹر الطاف انجم کا "نئی تاریخیت" (۲۰۱۳ء)، قاسم یعقوب کا "تاریخ اور نو تاریخیت" (۲۰۱۷ء)، ڈاکٹر حنا جمشید اور ڈاکٹر شازیہ عنبرین کا "ادب اور ثقافت اور نو تاریخیت: ایک مطالعہ" (۲۰۲۰ء)، سید ازور عباس اور ڈاکٹر مُطاہر شاہ کا "تاریخ، تاریخیت اور نو تاریخیت: بنیادی تعقلات" (۲۰۲۲ء)، ڈاکٹر عبد العزیز

ملک کا "نو تاریخیت " (۲۰۲۲ء) اور اورنگ زیب قاسمی کا "نو تاریخیت " (۲۰۲۲ء)، شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ایم۔فل کی سطح کا مقالہ " سید ازور عباس " نے " پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران " کی نگرانی میں شعبہ اُردو، اوری اینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں ۲۰۱۸ء میں رقم کیا۔ یہ مقالہ نو تاریخیت کا نظری مباحث اور اطلاقی مطالعات دونوں حوالوں سے احاطہ کرتا ہے۔ اسی طرح اُردُو میں نو تاریخیت کے اطلاقی مطالعات کے حوالے سے جو مضامین سامنے آئے ہیں، اِن مضامین کی تعداد " پانچ " (۵) اور مقالہ جات کی تعداد " تین " (۳) ہے۔ ان مضامین میں شمس الرحمٰن فاروقی کا "بڑے گھر کی بیٹی ۔۔۔ چھوٹا کردار " (۲۰۰۷ء)، پروفیسر بیگ احساس کا " گردشِ رنگِ چمن ۔۔۔ نئی تاریخیت کی ایک روشن مثال " (۲۰۰۷ء)، ڈاکٹر قاضی عابد کا "قصص ہند: تاریخیت اور نو تاریخیت " (۲۰۱۵ء)، ڈاکٹر نسیم عباس احمر کا "خس و خاشاک زمانے۔۔۔ نو تاریخی پڑھت " (۲۰۱۸ء) اور ڈاکٹر حنا جمشید کا "عبداللہ حسین کا نو تاریخی شعور: تخصیصی مطالعہ نادار لوگ " (۲۰۲۲ء)، شامل ہیں۔ جب کہ مقالہ جات میں پہلا مقالہ سید ازور عباس کا ہے، جس کا چند سُطور پہلے ذکر کیا جاچکا ہے۔ دوسرا مقالہ: سمعیہ شکور کا "زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت (" تتلیاں ڈھونڈنے والی " اور " رقصِ بسمل ہے " کے حوالے سے) ہے، یہ مقالہ ۲۰۱۹ء میں " شعبۂ اُردُو زبان و ادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد " میں ایم۔فل: اُردو " کی ڈگری کے حصول کے لیے رقم کیا گیا ہے۔ تیسرا مقالہ: " عائشہ واجد " کا " اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت " ہے، یہ مقالہ بھی ۲۰۲۰ء میں " شعبۂ اُردُو زبان و ادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد " میں ایم۔فل: اُردو " کی ڈگری کے حصول کے لیے رقم کیا گیا ہے۔ اِس کے علاوہ ایک مُرتبہ کتاب: "ڈاکٹر نسیم عباس احمر " کے عنوان سے ہے۔ یہ مُرتبہ بھی بالا بیان کیے گئے نظری اور اطلاقی مضامین پر ہی مشتمل ہے۔ یوں آج تلک اُردُو میں نو تاریخیت کا کل سرمایہ یہ چند ایک نظری و اطلاقی مباحث کے مضامین، مقالہ جات اور مُرتبہ کتاب ہے۔

پس نو تاریخیت جسے اس کا پیش کرنے والے اولین مفکر: " اسٹیفن جے گرین بلاٹ "، خود کسی حد تک الجھا ہوا مسئلہ کہتا ہے، بالا بیان تمام پڑاؤ سے گزر کر، اُردُو ادب و تنقید میں وارِد ہوئی۔ نَو تاریخیت، جس کا ظہار ادبی

نظریے کے طور پر ہوا، یہ دراصل ادب اور تاریخ کو ہم رشتہ کرنے پر اصرار کرتی ہے۔ اور اس کا یہ خیال ہے کہ ادب اپنے تخلیق جبر میں تہذیبیات کا تابع ہے۔ اور کوئی بھی ادبی فن پارہ تاریخ و ثقافت سے باہر نہیں ہے۔ یعنی ادب اخلاقی اقدار پر گردش کُناں نہیں ہوتا بل کہ اپنے عصر اور زمان و مکان کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب "نئی تنقید" (New Criticism) اور "جدیدیت" (Modernism) نے ادب میں "پس منظر" (Background) کی اہمیت کو جُھٹلایا اور ادب کو اس کے "پیش منظر" (Foreground) میں رچا بسا کہا، تو نو تاریخیت نے اس سے اختلاف کیا اور اساسی اہمیت تاریخی تناظر کو دی۔ نو تاریخیت، ویسے تو کسی خاص بندھے ٹکے رویے کا نام نہیں، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اس کا کوئی ہیئتِ موحَدَہ نہیں۔ بل کہ یہ اپنی فکری جہات کے اندر ادب، تاریخ اور ثقافت کے اَدَق اور عَمیق رشتوں کو سمجھنے سمجھانے کے اُن طرائق کے مجموعے کا نام ہے کہ جن میں یہ پہلو تسلیم شدہ ہے کہ ادب، تاریخ اور ثقافت میں اور تاریخ، ثقافت و ادب میں سانس لیتے ہیں۔ پس اِس تناظر میں اس کی کچھ فکری جہات سامنے آتی ہیں۔

نظریۂ نو تاریخیت، ہمیں یہ بتاتا ہے کہ "ادب" اور "ادبی متون" خود مختار حیثیت کے حامل نہیں ہیں۔ یعنی نَو تاریخیت ادب کے خود مختار ہونے کے نظریے کو رد کرتی ہے، جس کے مُطابق ادبی متون آزدانہ طور پر پیدا نہیں ہوتے، بل کہ یہ اپنے عصر، تاریخ اور ثقافت کی پیداوار ہیں۔ اس لیے ان کا مُطالعہ بھی تاریخی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی تناظر میں کیا جانا چاہیے۔ اور یہ مُطالعہ نہ صرف ظاہری حقائق پر مبنی ہو بل کہ پسِ پشت موجود عوامل کو بھی پیشِ نظر رکھ کر مُطالعہ کیا جانا چاہیے۔ عام طور پر نو تاریخیت سے قبل، تاریخ کو ماضی کے واقعات کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن نو تاریخیت ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتی ہے کہ تاریخ ماضی کے واقعات کا خالص مجموعہ نہیں ہے۔ ماضی کبھی بھی خالص صورت میں بعد میں نہیں مل سکتا وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بدلی صورت میں ہمیں ملے گا اور کسی نہ کسی متن کے توسط سے۔ اس لیے نو تاریخیت کے مفکرین یہ مانتے ہیں کہ تاریخ "متون" (Texts) کے مجموعے کا نام ہے۔ اس بنا پر نو تاریخی مُطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس پہلو کو بھی مد نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

تاریخ،کاجب بھی ذکر کیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ تاریخ بیان کی جا رہی ہے یا تاریخ بیان کی گئی ہے یا تاریخ بیان ہو گی۔ جب کہ نَو تاریخیت کو رُو سے تاریخ از خود ہوتی ہی بیان ہے۔ اور ماضی ہمیں متون کے توسط سے ملتا ہی بیان کی صورت میں ہے۔ اس لیے الگ سے یہ کہنا کہ ماضی بیان کیا جا رہا ہے، یہ درست نہیں ہے۔ ساتھ ہی نو تاریخیت، تاریخی متون کو مکمل نہیں سمجھتی بل کہ وہ اِنہیں حصوں میں بٹا ہوا سمجھتی ہے۔ کہ کوئی بھی تاریخی متن کسی تاریخ کی کامل عکاسی نہیں کرتا۔ اسی بنا پر نو تاریخیت تاریخی ادوار کو واحدانی حقائق نہیں مانتے بل کہ نو تاریخیت کی رُو سے وہ غیر مربوط اور تضادات پر مشمول ہوتے ہیں۔ نو تاریخیت یہ اصرار بھی کرتی ہے کہ کسی بھی متن کا اور بال خصوص ماضی کے متن کا مُطالعہ سوفی صد معروضی نہیں ہو سکتا۔ بل کہ اس میں کسی نہ کسی حد تک نقاد کی رائے شامل ہو جاتی ہے۔ اس لیے نو تاریخیت کے مطابق یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ کسی بھی متن کے معروضی مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ اور نَو تاریخیت تاریخ کے معروضی مُطالعہ کو "متھ" (Myth) قرار دیتی ہے۔ نو تاریخیت کا ایک اور عمل ادب، تاریخ اور ثقافت کے رشتوں میں طاقت کے اُس کھیل پر نظر رکھنا اور اُسے نمایاں کرنا بھی ہے جو موضوعیت کو قائم کرتا ہے اور رائج ثقافتی رویوں کو معنی دیتا اور اُنہیں قابلِ قبول بناتا ہے۔ علاوہ بریں ،نو تاریخیت "نقاد" کے مقام کو بھی اس طرح بڑھا دیتی ہے کہ اِس کے نقاد کا مقام "مؤرخ" کے برابر ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ تاریخ نگاروں کی بیان کردہ تاریخ کو چھان بین کر کے اور دیگر متون سے تقابل کر کے، اُن کی حقیقی شکل دکھانے کی ذمہ داری نقاد پر ہی ہوتی ہے۔ اس لیے نو تاریخی نقاد بھی کسی مؤرخ سے کم نہیں ہے۔ اِن بالا سطور میں نَو تاریخیت کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ تا کہ اُسے مد نظر رکھتے ہوئے، آئندہ آنے والے ابواب میں نو تاریخیت کے بنیاد گزاروں، نظری جہات، اُردُو ادب میں نو تاریخیت کے نظری مَباحث اور اطلاقی مُطالعات کی، مزید بہتر تفہیم کی جا سکے، جس سے نو تاریخیت کا نظریہ اور اُس کے اَفکار مزید بہتر اور توضیحی صورت میں ہمارے سامنے آ سکیں۔

حوالہ جات

۱. احمد دہلوی، سید، مولوی، فرہنگ آصفیہ (جلد اول)، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص:۸۳۵

۲. عبداللہ خان خویشگی، محمد، فرہنگ عامرہ، ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص:۱۳۶

۳. نورالحسن نیّر، مولوی، کاکوروی، نوراللغات (جلد دوم)، جنرل پبلی شنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص:۲۱۲۔۲۱۳

۴. ہسٹری، ایٹامالوجی، نیوورلڈ انسائیکلوپیڈیا، https://www.newworldencycolopediaorg/engtry/ History, ۱۰ فروری ۲۰۲۲ء، 10:24pm

5. The Oxford American Dictionary of Current English, Oxford university press, New York, 1999 A.D., P: 371

۶. ہسٹری، کیمبرج ڈکشنری، https://dictionary.cambridge.org/dictionary/english/history، ۲۰ فروری، ۲۰۲۲ء، 11:00 pm

۷. ہسٹری، میریم وبسٹر ڈکشنری، https://www.merriam-webster.com/dictionary/history ۲۵ فروری ۲۰۲۲ء، 01:00pm

۸. مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور فلسفہ تاریخ، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص:۵۷

۹. مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور فلسفہ تاریخ، ص:۹

۱۰. عبدالحئ خواجہ (مشفق خواجہ)، (مترجم) تاریخ فرشتہ، از: محمد قاسم فرشتہ، المیزان، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص:۱۵

۱۱. ہسٹری، جوہن جیکب انڈریسن https://www.thoughtco.com/what-is-history-Collection-of-defination-171282، ۰۵ مارچ ۲۰۲۲ء، 08:00am

12. R.G.Collingwood, The Idea of History, Oxford University Press, London, 1956 A.D, P: 09

۱۳. مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور فلسفہ تاریخ، ص:۹

14. Robin Waterfield, (Translator) The Histories, by Herodotus, Oxford University Press, New York, 2008, P: XXVII.

۱۵. یاسر جواد، (مترجم)، دنیا کی قدیم ترین تاریخ، از: ہیروڈوٹس، نگارشات پبلی شرز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص:۳۱

16. Zdenek, Vasicek, (Article) Added: A Companion to the Philosphy of History and Historiography, Comiled By: Aviezer Tucker, Blackwell Publishing, Chichester, 2009 $_{A.D}$, P: 26

17. R. G. Collingwood, The Idea of History, P: 01

۱۸. جی ڈبلیو ایف ہیگل، فلسفہ تاریخ، مترجمہ: اقبال آفاقی، ڈاکٹر، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ص:۱۰

19. Georg Withelm Friedrich Hegel, The Philosophy of History, Translator, Kitchener, 2001 $^{A.D}$, P: 21, 22

۲۰. مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور فلسفہ تاریخ، ص:۷۶

21. E.H.Carr, What is History?, Penguin Books, London, 2018, $_{A. D}$˙, P:27

۲۲. فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، شاہدہ تسنیم صدیقی، نسیم بیگ، مرزا، اُردو لغت (تاریخی اصول پر) (جلد یازدہم)، اُردو لغت بورڈ (ترقی اُردو بورڈ)، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص:۴۱۵

23. Aviezer Tucker, A Companion to the philosophy of FHistory and Historiography, P: 98

24. Ibid., P: 105, 106

25. E.H. Carr, What is History?, P: 83

۲۶. کولی گیشن، ووکیبلری ڈاٹ کام، https:// www.vocabulary.com/dictionary/colligation#:،text=definitions%20or%20become%20continuos.۱۵مارچ۲۰۲۲ء،07:00 pm

۲۷. مقبول بیگ بدخشانی، مرزا، اُردو لغت، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص:۲۵

28. Harry Ritter, Dicionary of Concepts in History, Greenwood Press, New York, 1986 $^{A.D}$, P: 50

29. C. Behan Mcculagh, Colligation, (Article) Added: A companion to the Philosophy of FHistory and Historiography, Compiled by: Aviezar Tucker, P: 155

۳۰. یونس حسنی، ڈاکٹر، نسیم بیگ، مرزا، حسین مجتبیٰ زیدی، شمیم اختر، شاہد الدین درانی، اُردو لغت (تاریخی اصول پر)، (جلد ہژدہم)، اُردو لغت بورڈ، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص:۳۱۵

31. Maurice Mandelbaum, The Anatomy of Hisotical Knowledge, The Johns Hopkins University Press, Baltimore and London, 1977 A.D, P: 146

32. Helge Kragh, An introduction to the Historicography of Science, Cambridge University Press, Cambridge, 1987 A.D, P: 52

33. Bertrand Russell, The Analysis fo Mind, G. Allen and Unwin, London, 1921 A.D, P: 159

۳۴. بیانیہ، اُردو لغت (تاریخی اصول پر)، https://ubd.gov.pk/result_details.php?word=48214

۲۴ مارچ ۲۰۲۲ء، 09:00am

35. F.R. Ankersmit, Narrative and Interpretation, (Article) Added: A companion to the Philosophy of Hisotry and Historiography, Compiled by: Aviezer Tucker, P: 199.

36. Ibid., P: 202

37. David Carr, Time, Narrative, and History, Indiana University Press, Bloomington, 1986 A.D., P: 61

38. Hayden White, Tropics of Discourse: Essays in Cultural Criticsim, The Johns Hopkins University Press, Baltimore, 1978 A.D, P: 82

۳۹. ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں)، انجمن ترقی اُردو، پاکستان، کراچی، ۲۰۲۱ء، ص:۲۴۵

۴۰. ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، عابدہ ریاست رضوی، فرحت فاطمہ رضوی، اردو لُغت (تاریخی اصول پر) (جلد ششم)، اُردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ)، کراچی، ۱۹۴۸ء، ص:۳۲۰

۴۱. محمد نعیم ورک، اُردو ناول کا ثقافتی مطالعہ (۱۸۶۹ء تا ۱۹۴۷ء)، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص:۴، ۵

۴۲. شیما مجید (مرتب)، مقالاتِ رحمان، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۴۰۵

۴۳. محمد نعیم ورک، اُردو ناول کا ثقافتی مطالعہ (۱۸۲۹ء تا ۱۹۴۷ء)، ص:۳

۴۴. وزیر آغا، کلچر کے خدوخال، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص:۹

45. David Matsumoto, Linda Juang, Culture and Psychology, Wadsworth, Cengage Learning, Belmont, 2013, P: 15

46. Simon Susen, Bryan S. Turner, The Legacy of Pierre Bourdieu: Critical Essays, Anthem Press, London, 2011, P: 20.

۴۷. اسلم انصاری، قومی تشخص اور ثقافت، (مضمون) مشمولہ: قومی تشخص اور ثقافت، مرتبہ خالد سعید بٹ، ڈاکٹر، جنید اقبال، گلزار آفاقی، محمد داؤد، ادارہ ثقافت پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۳ء، ص:۷۷

۴۸. محمد نعیم ورک، اُردو ناول کا ثقافتی مطالعہ (۱۸۶۹ء تا ۱۹۴۷ء)، ص:۱۳

49. Michele Barret, Philip Richard D. Corrigan, Annette Kuhn, Ideology and Cultural Production, Groom Helm, London, 1979, P: 11

50. Mubarak Ali, Dr. In Search of History, Dast Publications, Islamabad, 2009 A.D, P: 13

۵۱. ہسٹوریسزم کے لغوی معنی، http://www.merriam-webster.com/dictionary/historicism/، ۱۲ جولائی ۲۰۲۲ء، 02:36 am

۵۲. ہسٹوریسزم کے لغوی معنی، https://www.collinsllinsdictionary.com/dictinary/english/historicism، ۱۲ جولائی ۲۰۲۲ء، 02:59 am

۵۳. ہسٹوریسزم کے لغوی معنی، http://www.oxfordlearnersdictionaries.com/definition/English/historicism?q=historicism، ۱۲ جولائی ۲۰۲۲ء، 03:24 am

۵۴. ہسٹوریسزم لفظ کا مطلب، https://en.m.wikipedia.org/wiki/historicism، ۱۳جولائی ۲۰۲۳ء، 01:00 am

۵۵. ہسٹوریسزم لفظ کا اشتقاق، https://www.etymonline.com/word/historicism.text= Historicism%20(n.),%2C%20philosophy%2C%20,architecture% 2C%20etc.، ۱۳جولائی ۲۰۲۳ء، 03:00 am

۵۶. وزیر آغا، ڈاکٹر، دستک اس دروازے پر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی: ۱۹۹۳ء، ص: ۱۵۷

۵۷. ہیگل کی تاریخیت، https://en.m.wikipedia.org/wiki/hisotricism، ۱۷ جولائی ۲۰۲۲ء، 02:00 pm

۵۸. فرانزیوری بوئس کی تاریخیت سے متعلق خدمات، https:/anthropology.va.edu/theory/ Historicism:text=historicism%20(n.),%2C%2C20philosophy%2C% 20architecture%2C%20etc، ۱۷جولائی ۲۰۲۲ء، 08:00 pm

۵۹. جدید تاریخیت، https://www.newworld.encyclopedia.org/entry/historicism، ۱۸جولائی ۲۰۲۲ء، 01:00 pm

۶۰. عیسائیوں یا بائبل کی تاریخیت، https://handwiki.org/wiki/religion:historicism (Christianity)، ۱۸جولائی ۲۰۲۲ء، 05:00pm

61. Karl Raimund Popper, The Poverty of Historicism, Harper Torch Books, The Academy Library Harper & Row, Publishers, New York and Evarston, 1961$_{A.D}$, P: 50
62. Karl Raimund Popper, The Poverty of Historicism, P: 159, 160
63. Paul Hamilton, Historicism, Routledge, London, 2005$_{A.D}$, P: 02

۶۴. اورنگ زیب قاسمی، ادبی تھیوری: بنیادی تصورات اور مباحث، ورلڈ ویو پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص: ۶۱

۶۵. گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، جدیدیت کے بعد، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص: ۱۲۱، ۱۲۲

66. Stephen Jay Green Blatt, The Forms of Power and the Power of Forms in the Renaissance, (Article) Added: Genre, Issue 15, 1982 A.D, University of Oklahoma, Norman, P: 3, 6
67. Stephen Green Blatt, Towards a Poetics of Culture, (Article) Added: The New Historicism, Edited: Harold Aram Veeser, Routledge, New York, 2013 A.D, P: 01
68. Stephen Green Blatt, Towards a Poetics of Culture, (Article) Added: The New Historicism, Edited: Harold Aram Veeser, Routldge, New York, 2013 A.D, P: 02

باب دوم:

نظریۂ نَو تاریخیت: بنیاد گزار، دبستانِ خیال اور اساسی نظری جہات

الف۔ نو تاریخیت کے پیش رو

کوئی بھی ادبی یا عمومی نظریہ، کسی ایک وقت میں ، کسی ایک مفکر کی وساطت سے ،اچانک سے اُبھر کر سامنے نہیں آتا۔ بل کہ اس کے پسِ پشت کئی مفکرین کے نظریات کارفرما ہوتے ہیں۔اسی طرح "نظریۂ نوتاریخیت" (Theory of New Historicism)، بھی دیگر مُتعدد ادبی وفکری نظریات ، اور تصورات کی طرح اچانک سے ظاہر نہیں ہوا بل کہ اِس کے پسِ پشت بھی مختلف اکابر اور دانش وروں کے افکار ہیں۔ جِن کی فکر کے توسل اور اُن کے اثرات قبول کر کے یہ آج اِس صورت میں ہمارے سامنے ہے۔اِس ضمن میں مُتعدد نام سامنے آتے ہیں، جن میں :"مشل فوکو" (Michel Foucault)، "لوئی آلتھیوسے"(Louis Althusser) ، "مورس ڈکسٹین"(Morris Dickstein)،"کلیفرڈ گیرٹز" (Clifford Geertz)،اور"میخائل میخائیلو یچ باختین"(Mikhail Michailovich Bakhtain) کے نام،اہمیت کے حامل ہیں۔ذیل میں،اِن میں سے نَو تاریخیت کے تناظر میں انتہائی اہم تین مفکرین:"مشل فوکو"(Michel Foucault)،"لوئی آلتھیوسے"(Louis Althusser) ، "مورس ڈکسٹین" (Morris Dickstien)کا احوال اور نَو تاریخیت کے حوالے سے اِن کے نظریات کو پیش کیا جارہاہے۔

i. مشل فوکو(Michel Foucault) :

مشل فوکو(Michel Foucault) ،بیسویں صدی کا ایک عظیم فرانسیسی دانش ور(Thinker) ، فلسفی(Philosopher)،تاریخ دان(Historiographer)، ماہرِ نفسیات(Psychologist)،ماہر عمرانیات(Sociologist) اور ماہرِ لسانیات(Linguist) تھا۔ یہ فرانس کے ایک شہر: "پوائٹرز"

(Poitiers) میں ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوا۔ اس کا تعلق امیر اور صاحب ثروت گھرانے سے تھا۔ اس نے ابتدائی تعلیم مدرسے سے حاصل کی۔ اس زمانے میں یہ چرچ کا "الٹر بوائے" (Alter Boy) بھی رہا، لیکن مذہب سے زیادہ لگاؤ نہ ہونے کی وجہ سے تعلیمی درس گاہ تبدیل کر کے: "Lice Ca School" میں تعلیم کا آغاز کیا۔ ۱۹۱۴ء میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد تاریخی مضامین میں اس کی دل چسپی اس حد تک بڑھ گئی کہ ہر وقت مطالعہ کرنا اس کا شعار ٹھہرا۔ ۱۹۵۱ء میں پیرس کے ایک کالج میں نفسیات کے استاد کے فرائض انجام دینے لگا۔ مشل فوکو، کا ذہن تبدیل کرنے میں "نطشے" کی ایک کتاب "Untimely Meditations" کا بہت ہاتھ ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اِس نے زندگی کی راہ اختیار کرنے میں فوکو کی راہنمائی کی۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۲ء تک فوکو سویڈن میں ثقافتی سفیر کی حیثیت سے مقیم رہا۔ جہاں تک فوکو کی شخصیت کا تعلق ہے تو وہ ایک عیاش انسان تھا۔ بادہ نوشی اور مے نوشی اُس کی زندگی کا شعار تھا۔ فوکو ایک ذہنی مریض بھی تھا۔ اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی۔ مشل فوکو کے حوالے سے "گیری گٹنگ" (Gary Gutting) لکھتے ہیں:

> “Foucault was a brilliant but emotionally troubled son of an Authoritarian physician. A tormented homosexual, he may have attempted suicide while at the École Normale and was certainly under psychiatric care. He so hated French society that he fled to a series of marginal posts in foreign countries, where, however, he failed to find the liberation he sought. Despite spectacular intellectual success, he spent his life seeking extreme sensations (‘limit-experiences’, as he called them) from drugs and Sadomasochistic sex, and died before he was 60 from AIDS, Probably contracted at San Francisco bathhouses”. (1)

فوکو کا" پی ایچ ڈی" (Ph.D)کے مقالے کا عنوان "Madness and Civilization:A History of Insanity in the Age of Reason" ہے، جس میں فوکو اس حقیقت کو بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ کس طرح ایک دور کے زمانے کی "Abnormality" دوسرے زمانے کی "Normality" بن جاتی ہے۔ اِس کے بعد فوکو کی دوسری کتاب ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی جس کا عنوان "TheBirth of the Clinic : On Archaeology of Medical Perception"، تھا۔ جس میں فوکو نے بتایا کہ "Abnormality" کا علاج کس قدر نقصان دہ ہوتا ہے ان لوگوں کے لیے جو دوسرے لوگوں کی بنائی ہوئی سیما کو پھلانگ کر آگے نکلنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں فوکو "College de France" میں صدر شعبہ کے عہدے پر فائز ہوا۔اس دوران میں اس نے ایک اور کتاب "Discipline and Punish" مرتب کی۔ جس میں بڑی گہرائی سے قرون وسطی اور نشاۃُ الثانیہ کے دور کی سزاؤں کا موازنہ کیا گیا ہے۔ چند سالوں کے وقفے کے بعد ۱۹۷۶ء میں فوکو نے "The History of Sexuality" لکھی، جو کہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اِن تصنیفات کے بعد فوکو کو بہت شہرت ملی۔ اس کے اس خیال کو پذیرائی ملی کہ **"سچائی عالم گیر نہیں ہے۔"** ۱۹۸۶ء میں فوکو "ایڈز"(AIDS) کی بیماری کو شکست دینے میں ناکام رہا اور موت اس کا مقدر ٹھہری۔ مشل فوکو کی، اہم تصنیفات ہیں:

1. Madness and Civilizatin: A History of Insanity in the Age of Reason, 1961 A.D.
2. TheBirth of the Clinic: An Archaeology of Medical Perception, 1963 A.D.
3. The Order of Things: An Archaeology of the Human Sciences, 1966A.D.
4. Discipline and Punish: The Birth of the Prison, 1975 A.D.

مشل فوکو، نے انسانی فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے انسانی فکر کو ثقافتی تشکیل قرار دیا ہے۔ جسے نہ فرد نے نہ فطرت نے بل کہ اجتماعیت نے مخصوص سماجی طریقوں سے جنم دیا ہے۔ اس نے ابتدا میں " آرکیالوجیکل " اور بعد ازاں "جینیالوجیکل" طریقِ مطالعہ سے کام لیا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ نتائج وہی اخذ کیے جو ساختیاتی طریقِ مُطالعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ فوکو نے اپنی کتابوں میں مغربی تصورات کی تاریخ پیش نہیں کی بل کہ اُن کا " تاریخی تجزیہ " کیا ہے۔ فوکو کے " نظامِ خیال " میں اس کے " اے پس ٹیم "(Episteme) اور " ڈسکورس " (Discource) کے نظریات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ہر چند دونوں باہم مربوط ہیں مگر تفہیم میں آسانی کی خاطر دونوں کو الگ الگ معرض بحث میں لایا جائے گا۔ اے پس ٹیم ،یونانی لفظ ہے جس کے معنی "علم" کے ہیں۔ " علمیات " (Epistemology) کا لفظ اِسی سے مشتق ہے۔ فوکو مغربی فکر اور ثقافت کی تاریخ میں رونما ہونے والے مدوجزر کی نوعیت کو جاننا چاہتا ہے اور تعبیر کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے "ضابطہ علم " کے تصور کو بطور کلید استعمال کرتا ہے۔ "ضابطہ علم " اُس کے نزدیک کچھ یوں ہے:

> “Set of rules which are not consciously grasped that shape what can be thought and said.”(2)

یعنی "ضابطہ علم "(Episteme) اُن اصولوں کا مجموعہ ہے جو ایک خاص زمانے میں تمام فکری، علمی، سائنسی اور لسانی سرگرمیوں کے پس پردہ بطور ایک "کلی" کارفرما ہوتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ لوگ اے پس ٹیم کی موجودگی اور کارفرمائی سے لاعلم مگر پوری طرح اس کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسے نادیدہ افق کی ترجمان ہے جس میں ایک عہد کے تمام ثقافتی اور فکری افعال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ فوکو کے تصور "ضابطہ علم " (Epistemology) کا اصل پیش رو" ہیگل "(Hegel) کا ”Zeitgeist“ کا نظریہ ہے۔ "ہیگل "(Hegel) نے تاریخی ادوار کو ”Zeitgeist“ اور فوکو نے اے پیس ٹیم میں تقسیم کیا۔ دونوں مفکرین اس بات کے قائل ہیں کہ ایک تاریخی ادوار کا خاتمہ دوسرے کا آغاز کسی فلسفے یا نظریے سے نہیں بل کہ "سماجی طاقت " کے

ہاتھوں ہوتا ہے۔ فوکو نے اپنی کتاب "The Order of Things: An Archaeology of the Human Sciences" میں اے پس ٹیم کی تاریخ پیش کی ہے جس میں گزشتہ پانچ صدیوں کی چار بڑی اے پس ٹیم کی نشان دہی کی گئی ہے۔ نشاۃ ثانیہ کی "اے پس ٹیم" کا سب سے بڑا امتیاز "وحدت" ہے۔ انسان اور حیوان میں کوئی تفریق موجود نہیں ہے۔ سترہویں صدی کے آغاز میں کلاسیکی دور شروع ہوا جس کے تحت ایک سادہ ثنویت جنم لیتی ہے چناں چہ اس عہد کا سارا علم انسانی حسِ بصارت پر منحصر ہے۔ اٹھارویں صدی کے اختتام پر ایک نئی 'اے پیس ٹیم' ابھری۔ اس اے پیس ٹیم کا نمایاں وصف یہ ہے کہ اس کے زیر اثر آدمی خود کو زبان، معاشی نظام اور حیاتیاتی قوتوں کے قابو میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ جدید 'اے پیس ٹیم' کی بدولت انسان اپنا ایک نیا اور بنیادی تصور قائم کرتا ہے۔ اس تصور کی اہمیت، اپنے انفرادی تجربے میں زندہ ہے۔ فوکو کی "آرکیالوجی" (Archaeology) اگر تجربہ ہے تو جینیاتی کا رخ مادیت اور تاریخ کی طرف ہے جینیالوجی کے تحت وہ اس امر کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ایک 'اے پیس ٹیم' میں جتنے "ڈسکورس" ہوتے ہیں اُن میں طاقت کارفرما ہوتی ہے۔ فوکو کی فکر میں "ڈسکورس" (Discourse) اور "طاقت" (Power) دو اہم اصطلاحیں ہیں۔ لسانیات میں ڈسکورس سے مراد وہ تجربہ ہے جو جملوں کے ربط اور ان میں روابط کے مُطالعہ سے عبارت ہے۔ فوکو، کے خیال میں اجتماعی اور ثقافتی زندگی میں ہر شے "ڈسکورس" ہے۔ اپنی کتاب "آرکیالوجی آف نالج" (Archaeology of knowledge) میں ڈسکورس (Discourse) کے بارے میں لکھتا ہے:

> "Discourse appears as an arsenals ..... Finite, limited, desirable Useful... That has its own rules of appearance, but also its own Conditions of appropriateness and operation."(3)

گویا"ڈسکورس" کے وجود میں آنے اور کارفرما ہونے کے اپنے قوانین ہیں جو"ڈسکورس" کی تشکیل کے عمل میں نمودار اور اس پر لاگو ہوتے ہیں۔ ڈسکورس بعض پابندیوں کے تحت خود کو منکشف کرتا ہے۔ فوکو ان پابندیوں کو ایسے قوانین سے موسوم کرتا ہے جو ڈسکورس کے اندر مخفی رہ کر کام انجام دیتے ہیں۔ جو یہ طے کرتے ہیں کہ کیا کہا جاسکتا ہے اور کیا نہیں، کیا درست ہے کیا غلط، مفید اور غیر ضروری اشیا کی تفریق بھی "ڈس کورس" کا خاصہ ہے۔

فوکو، کے نزدیک جسم کا حیاتیاتی تصور بھی ڈسکورس کا پیدا کردہ ہے۔ یہ تصور جسم کی افزائش کی جبلت سے منسلک ہے۔ اس جبلت کی تسکین " جنسی نشاط " سے ہوتی ہے جو دراصل ایک بڑے مقصد اور بقائے نسل کی تکمیل کا نظام ہے۔ پس جدید مفکرین کی جو فکر انسانی انا(Ego)اور موضوع(Subject) کو بے دخل کرتی ہے وہ فوکو تک آتے آتے جسم کو بھی بے دخل کر دیتی ہے اور اسے ثقافتی ڈسکورس کے تابع قرار دے ڈالتی ہے۔ فوکو پس جدید فکر کا بہ نظرِ غائر تجزیہ اس لیے نہیں کرتا کہ اس کے نزدیک یہ ابھی پوری طرح روشن نہیں ہوئی۔ اس کے خیال میں ہم ایک عہد کے اختتام اور دوسرے کے آغاز کے درمیانی خلا میں ہیں۔ تاہم مابعد جدید صورت حال اور فوکو کے تاریخی افکار سے تقویت پا کر نَو تاریخیت نے بھی تاریخ کو بے ترتیب، مبہم اور علامتی متن قرار دے دیا ہے۔ نو تاریخیت کسی صورت یہ بے ترتیب متن ترتیب دینے اور تاریخی خلا کو پر کرنے کی دعویٰ دار نہیں ہے کیوں کہ یہی خلا اسے تاریخ کے متعدد اور کثیر الجہات رویوں کو کھوجنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ " مشل فوکو "(Michel Foucault) کو نو تاریخیت کے پیش رو کی حیثیت حاصل ہے۔ مگر جہاں فوکو کے نظریات تاریخیت کو بنیاد فراہم کرتے ہیں وہیں اس کے تصورات میں خامیاں بھی موجود ہیں۔ پہلی خامی یہ ہے کہ فوکو مابعد جدیدیت کی طرح لامرکزیت کا قائل تو ہے جب کہ یہ دونوں رویے ثقافت کو مرکز بناتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ثقافت کا کوئی مرکز نہیں ؟ فوکو نے تاریخی دھارے کا ایک عہد دوسرے عہد میں منقلب ہونے کو بھی کسی منطقی تناظر میں پیش نہیں کیا۔ صرف

اتنا ذکر کیا ہے کہ ایک عہد کی اے پس ٹیم کو اچانک دوسری نو اے پس ٹیم رد کر کے ایک نیا عہد تشکیل دیتی ہے۔ اِن خامیوں کے باوجود نو تاریخی تصورات کو بنیاد فراہم کرنے میں فوکو کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ وہ مختلف متون کے پس منظر میں موجود تاریخی، تہذیبی و ثقافتی اثرات کی تفہیم پر زور دیتا ہے جو مختلف تاریخی واقعات کے اسناد اور حقائق کی جانب راہ نمائی کرتے ہیں۔

ii. لوئی آلتھیوسے(Louis Althusser):

لوئی آلتھیوسے(Louis Althusser)،ایک مارکسی فلاسفر(Marcxist Philosopher) تھا۔ جس کی پیدائش ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو "الجزائر"(Algeria) میں ہوئی۔اس نے ابتدائی تعلیم "پیرس"(Paris) سے حاصل کی۔لوئی آلتھیوسے(Louis Althusser) کا بچپن "جنگ عظیم اول" (First World War)، "جنگ عظیم دوم"(Second World War) کی تباہ کاریوں کے اثرات و ثمرات پر محیط تھا۔ ۱۹۳۰ء میں والد کی کی ملازمت کے سبب ان کا خاندان "مارسیل"(Mersellie) ہجرت کر گیا۔جہاں کی فضا لوئی آلتھیوسے کے لیے انتہائی مثبت ثابت ہوئی اور علمی و ادبی میدان میں کمال ثانی کا باعث بنی۔ ۱۹۳۷ء میں "لائس" (Lycee) کے قیام کے دوران "لوئی آلتھیوسے" (Louis Althusser) نے "کیتھولک" (Catholic) "نوجوانوں کے گروہ "Jeunesse Etudiante Chretienne" میں شمولیت اختیار کی۔ یہ ایک مذہبی تنظیم تھی جس میں آلتھیوسے کی دل چسپی ۱۹۴۵ء میں کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت کے بعد بھی جاری رہی۔ ۱۹۳۹ ءمیں آلتھیوسے نے قومی داخلہ امتحان میں اعلی کارکردگی کا مظاہرہ کیا جس کی بنا پر فوج میں شمولیت اختیار کی۔ وہ اپنی رجمنٹ کے ہم راہ "وینز"(Vannes) میں پکڑا گیا اور "دوسری جنگ عظیم"(World War Two) کا بقیہ عرصہ شمالی جرمنی کے ایک کیمپ میں جنگی قیدی کے طور پر گزارا۔ اس نے اپنے مارکسی فلسفہ کی ترویج کا سلسلہ "ENS" کی پوسٹ سے جاری رکھا۔ ۱۹۷۵ ءمیں آلتھیوسے نے اپنے پہلے شائع شدہ کام کی کام یابی کے بعد "ہیلین رائٹ مین "(Helene Rytamann) سے شادی

کی۔ ۱۹۷۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کی انتخابی شکست کے باعث آلتھیوسے شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہوا۔ اِسی علت کے باعث اس نے اپنی بیوی کا گلا گھونٹ دیا اور قیدی کرنے کی بجائے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ لوئی آلتھیوسے، کی زندگی کے آخری دس سال نفسیاتی ہسپتالوں میں زیرِ علاج گزرے۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو دل کا دورہ پڑنے سے لوئی آلتھیوسے زندگی کی بازی ہار گئے اور اس جہاں فانی سے کوچ کر گئے۔ "لیوک فیریٹر" (Luke Ferretter) لوئی آلتھیوسے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "Louis Pierre Althusser was born in October 1918 near Algiers, the eldest son of a bank manager and a former schoolteacher. He grew up in Algiers, and also in France, in Marseille and Lyon. A devout Catholic, he founded a student Christian movement and even considered a religious vocation. In September 1939 he passed the entrance examination to the prestigious École normale supérieure in Paris, in which university teachers are trained, but he was called up before he could begin his studies. He became a prisoner of war in June 1940.Transported to a prison camp in northern Germany, he was initially assigned to hard labour, but after falling ill, worked as a nurse in the camp infirmary. This gave him the time to read widely in philosophy and literature." (4)

لوئی آلتھیوسے نے تقریباً "ایک سو بتیس" (۱۳۲) کتابیں لکھیں۔ جن میں مشہور اور اہم کتب ہیں:

1. The Future Lasts Forever: A Memoir, 1933 $_{A.D}$.
2. Lennin and Philosophy and Other Essays, 1968$_{A.D}$.
3. Mapping Ideology, 1994$_{A.D}$.
4. Politics and History: Montesquieu, Rousseau, Marx, 2007 $_{A.D}$.

5. On the Reproduction of Capitalism: Ideology and Ideological State Apparatuses, 2014 A.D.

۱۹٦۰ء میں آلتھیوسے نے "لڈوگ اینڈریاس وون فیورباخ" (Ludurg Andreas Von Feuerbach) کے کام سے متعلق ایک مجموعے کا ترمیم شدہ ترجمہ شائع کیا۔ جس کا مقصد مارکس کی ابتدائی تحریروں پر "فیورباخ" کے اثر و رسوخ کی نشاندہی کرنا تھا۔ اس مجموعے نے مارکسی فلسفے پر فرانسیسی بحث کو ہوا دی۔ اس ترجمہ کی پذیرائی سے متاثر ہو کر اس نے مارکسی فکر پر مزید مضامین شائع کیے۔ ۱۹٦۴ء میں آلتھیوسے نے "La Nouvelle Critique" جریدے میں "Freud and Lacan" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا جس نے "Freudo-Macxism" کی سوچ کو حد درجہ متاثر کیا۔ لوئی آلتھیوسے کی بین الاقوامی شہرت کا باعث اس کی دو کتابیں "For Marx" اور "Reading capital" ۱۹٦۵ء میں شائع ہوئیں۔ ایک بڑے پیمانے پر تنقید کے باوجود ان کتابوں نے آلتھیوسے کو فرانسیسی دانش وروں کے حلقوں تک پہنچا دیا۔ ان کتب میں مارکس کے ساختی نظریے کی حمایت کی گئی اور واضح طور پر تصدیق کی گئی کہ مارکس (Marx) نے ایک نئی اور منفرد سائنس کی بنیاد رکھی جو تمام غیر مارکسی فکر سے بے مثال ہے۔ ۱۹٦٦ ء کے آخر میں آلتھیوسے نے "On the Culture Revolution" کے نام سے ایک مضمون شائع کیا جس میں "چینی ثقافتی انقلاب" کو ایک "تاریخی حقیقت" کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس مضمون میں بنیادی طور پر "غیر بیوروکریٹ" (Non-Bureaucratic)، "غیر جماعتی" (Non-Party) اور "عوامی تنظیموں" (Mass-Organizationn) کی تعریف، مارکسی اصولوں کے اطلاقی نظریاتی مباحث کے طور پر کی گئی۔ ۱۹۹۵ء میں آلتھیوسے نے "On the Reproduction of Capitalism : Ideology and Ideological State Apparatuses" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ تاہم ان ابتدائی مخطوطات سے ہی آئیڈیالوجی کا تصور اور آئیڈیالوجیکل اپریٹس تیار کیا گیا جو

۱۹۸۰ء میں ایک فرانسیسی جریدے "La Pensée" میں شائع ہوا۔ اسی سال آلتھیوسے نے مارکسزم اور طبقاتی جدوجہد پر بھی روشنی ڈالی۔ لوئی آلتھیوسے کے کام کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں دانش وروں کے حلقوں میں ایک "مارکسسٹ" (Marxist) کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ لوئی آلتھیوسے نے سماجیت اور سماجی اقدار کا تعلق تاریخ سے جوڑتے ہوئے اس بات کو عمیق نگاہی سے بیان کیا کہ سماج کی تمام اقدار معاشی، سیاسی اور قانونی ایک نظریے سے جڑی ہوئی ہیں۔ یہ وہ نظریہ ہے جس نے معاشرہ تشکیل دیا اور انسانوں کے بیچ طبقات کو جنم دیا۔ اس کے خیال میں معاشرہ ایک باقاعدہ ساخت(Structure) کا حامل ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "Althusser's discussion of the reproduction of the relation of production and based on the concept of structure which, it has been said, is essentially; functionalist; he had constantly to define himself against that charge." (5)

اس ساختیات کی تشکیل کے پیش نظر بہت سے قدیم عوامل کار فرما ہیں جو سماج کا تعلق تاریخ سے جوڑتے ہیں۔ لوئی آلتھیوسے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سماج میں بہت سی روایات، خیال، جذبات ہم پر تھوپ دیئے گئے ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط بس ہمارے اذہان میں پختگی سے پیوست ہیں۔ یہ وہ روایات، جذبات اور رویے ہیں جو صدیوں کا سفر طے کر کے ہم تک پہنچے ہیں۔ آلتھیوسے کے نظری تصورات سے غذا حاصل کر کے ناقدین نے الزبتھ عہد اور نشاۃ ثانیہ کے متون کا جائزہ لیا۔ اِس متعلق لکھا ہے:

> "I killed a woman who was everything to me during a crists of mental confusion. She who loved me to the point of wanting only to die, because she could not continue living and no doubt in my confusion and unconsciousness, I did her this service; which she did not try to prevent, but from which she died." (6)

اُنھوں نے اپنے مفروضات کو رد کر کے نئے سوالات اٹھانے کے علاوہ بیانیوں کو بے نقاب کیا۔ یوں ادب اور تاریخ کے رشتوں کی نئی صورتیں ادبی مطالعات کے باعث سامنے آئیں۔ ساختیات کے تحت اس بات کا پرچار کیا گیا کہ سماجی عمل ثقافت کی وجہ سے ثقافت کے اندر بڑھوتری پاتا ہے۔ یہی نکتہ نو تاریخیت کے لیے پہلا سچ ثابت ہوا۔

iii. مورس ڈکسٹین (Morris Dickstein) :

مورس ڈکسٹین (Morris Dickstein) ،ایک امریکی ادبی سکالر، ثقافتی مورخ، استاد، مضمون نگار، نقاد اور عوامی دانشور تھے۔ جو ۲۳ فروری ۱۹۴۰ ء کو "نیویارک سٹی" (New York City) میں پیدا ہوئے۔ ڈکسٹین پیدائشی طور پر یہودی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے "کولمبیا یونیورسٹی" (Columbia University) میں "انڈر گریجویٹ" (Under Graduate) کرنے سے پہلے بارہ سال تک "یشیوا" (Yeshiva) میں شرکت کی۔ عبرانی علوم سے رغبت کے سبب اس نے عبرانی علوم کو جدید طرز دینے کی سعی "امریکہ کی یہودی تھیولوجیکل سیمینری " (Jewish Theological Seminary of America) میں شرکت کر کے کی۔ ۱۹۶۱ء میں ڈکسٹین نے "کولمبیا" سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی اور "ایم۔ اے" کرنے کی غرض سے ۱۹۶۳ء میں "ییل" (Yale) چلے گئے۔ علاوہ ازیں ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۴ء تک "کلئیر کالج کیمبرج" (Clare College Cambridge) سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۷ ء میں "ییل (Yale) " آنے سے قبل "پی ایچ ڈی "کی ڈگری حاصل کی۔ وہ نیویارک کے شہر "کیونے" (Cunny) کے "گریجویٹ سینٹر" میں انگریزی ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ بیسویں صدی میں امریکی ادب، فلم، ادبی تنقید اور ثقافتی سکالر کی حیثیت سے ڈکسٹین کا کام اخبار اور علمی جرائد جن میں: "نیو یارک ٹائمز"، (New York times) "بک ریویو"(Book review) ،"پارٹیزن ریویو " (Partisan review) "ٹرائی کوارٹرلی" (Tri "

"Quarterly) اور "دی نیو ری پبلک" (The New Republic) میں شائع ہوتا رہا۔ مزید براں"

مورس ڈکسٹین" (Dickstein) امریکی ادب و ثقافت پر متعدد کتابوں کے مصنف ہیں:

1. Gates of Eden: American culture in the Sixties, 1989 A.D.
2. Double Agent: The critic and Society, 1992 A.D.
3. A mirror in the Roadway: Literature and the Real World, 2005 A.D.
4. Dancing in the dark: A Cultural history of the Great Depression, 2009 A.D.

۲۴ مارچ ۲۰۲۱ء کو مورس ڈکسٹین "اکیاسی "سال کی عمر میں Parkinson's Disease کے باعث انتقال کر گئے۔ مورس ڈکسٹین نے "ادبی نظریہ اور تاریخی تفہیم" (Literacy theory and historical understanding) پر ایک مضمون ۲۲ مئی ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔ اس مضمون کے تحت وہ جدید ادبی تنقید کی تین اہم اقسام کو زیر بحث لاتا ہے:

> "Maureen Corrigan at NPR calls Dancing in the Dark"a penetrating work of cultural history" and a thrill to read" because of Dickstein's “zerty voice” and tightly worn erudition. The book was nominated for the national Book critics circle coward in criticism." (7)

مورس ڈکسٹین نے نو تاریخیت کے متعلق تمام حقائق کو جانچنے کی کوشش کی ہے اور تاریخیت کو ادب سے جوڑتے ہوئے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔

ب۔ نو تاریخیت کے دبستان خیال اور مفکرین

نو تاریخیت اساسی طور پر دو دبستانِ خیال میں منقسم ہے۔ جن میں پہلا: "نو تاریخیت کا امریکی دبستان" (American School of New historicism) اور دوسرا "نو تاریخیت کا برطانوی دبستان"

(British School of New historicism) ہے۔ اِن دونوں دبستانوں سے وابستہ بنیاد گزاروں کا

"سطری خاکہ (Line Graph)" ملاحظہ ہو:

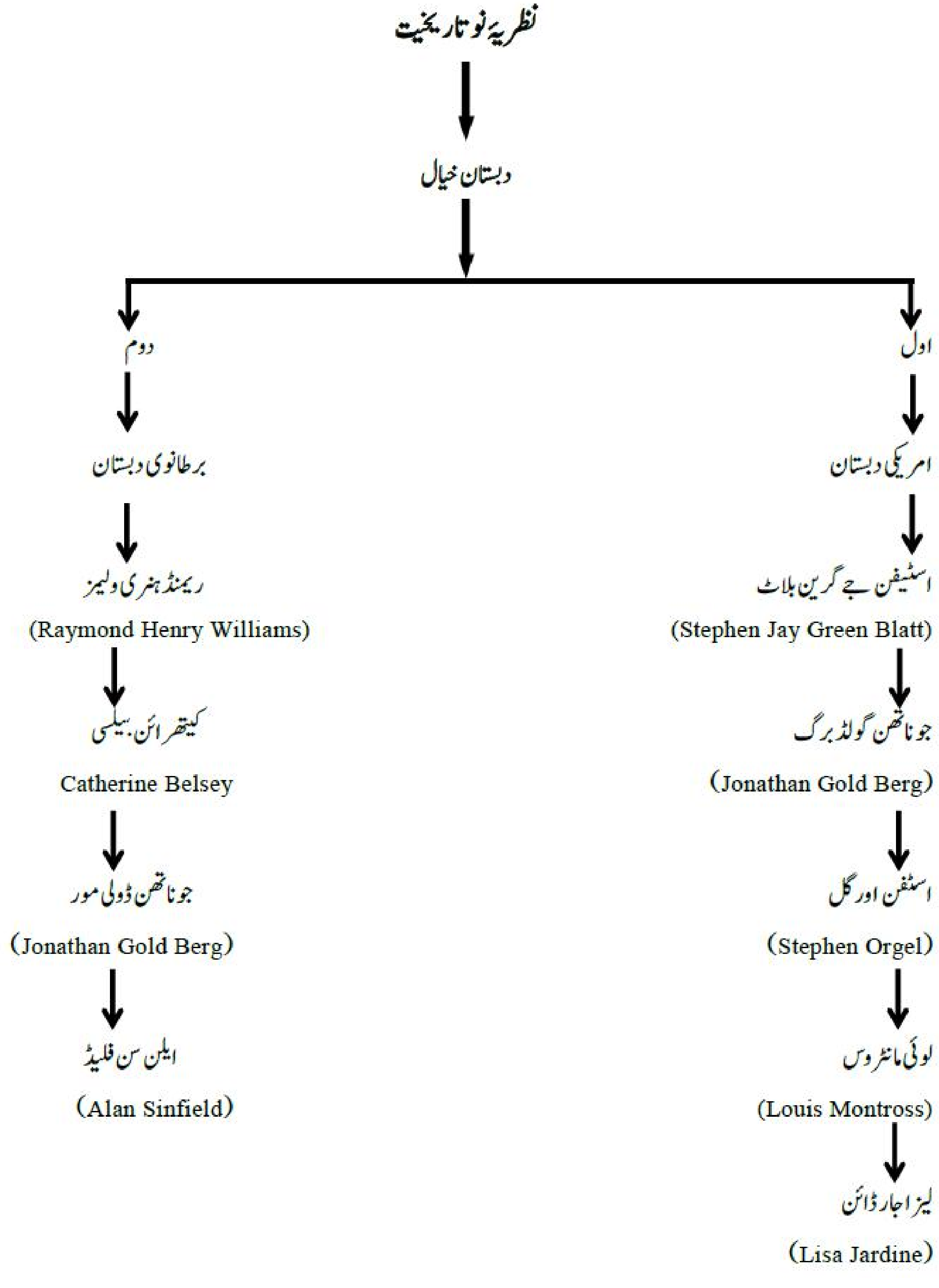

ذیل میں اِن دبستانوں سے وابستہ بنیاد گزاروں کا احوال اور نو تاریخیت سے متعلق اُن کے نظریات کو پیش کیا جارہاہے۔

اول۔ نو تاریخیت کا امریکی دبستان(AmericanSchool of New Historicism)

i. اسٹیفن جے گرین بلاٹ(Stephen Jay Green Blatt):

اسٹیفن جے گرین بلاٹ (Stephen Jay Green Blatt) ۷،نومبر ۱۹۴۶ء میں "بوسٹن میسا چوسٹس" (Boston Massachusetts) میں پیدا ہوئے ۔"نیوٹن نارتھ ہائی اسکول" (Newton North High School)سے گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے "پیمبروک کالج کیمبرج" (Pembroke college Cambridge) سے ۱۹۶۶ء میں ایم۔فل (M.Phil.)کی ڈگری حاصل کی اور "ییل یونیورسٹی (Yale University) سے ۱۹۶۹ ءمیں" پی ایچ ڈی"(Ph.d) کی۔ بعد ازاں گرین بلاٹ درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہوکر متعدد یونیورسٹیوں میں اپنے فرائض کی انجام دہی پر مامور رہے۔ اس کے علاوہ سٹیفن"SAR" جو کہ"Scholars Al Risk " کا مخفف ہے،کے بانی اور فیکلٹی شریک چیئر مین بھی ہیں۔ ایس اے آر، ایک ایسا تعلیمی و بین الاقوامی نظام ہے جو تعلیمی آزادی کے اصولوں و دفاع کی حمایت، اور دنیا بھر کے اسکالرز کے لیے انسانی حقوق کے دفاع کے لیے منظم ہے۔ جہاں تک گرین بلاٹ کے خاندان کا تعلق ہے تو یہ ایک یہودی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے دادا، دادی "لتھوانیا" (Lithuania) میں پیدا ہوئے جو ۱۸۹۰ء کے اوائل میں امریکہ ہجرت کرگئے۔ اسٹیفن جے گرین بلاٹ نے اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز ۱۹۹۸ء ایک ادبی نقاد" رامی ٹارگوف" (Ramie Targoff) کے ساتھ کیا جسے انہوں نے اپنا ہمنوا بتایا ہے۔"مارک روبسن " (Mark Robson) گرین بلاٹ کے متعلق لکھتے ہیں:

> "Stephen J. Greenblatt (1943) is one of the most important literary and cultural critics working today.

He is best known for his influential writings on Shakespeare and English Renaissance literature, but his work also encompasses interests in art, architecture, ritual, religion and culture in the widest imaginable sense. In a series of groundbreaking books, he has elaborated what he calls cultural poetics, a practice that has for nearly thirty years more usually been called new historicism". (8)

گرین بلاٹ نے شیکسپیئر، نشاۃ ثانیہ اور نئی تاریخ کو بڑے پیمانے پر موضوع بنایا ہے، جسے گرین بلاٹ: "ثقافتی شعریات" کہتے ہیں۔ ان کا زیادہ تر کام اجتماعی نوعیت کا ہے جیسا کہ "انتھولوجی آف انگلش لٹریچر" (Anthology of English Literature)اور "پریکٹسٹینگ نیو ہسٹوریسزم" (Practicing New Historicism)جیسی کتابوں کے شریک مصنف ہیں، جو انہوں نے "کیتھرین گیلی غر" (Catherine Gallagher)کے ساتھ مل کر لکھی تھی۔ کیتھرین گیلی غر اور اسٹیفن جے گرین بلاٹ نے اپنی سانجھی کتاب میں لکھا ہے:

"We began by wanting to explain how New Historicism had changed the field of literary history.The project was, on our part, a belated act of recognition."(9)

اسٹیفن جے گرین بلاٹ کی اہم اور مشہور کتب ہیں:

1. Renaissance Self-Fashoning: From More to Shakepeare, 1980 A.D.
2. The Power of Forms in English Renaissance, 1982A.D.
3. Representing the English Renaissance, 1988 A.D.
4. Shakespeares Negotiations: The Circulation of Social Energy, 1988 A.D.
5. Learning to Curse: Essays in Early Modern Culture, 1990 A.D.

6. Practicing New Historicism, 2001 A.D.
7. Shakepeares Freedom, 2007 A.D.

نئی تاریخیت (New Historicism) کا باقاعدہ آغاز امریکہ میں" یونیورسٹی آف کیلی فورنیا" (University of California)کے استاد اسٹیفن جے گرین بلاٹ کی تحریروں سے ہوا۔ گرین بلاٹ نے نَو تاریخیت کا ایسا تصور متعارف کرایا جو اس سے پہلے محض ایک سوچ پر منحصر تھا۔ اس تصور کا مقصد ادبی متون کا تاریخی مطالعہ ہے۔ اس کے خیال میں جب کسی ادب کے ٹکڑے کا مُطالعہ اس کے تاریخی پسِ منظر کے تحت کیا جاتا ہے تو نہ صرف ادب کے اس ٹکڑے کی تفہیم ہوتی ہے بل کہ اس عہد کے مبہم واقعات بھی بے نقاب ہوتے ہیں۔ "نو تاریخیت "کا تصور بڑی حد تک ادبی مطالعات پر نئے ناقدین کے رد عمل کی بدولت پھوٹا ہے۔ جب گرین بلاٹ "نو تاریخیت " کی اصطلاح کا تذکرہ کیا تو اس نے "نو تاریخیت "کو سابق "تاریخیت " سے الگ کرنے کی سعی کی۔ جسے اس نے "مونولوجیکل" (Monological) کا نام دیا۔ وہ" نو تاریخیت "کو تاریخ کے لکیری حقائق و ثبوت پر مبنی تصور سے امتیازی حیثیت دینا چاہتا تھا۔

> "The New Historicism is marked by a methodological self-consciousness, rather than the old historicist "faith in the transparency of signs and interpretative procedures. The New Historicism will view the work of art itself as the product of a set of manipulations . . . the product of a negotiation between a creator or class of creators, equipped with a complex, communally shared repertoire of conventions, and the institutions and practices of society."(10)

اس ضمن میں اسٹیفن گرین بلاٹ کی پہلی اہم شراکت ۱۹۸۰ء کی دہائی میں نو تاریخیت کو تاریخی تنقید سے ممتاز کرنا تھی۔ اس نے تجویز پیش کی کہ ادبی متون کا مؤثر اور بہترین مطالعہ کرنے کے لیے ادوار اور

واقعات جو بظاہر غیر منسلک ہیں وہ بھی زیر بحث لائے جائیں۔ لہٰذا نئی تاریخیت کو تاریخی تحقیقات کی حدود و قیود کا از سر نو تعین کرنا چاہیے۔ گرین بلاٹ اور اس کے نقاد اس بات سے اختلاف رکھتے تھے کہ ادبی متن اپنے عہد کے کلچر سے متعین نہیں ہوتا۔ ان کا اصرار تھا کہ ادبی متن بھی دیگر ثقافتی مظاہر کی طرح ثقافت ہی کا متعینہ ہے لیکن یہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ ادب کوئی ایسا آئینہ بھی نہیں ہے کہ اس میں تاریخ اور کلچر کی سیدھی سادھی تصویر دیکھی جاسکے یا کسی وحدانی نظر اقدار کی ترجمانی کی توقع کی جائے۔

گرین بلاٹ نے رائج تصورات کو رد کیا کہ ادب نہ تو مطلقاً آزاد و خود مختار ہے اور نہ ہی تاریخ کا آئینہ دار عکس ہوتا ہے۔ اُس کے مطابق ادب میں متخالف و متضاد رویے نیز مضمر عناصر بھی ملتے ہیں۔ ادب کا معاملہ اپنے زمانے میں رائج ضابطوں اور طور طریقوں کے ساتھ خاصا پیچیدہ اور تہہ در تہہ ہوتا ہے، عمل در عمل یہ پیچیدہ رویے باہم دگر مل کر کسی عہد کی تصویر بتاتے ہیں۔ گرین بلاٹ اور اُس کے رفقاء کے اس مؤقف کا ادبی نقاد پر خاصا اثر ہوا۔ نئی تاریخیت چوں کہ ایک تحریک یا دبستان کی صورت اختیار کر چکی تھی، اس لیے تقاضا کیا جانے لگا کہ اس کے لیے باقاعدہ تھیوری وضع کی جانی چاہیے۔ گرین بلاٹ نے اِس کی اُس وقت مخالفت کی۔ اور جواب میں ۱۹۷۸ء میں گرین بلاٹ نے Towards a Poetics of "Culture" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو اب تک "نو تاریخیت "(New Historicism) کی بنیاد چلا آرہا ہے۔ گرین بلاٹ کے رفقا میں؛"جوناتھن گولڈبرگ، اسٹیفن اورگل ،لوئی مانٹروس اور لیزا جارڈائن " کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کی مشترکہ مساعی نے ادب کے بارے میں اس عرفان کو عام کر دیا ہے کہ ادب کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک اس کے زمانے کے مخصوص ثقافتی طریقوں اور متون نیز ان سے ادب کے پیچیدہ رشتوں کے عمل در عمل سلسلے کو نظر میں نہ رکھا جائے۔

ii. جوناتھن گولڈ برگ(Jonathan Gold Berg):

جوناتھن گولڈ برگ (Jonathan Gold Berg) ، ۱۹۴۳ء میں امریکہ میں پیدا ہوئے۔ یہ ایک "ادبی تھیورسٹ" (Literacy Theorist) کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز "جان ہاپکنز یونیورسٹی" (Johan Hopkins university) سے بہ طور پروفیسر کیا۔ بعد ازاں انہوں نے ۲۰۰۶ء میں "ایموری فیکلٹی" (Emory Faculty) میں "آرٹ اور سائنس" (Art and science) کے شعبے میں شمولیت اختیار کی۔ "انگریزی نشاۃُالثانیہ کا ادب" (English Renaissance Literature) اُن کی شائع کردہ بہت سی کتابوں کا مرکزی موضوع ہے جس میں "نسل"(Gender) ،"جنسیت" (Sexuality) پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے نظریاتی،مادیت پسندانہ اور تاریخی شعبوں کو تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ جوناتھن گولڈ برگ نے نشاۃُا لثانیہ کے مُطالعات میں نوآبادیاتی رویوں کو سیاسی تصورات کے روپ میں پیش کیا۔ جوناتھن گولڈ برگ کا زیادہ تر کام ادب اور جدیدیت کے درمیان روابط کے متعلق ہے۔ انہوں نے "کولمبیا یونیورسٹی" (Columbia University)سے بی۔اے، ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مزید براں ۱۹۸۴ء میں گوگن ہائیم فیلوشپ حاصل کی۔ اس کے علاوہ تصنیفات میں چند اہم کتب یہ ہیں:

1. Endlesse Worke: Spenser and the Structure of Discourse, 1981 A.D.
2. James I and the Politics of literature: Johnson, Shakespeare, Donne and their Contemporaries, 1983 A.D.
3. Voice Terminal Echo: Postmodernism and English Renaissance Text, 1986 A.D.
4. Writing matter: Form the Hands of the English Renaissance, 1990 A.D.
5. Sodometries: Renaissance Texts, Modern Sexualities, 1992 A.D.

جوناتھن گولڈ برگ، کے کام کے حوالے سے "پروفیسر ڈاکٹر اشرف کمال" لکھتے ہیں:

"جوناتھن گولڈ برگ کا کام اکثر جدید ادب اور جدید سوچ کے درمیان تعلق کے بارے میں بحث کرنا ہے۔ خاص طور پر نسلی ، جنسی اور مادی حوالے سے"(۱۱)

ان کا شمار "نوتاریخیت" کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اسٹیفن جے گرین بلاٹ کے ساتھ مل کر نئی تاریخیت کی تھیوری وضع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ تاریخ چاہے انسانی ہو یا ادبی، اس کو جانے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ہمارا آج کا کیا ہوا ہر کام تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے تو ہمارا تعلق اپنے ماضی اور اپنے ماضی کے کام سے منقطع ہو جاتا ہے۔ انہی ماضی کی گھتیوں کو جوناتھن نسلی، جنسی اور مادی حوالے سے بیان کر کے نوتاریخیت سے اپنا ناطہ استوار کرتے ہیں۔

iii. اسٹیفن اورگل(Stephen Orgel):

اسٹیفن اورگل(Stephen Orgel) ، ۱۱ اپریل ۱۹۳۳ ءکو نیویارک (New York) میں پیدا ہوئے۔ یہ "سموئیل زیڈ" (Samuel Z) اور "ایسٹر" (Ester) کا بیٹا ہے۔ اورگل نے "کولمبیا یونیورسٹی" (Columbia university) سے ۱۹۵۴ء میں بی۔ اے، جب کہ ۱۹۵۹ء میں "ہارورڈ یونیورسٹی " (Harvard University) سے "پی ایچ ڈی" کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور اس ضمن میں بہت سی جامعات سے وابستہ رہے اور اس دوران اُنہیں بہت سے انعامات سے بھی نوازا گیا۔ اُن کی اہم اور مشہور تصنیفات ذیل ہیں:

1. The Illusion of Power: Political Theater in the English Renaissance, 1975 A.D.
2. Imagining Shakespeare: A History of Texts and Vision, 2003 A.D.
3. Wit's Treasury: Renaissance England and the Classics, 2021 A.D.

4. The invention of Shakespeare, and other Essays, 2022 A.D.
5. The idea of book and the creation of literature, 2022 A.D.

اِن کی تمام تصنیفات نو تاریخیت کی تھیوری کی وضاحت کرتی ہیں۔ ادب میں موجود نو تاریخیت چوں کہ ادب اور تاریخ سے منسوب ہے اس لیے اسٹفن اور گل نے بھی نو تاریخیت کا تعلق تاریخ اور ادب سے جوڑا ہے۔

iv. لوئی مانٹروس(Louis Montross):

"لوئی مانٹروس " (Louis Montross) "لندن" (London) میں پیدا ہوئے، نیویارک میں پرورش پائی اور کئی سالوں تک "جنوبی کیلی فورنیا" (South California) میں مقیم رہے۔ انسانیت کے علوم کے شعبے (Humanities) میں تعلیمی اسناد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں۔ لوئی مانٹروس بھی "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" (Stephen Jay Green Blatt) کے رفقا میں سے ایک ہیں۔ مانٹروس نے نو تاریخیت کی تھیوری کی تشکیل سے قبل کچھ تجاویز پیش کیں تھیں جو انتہائی اہم ہیں۔ پہلی تجویز یہ ہے کہ اگر نو تاریخیت " تحریر" اور " ثقافت" کے درمیان تعلق پر دوبارہ غور کرنے کا مطالبہ کرتی ہے تو یہ ان طریقوں پر بھی نظر ثانی کا آغاز کرتی ہے جن کے مصنفین خاص طور پر سماجی اور لسانی نظام کے ساتھ تعامل کرتے ہیں۔ یہ نو تاریخیت میں دوسری بڑی توسیع ہے، کیوں کہ اگر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہر انسانی سرگرمی ثقافتی میدان میں سرایت کر گئی ہے تو یہ ادبی متن کی خود مختاریت پر سوالیہ نشان ہے۔ مانٹروس کے مطابق " انفرادیت" ایک ایسے عمل کے ذریعے تشکیل پاتی ہے جسے وہ "سبجیک ٹیفیکیشن" (Subjectification) کا نام دیتے ہیں۔ جسے وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک طرف ثقافت ایسے افراد کو پیدا کرتی ہے جو" سبجیکٹیوٹی" (Subjectivity) کے حامل ہوتے ہیں۔ دوسری طرف یہ انہیں سوشل نیٹ ورک کے اندر رکھتا ہے اور انہیں ثقافتی ضابطوں کے تابع کرتا ہے جو بالآخر ان کی سمجھ اور "کنٹرول (Control) "سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون کے ایک حصے میں مونٹروس نے نو

تاریخیت کی تعریف کرنے کے لیے ایک تیسری تشویش کا اضافہ کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ کہتا ہے کہ ایک ادبی متن کس حد تک تنقید کو حقیقی بنیادوں پر پیش کر سکتا ہے۔ اس بارے میں وہ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتے۔ اگرچہ وہ "Containment" پر اپنا مخصوص رد عمل ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تحریر کی سیاسی صلاحیت کی تلاش ہی نو تاریخیت کا امتیازی نشان ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "نو تاریخی نقاد لوئی مانٹروس نے ادب اور تہذیب کے تعلق پر اظہار کیا ہے کہ متن جس تہذیبی نظام میں خلق ہوتا ہے، اس تہذیبی نظام اور متن کے مابین پائے جانے والے ربط کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کے مطابق مروجہ تنقیدی پیمانوں کی جبریت میں عرصہ ہائے دراز سے فن پاروں کی جمالیاتی مذہبی، سماجی اور اخلاقی اقدار یکساں چلی آ رہی ہیں"۔(۱۲)

ایسا نہیں ہے کہ کسی ترت پھرت میں نو تاریخیت کا تصور ابھرا اور ادب میں پیوست ہو گیا۔ اس کے پس منظر میں بہت سے نقادوں کی سوچ اور نظریہ حیات پوشیدہ ہیں۔ نو تاریخیت صرف ایک خیال، تھیوری یا زندگی کے ایک شعبے سے تعلق نہیں رکھتا بل کہ اس کی جڑیں تاریخ کے اُن کونوں کھدروں میں بھی اسی مضبوطی سے جکڑی ہوئی ہیں جو انسانی تہذیب، اقدار اور رسم و رواج سے مزین ہیں۔ جتنی انسانی تاریخ پرانی ہے اتنا ہی یہ تصوّر۔ اسی حقیقت کو آشکار کرتے ہوئے لوئی مانٹروس اپنا براہ راست تعلق نو تاریخیت سے جوڑتے ہیں۔

لوئی مونٹروس نے نو تاریخیت کو ادبی و غیر ادبی متون کا امتیاز نظر انداز کر کے دونوں کے مساوی مطالعے کا ترجمان کہا ہے۔ مُطالعہ کے دوران ادبی اور غیر ادبی متون ایک دوسرے کی آگہی میں اضافہ کرنے کے علاوہ باہمی ترغیب کو بھی تحریک دیتے ہیں۔ نو تاریخیت سے قبل روایتی تاریخی مطالعہ، تاریخ پر ادب کی برتری کا علم بردار تھا۔ نو تاریخیت نے یہ فرق پنہاں کر کے دونوں کو برابری کا درجہ دیا۔ اس کے قریب

تاریخ اپنے محفوظ مواد کی صورت میں ادبی فن پارے کی طرح ہی ایک فن ہے۔ جیسے ماضی کے واقعات کا دوبارہ وارود ممکن نہیں بال کُل اُسی طرح کسی ادیب کے فن پارے میں، اس کے مقاصد کی دوبارہ بازیافت نہیں کی جاسکتی۔ کیوں کہ بہت سے واقعات پہلے ہی بیش تر تجربوں سے گزر کر ہم تک ماضی کا متبادل بن کر آتے ہیں کیوں کہ ماضی موجودہ صورت میں صرف تحریر ہے۔ تبھی تحریر کا بغور مُطالعہ ضروری ٹھہرتا ہے۔ متن کے سیاق کو نَو تاریخیت کے ناقدین نے یہ سمجھ کر رد کیا کہ سیاق بیانیہ ساخت بن کر ماضی اور حال کے جدلیاتی رشتوں کو پروان چڑھاتا ہے۔ اور یہ رشتے یقینی طور پر ثقافت کے رشتے ہوتے ہیں۔لہٰذا انہوں نے ادب کا تہذیبی رنگ متعارف کرواکر دونوں میں مسابقت اور تشکیل نو کی ضرورت پر زور دیا۔

لوئی مونٹروس، کی چند اہم کتب ذیل میں درج ہیں:

1. The Purpose of Playing: Shakespeare and the Cultural Politics of the Elizabethan Theatre, 1996 A.D.
2. Curious-knotted Garden: The Form, Themes, and Contexts of Shakespeare's Love's Labour's Lost, 1977 A.D.
3. The Subject of Elizabeth: Authority, Gender, and Representation, 2006 A.D.

لوئی مونٹروس "پوسٹ اسٹرکچرل ازم" (Post Structuralism) سے جڑے متنی تصورات کو خاص طور پر تاریخی تنقید کے لیے مفید پایا۔ اِن کی تجاویز کی بدولت بھی "نَو تاریخیت" کو پھلنے پھولنے اور پر پھیلانے میں مدد ملی۔

v. لیزا جارڈائن (Lisa Jardine):

لیزا جارڈائن (Lisa Jardine) ۱۲ اپریل ۱۹۴۴ء کو "آکس فرڈ" (Oxford) میں پیدا ہوئی۔ اُن کے والد کا نام "جیکب برونوسکی"(Jacob Bronowski) تھا جو کہ ایک اہم" ریاضی دان"

(Mathematician)،" مجسمہ ساز" (Sculptor) تھے۔ لیزا جارڈائن اپنی چاروں بہنوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ۱۹۷۴ء میں والد کے انتقال کے بعد انہوں نے بڑی بہن کے تمام فرائض بخوبی انجام دیئے۔ بہت چھوٹی عمر سے ہی تاریخ میں دل چسپی رکھنے والی لیزا جارڈائن نے "چیلٹن لیڈیز کالج" (Chelten Ladies College) سے ریاضی کی اسکالر شپ حاصل کی اور بعد میں دو سال تک دو مختلف اداروں "نیون ہم کالج کیمبرج" (Newnham College Cambridge) اور "ایسکس یونیورسٹی" (Essex University) سے منسلک رہیں۔ لیزا جارڈائن کو آٹھ زبانوں پر عبور حاصل تھا جن میں یونانی اور لاطینی زبانیں بھی شامل ہیں۔ جہاں تک اُن کی ازدواجی زندگی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں دو شادیوں کا پتا ملتا ہے۔ پہلی شادی ۱۹۶۹ء میں ایک" سائنسی فلسفی" (Philosopher of Science) "نکولس جار ڈائن" (Nichelos Jordine) کے ساتھ جب کہ دوسری ۱۹۸۲ء میں ہوئی۔ لیزا جارڈائن نے سولہویں اور سترہویں صدی میں یورپی فکر اور سائنسی زندگی کی تاریخ کو دوبارہ لکھا۔ وہ ہمیشہ اُن مخصوص طریقوں میں سب سے زیادہ دل چسپی رکھتی تھیں۔ جیسے جیسے جار ڈائن کی دل چسپیوں میں اضافہ ہوا، اس نے تاریخ لکھنے کے نئے طریقے ایجاد کیے۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں یہ ایک رول ماڈل کی حیثیت سے سامنے آتی ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "In 1970 and 1980's when women were still rare in academia, Jordine became a mentor and model for a great many younger scholar's, for both male and female."(13)

لیزا جارڈائن کو پڑھنے پر ان کی تاریخ، ثقافتی مطالعات اور متنی تنقید سے گہری وابستگی کا اظہار ملتا ہے۔ جارڈائن کے کام میں تاریخ کی گہری کش مکش پائی جاتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ایک انقلاب خالصتاً قومی تاریخ کی ناپختگی کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے نزدیک تاریخ حال اور ماضی کے درمیان مسلسل بدلتی رہتی ہے۔ شیکسپیئر کا تاریخی مطالعہ، لیزا جارڈائن کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں اس نے ابتدائی جدید ثقافت کو پیش کیا۔ لیزا خود کو شیکسپیئر کی تاریخ ساز، نسوانی قاری کے طور پر بیان کرتی ہیں جو سیاسی و سماجی تبدیلی کے لیے پر عزم

ہیں۔لیزا جارڈائن نے بہت سی کتب کے ذریعے علمی سطح پر ایک خوب صورت اضافہ کیا جن میں چند ایک درج ذیل ہیں:

1. Reading Shakespeare Historically, 1996 A.D.
2. Ingenious Pursuits: Building the Scientific Revolution, 1999 A.D.
3. The curious life of Roberts Hooke: The man who measured London, 2003A.D.
4. Temptation in the archives: Essay in Golden age Dutch culture, 2015 A.D.

دوم۔ نو تاریخیت کا برطانوی دبستان (British School of New Historicism)

i. ریمنڈ ہنری ولیمز (Raymond Henry Williams):

ریمنڈ ہنری ولیمز (Raymond Henry Williams) ، ۳۱ اگست ۱۹۲۱ء میں "پانڈی" (Pandy) میں پیدا ہوئے۔"ولیمز" (Williams) ایک ریلوے ملازم کا بیٹا تھا۔ جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے ولیمز نے "King Henry VIII Grammer School" میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے نوعمری کے سال جنگ کے خطرات سے لبریز گزرے۔ ولیمز اس وقت چودہ (۱۴) سال کا تھا جب ہسپانوی خانہ جنگی کی ابتداء ہوئی۔ ولیمز، نے ۱۹۳۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرتے ساتھ ہی سیاست میں شمولیت اختیار کی جس کا پہلا پلیٹ فارم" کمیونسٹ پارٹی آف گریجویٹ "تھا۔ ولیمز، نے دوسری جنگ عظیم میں خدمات انجام دینے کی غرض سے اپنی تعلیم میں خلل ڈالا۔ ولیمز ،نے ۱۹۴۰ء کے آخر میں برطانوی فوج میں شمولیت اختیار کی۔ لیکن جون ۱۹۴۱ء میں امتحان دینے کے لیے کیمبرج میں ٹھہرے۔ بعد ازاں اُنہوں نے فوجی مواصلات کی ابتدائی تربیت حاصل کی لیکن اُسے دوبارہ توپ خانہ اور ٹینک شکن ہتھیاروں کے حوالے کر دیا گیا۔ ولیمز، نے کیمبرج یونیورسٹی سے "بی۔اے" کیا جس کے بعد ان کی استاد کی حیثیت سے آکس فرڈ یونیورسٹی میں تقرری ہوئی، جو کہ " سیفورڈ سیکس" (Seaford Sussex) میں واقع ہے۔ "سیفورڈ سیکس" میں منتقلی کے بعد

اس نے ورکرز ایجوکیشنل ایسو سی ایشن میں انگریزی ادب، ڈرامہ اور بعد ازیں ثقافت سے متعلقہ کلاسیں دیں۔ اِسی دوران اُنھوں نے ناولوں پر کام شروع کیا جو ثقافتی مطالعہ کے متعلق ہے۔ ۱۹۴۶ء میں ولیمز "ریویو پولیٹکس اینڈ لیٹرز" (Review politics and letters) کے نام سے ایک جریدے کی بنیاد رکھی۔ بعد ازاں انہوں نے ایک نئے تنقیدی جریدے جس کا نام "Essays in criticism" تھا میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۷ء کے درمیان ولیمز، فلم ساز "مائیکل اوروم" (Michal Orrom) کے ساتھ منسلک رہے جن سے وہ کیمبرج کے زمانے سے آشنا تھے۔ علاوہ ازیں ولیمز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سے یہ بات ازبر ہو جاتی ہے کہ یہ "ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ "کے تصورِ ثقافت سے بے حد متاثر تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے شائع کردہ ثقافتی تعریف سے متعلق دستاویزات کی بنیاد پر ولیمز نے ثقافت کے تصور کی تلاش شروع کی۔ جس کے نتیجے میں اس نے سب سے پہلے یہ دلیل دی کہ یہ تصور صنعتی انقلاب کے ساتھ مضمون "The idea of Culture" کے تحت ابھرا۔ اسی تصور پر ۱۹۵۰ء میں ولیمز کی پہلی کتاب "Culture and Society" منظر عام پر آئی۔ اس تصنیف کے ذریعے ولیمز کے خیالات عام قارئین تلک پہنچے اور اُن کو سراہا گیا۔ اِن کی کتب کی پذیرائی کے بل بوتے پر انہیں ۱۹۶۱ء میں کیمبرج واپس آنے کی دعوت دی گئی جہاں "جیسس کالج کیمبرج" (Jesus college Cambridge) کے ساتھی ممتحن منتخب ہوئے اور" فیکلٹی آف انگلش، یونیورسٹی آف کیمبرج" میں پہلے ڈراما(۱۹۶۷ء_۱۹۷۴ء) میں ریڈر کے طور پر، پھر یونیورسٹی کے ڈراما کے پہلے پروفیسر (۱۹۷۴ء_۱۹۸۳ء) کے طور پر تقرری حاصل کی۔ ۱۹۷۳ء میں "اسٹین فورڈ یونیورسٹی" (Stanford University) میں "پولٹیکل سائنس" (Political science) کے پروفیسر تھے۔ اس تجربے کو انہوں نے اپنی کتاب "ٹیلی ویژن: ٹیکنالوجی اینڈ کلچرل فار" (Television: Technology and cultural form) میں استعمال کیا۔ ولیمز ایک ایسا "سوشلسٹ" (Socialist) تھا جو زبان، ادب اور معاشرے کے درمیان تعلقات قائم کرنے میں دل چسپی رکھتا تھا اور اِن دیگر مسائل پر بہت سی کتابیں اور مضامین شائع کر چکا تھا۔ اس حوالے سے ولیمز کا ایک اہم کام "ایک ملک اور شہر"(The Country and the City) ، ۱۹۷۳ ء ہے۔ جس میں ادب کے ابواب سماجی تاریخ کے ابواب کے ساتھ متبادل ہیں۔ اِن کے علاوہ اُن کا کام: "مارکسزم

اینڈ لٹریچر" (Marxism and Literature) ۱۹۷۷ء میں بنیادی طور پر ماہرین کے لیے لکھا گیا ہے جو ثقافتی علوم کے لیے ولیمز کا نقطہ نظر متعین کرتا ہے۔ جسے انہوں نے "ثقافتی مادیت" (Cultural Materialism) کا نام دیا ہے۔ یہ کتاب جزوی طور پر ادبی مطالعات میں ساختیات کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ ولیمز ثقافت کے مباحثوں میں استعمال ہونے والے الفاظ کے بدلتے ہوئے معنی قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ بعد ازاں ۱۶۰ اہم الفاظ "کلچر" اور سوسائٹی کے ضمیمہ کے طور پر سامنے آئے۔ یہ ممکن نہیں تھا اس لیے ۱۱۰ الفاظ پر نوٹس اور مختصر مضامین کے ساتھ ایک توسیعی ورژن ۱۹۷۶ء میں کلیدی الفاظ کے طور پر شائع ہوا۔ "جمالیاتی"، "بورژوا"، "ثقافت"، "برتری"، "نامیاتی" میں ایک نظر ثانی شدہ ورژن میں ۲۱ نئے الفاظ شامل کیے گئے۔ جن میں "انارکزم"، "ایکولوجی"، "لبریشن" اور "سیکس" شامل ہیں۔ ولیمز نے لکھا ہے کہ "آکسفرڈ انگلش ڈکشنری" (OED) بنیادی طور پر "فلولوجیکل" (Philological) اور "ایٹمولوجیکل" (Atymological) ہے۔ جب کہ اس کا کام معنی و سیاق و سباق پر منحصر تھا۔ ۱۹۸۱ء میں ولیمز نے "کلچر" شائع کیا، جہاں اس اصطلاح کو تفصیلاً بیان کیا گیا جس کی تعریف کچھ یوں ہے"

> "The means of cultural production and the process of cultural reproduction."(14)

درج بالا تعریف ثقافت کو اس کی اصل سے منسلک کرتی ہے کہ ثقافت کے پھلنے پھولنے کے ذرائع کون سے ہیں اور یہ کب سے سماج کا حصہ ہے۔ بلاشبہ یہی وہ نظریات ہیں جن کے جواب میں ثقافت کی تاریخ پنہاں ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ جوں جوں ثقافت تبدیل ہوتی گئی توں توں تاریخیت بھی نو تاریخیت میں ڈھلتی گئی۔ ولیمز کا کام اگرچہ ثقافتی علوم کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہے لیکن اس کا کام دیگر معاملات میں نظم و ضبط کے مرکزی دھارے سے کچھ حد تک معمولی بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے تجزیے کے طریقوں اور تکنیکوں کا رجحان صرف بتدریج اور جزوی طور پر ساختیات اور سیمیوٹکس کی بصیرت کو شامل کرنے کے لیے تھا جو ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ کی دہائیوں میں ثقافتی علوم کے لیے بنیاد تھے۔ ثقافت اور معاشرہ ادبی

تاریخ میں ایک مشق ہے لیکن کتابوں اور مصنفین کو نظریات کی وسیع تر تاریخی اور سماجی ترقی، اور ثقافت کو ایک مکمل طرز زندگی، ہمارے تمام مشترکہ تجربات کی ترجمانی کا ایک طریقہ جو ادب کی تلاش کرتا ہے۔ لہذا ثقافت اشرافیہ کی ثقافت نہیں ہے بل کہ ایک ایسی ثقافت ہے جو روزمرہ کے تجربے اور سرگرمیوں میں سرائیت کرتی ہے۔ ولیمز کو جس ثقافت میں دل چسپی ہے وہ وہ ثقافت ہے، جو صنعتی سرمایہ داری کی ایک پیچیدہ تنقید کے طور پر ابھرتی ہے۔ ریمنڈ ہنری ولیمز اپنے مطالعات کو اِن کتب کی شکل میں پیش کیا ہے:

1. The Country and the City, 1973 A.D.
2. Culture and Society: 1780-1950, 1975 A.D.
3. Keywords: A Vocabulary of culture and Society, 1976 A.D.
4. The sociology of culture, 1981 A.D.
5. Writing in Society, 1983 A.D.

ii. کیتھرین بیلسی (Catherine Belsey):

کیتھرین (کیتھرائن) بیلسی (Catherine Belsey)، "سالیس بری" (Salisbury) میں پیدا ہوئیں اور ابتدائی تعلیم لندن کے "گوڈولفن اور لیٹمر سکول" (Godolphin and Latymer School) میں حاصل کی۔ اسکول کے بعد ان کی تعلیمی درس گاہ "سومرویل کالج" (Somerville College) ٹھہرا اور بعد ازاں "واروک یونیورسٹی" (Warwick University) میں پوسٹ گریجویٹ کے طور پر تعلیم حاصل کی۔ بیلسی مختصر طور پر نیو ہال کیمبرج (New hall Cambridge) میں شریک کار تھیں۔ "سوانسیا یونیورسٹی" (Swansea University) جانے سے پہلے اس نے "کارڈف یونیورسٹی" (Cardiff University) میں تنقیدی اور ثقافتی تھیوری کے مرکز کی سربراہی کی۔ اس کی کتاب "کریٹیکل پریکٹس" (Critical Practice) ۱۹۸۰ء ادبی علوم کے لیے نئی سمتیں تجویز دینے کے تناظر میں ایک بااثر پسِ ساختی متن کی حیثیت رکھتی تھی۔ بیلسی

نے تنقید کے نظریہ اور عمل میں بین الاقوامی اختراعات کے ہم راہ خود کو مستقل طور پر ہم آہنگ کیا۔ اپنی وسیع علمی تحاریر کے علاوہ بیلسی اکثر سوشلزم اور انسانیت کی اہمیت جیسے موضوعات پر اپنے عقائد کا اظہار کرتی رہی ہیں۔ علاوہ ازیں بیلسی نے رومانوی ناولوں کے اثرات کے بارے میں بھی قلم اٹھایا ہے۔ اپنی تمام تصانیف میں بیلسی، "سوسئیر " (Saussure) کو خراج تحسین پیش کرتی رہیں ہیں جس کی ساختیاتی بصیرت کے پیش نظر "کلچر اینڈ رئیل" (Culture and the Real) اور "شیکسپیئر کی تھیوری" میں (Shakespeare in Theory) کو پوسٹ اسٹرکچرلزم کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ **بیلسی ادب، سیاست اور تاریخ پر زور دیتی ہوئی نظر آتیں ہیں۔** یہ تاریخ کو یوں بیان کرتے ہیں کہ تاریخ اِس طرح کے پڑھنے سے پیدا ہونے والے ہمارے سیاسی تصورات کو بدل دیتی ہے۔ تاریخ دراصل تبدیلی کا نام ہے جو کہ سیاسی اور تاریخی امکانات کو ظاہر کرتی ہے۔ بیلسی اپنی کتاب "Mterwords" میں نئی تاریخیت اور ثقافتی مادیت پر غور و فکر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "کیتھرین بیلسی نے خالصتاً تاریخ سے وابستگی استوار کر کے ادب اور سیاست کے باہمی تعلق پر بھی روشنی ڈالی۔"(۱۵)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیتھرین کے مطابق ادب کسی طور سیاسی دھارے سے جدا نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے ادب، تاریخ اور سیاست کے تعلق کو واضح کیا، اور اس تاریخ سے وابستگی نے نو تاریخیت کی راہیں ہم وار کیں۔ علاوہ ازیں کیتھرین بیلسی نے ادب اور تاریخ کے پیچیدہ رشتوں اور ادب کو انسانی تاریخ کی ایک زندہ رو کے طور پر سمجھا۔ انہوں نے سابقہ تاریخ دانوں کے اکہرے تاریخی تصورات سے اختلاف کر کے نئی تاریخیت کے متنوع طریق نقد کو فروغ بخشا۔ اس میں دو ابواب ایسے ہیں جو "نئی تاریخیت" اور "ثقافتی مادیت" پر مشتمل ہیں ان دونوں ابواب کی حیثیت تاریخی اور نظریاتی طور پر ان تنقیدی طرز عمل کے نتیجے میں استوار ہوتی ہے جو کہ نئی تاریخیت اور ثقافتی مادیت کے بعد ہی ممکن ہیں۔ ان کے کام کا بنیادی شعبہ ثقافتی

تاریخ اور تنقید کے پہلو کے لیے "پوسٹ اسٹر کچرل" (Post structural) تھیوری کے مضمرات پر ہیں۔ بیلسی کا موجودہ کام "ثقافت اور حقیقت" پر مبنی ہے جو کہ نفسیاتی تجزیہ کی روشنی میں عصری تغیر پسندی کی حدود پر غور و فکر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر بیلسی "سینٹر فار کریٹیکل اینڈ کلچرل تھیوری" (Center for Critical and Cultural Theory) کی سربراہی کرتی رہیں جو کہ انسان اور ثقافتوں کے درمیان تعلق کے بارے میں موجودہ نظریات پر بحث و مباحثہ کے لیے ایک تحقیقی فارم ہے۔ نو تاریخیت کے برطانوی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہوئے بیلسی نے نو تاریخیت کی تفہیم و تعبیر مارکسی و سیاسی تناظر میں کی ہے۔ اُن کے خیال میں حاوی کلچر ان نئے مفاہیم اور اقدار کا ترجمان ہے جو ہر آئے دن متعارف ہوتے ہیں۔ حاوی کلچر اپنے آمرانہ دائرہ کار کی وجہ سے دوسروں پر دھاک بٹھانے کی کوشش کی۔ لگا رہتا ہے یا ایک سے زیادہ حاوی کلچر باہمی چپقلش کہ وجہ سے ختم ہوتے ہیں یا ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہیں۔ باقیاتی کلچر اپنے فطری بہاؤ اور اندرونی طاقت کی وجہ قدم جمائے رکھتا ہے۔ یہ حاوی کلچر کے مقابل رہتا ہے اور اسے اپنانے سے گریز کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ تبھی حاوی کلچر باقیاتی کلچر کو زیر تسلط لانے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ عوام کے کئی گروہوں کا باقیاتی کلچر سے وابستہ ہونا ہے۔ اجتماعی صداقت کے باعث باقیاتی کلچر کو ہی ادبی مطالعہ میں استعمال میں لانا چاہیے۔ نیز باقیاتی اور قدیم کلچر کے مخدوش عناصر میں مشابہت بھی دیکھنی چاہیے۔ مزید باقیاتی کلچر کے ان خدوخال کی جانچ پڑتال بھی ضروری ہے جنہیں حاوی کلچر نے دبانے کی منافقانہ کوشش کی ہے۔ کیتھرین، علاوہ ازیں یہ خیال پیش کرتی ہیں کہ ادب، بالخصوص تاریخ اور سیاست سے کبھی بھی جدا نہیں ہو سکتا۔ سیاسی ادارے خاص طرح کے فکری بیانیے رائج کرتے ہیں جس سے الفاظ کے سیاسی سطح پر الگ معنی وضع ہو جاتے ہیں۔ کیتھرین تاریخی متن کی طرح ادبی متن کو بھی بے ربط سمجھتی ہیں۔ اس طرح ان کا یہ تصور ادب کا جمالیاتی نہیں بل کہ صرف سیاسی و تاریخی مطالعہ کی حثیت اختیار کر جاتا ہے۔ کیتھرین بیلسی، نے اپنی فکر اور خیالات کو ان کتب میں سمیٹا ہے:

1. Critical practice, 1980 A.D.

2. The Feminist Reader: Essay in Gender and Politics of literary Criticism, 1989 A.D.
3. Shakespeare and the loss of Eden: The Construction of Family Values in Early modern Culture, 1999 A.D.
4. Poststructuralism: A very Short Introduction, 2002 A.D.
5. Criticism: Ideas in Profile, 2016 A.D.

iii. جوناتھن ڈولی مور (Jonathan Dollimore):

جوناتھن ڈولی مور (Jonathan Dollimore) ، ۱۹۴۸ء میں "لیٹن بزارڈ، انگلینڈ" (Leighton Buzzards, England) میں پیدا ہوئی۔ پندرہ سال کی عمر میں سکول چھوڑنے کے بعد انہوں نے ایک کار فیکٹری میں ملازمت اختیار کر لی اور اپنا زیادہ تر وقت تیز رفتاری سے موٹر سائیکل چلانے میں صرف کیا۔ سولہ سال کی عمر میں وہ ایک سنگین ٹرک حادثے کا شکار ہوئے جس کے لیے ہسپتال میں طویل قیام کی ضرورت پڑی۔ اسی دوران صحت یابی تک ڈولی مور نے مصنف بننے کا فیصلہ کیا۔ اس نے "لوٹن کالج آف ٹیکنالوجی" (Luton college of Technology) میں انگریزی میں اے لیول کرنے سے پہلے ایک مقامی اخبار کے رپورٹر کے طور پر چار سال گزارے۔ بعد ازاں "کیلی یونیورسٹی" (Keele University) میں انگریزی اور فلسفہ کے مضمون میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران تعلیمِ فلسفہ کو غیر متاثر کن پایا جس کے بارے میں ان کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

> "I was discovering back then the philosophy, was not only more important than the academic study of the allowed, but that as a subject. It needed to be turned against the academy which diminished it. That became the basis of everything. I subsequently wrote."(16)

۱۹۷۴ء میں ڈولی مور نے "بیڈ فورڈ کالج، یونیورسٹی آف لندن" , Bedford college)
(University of London سے "پی ایچ ڈی" (Ph.d) کی شروعات کی لیکن ایک ڈیڑھ سال بعد درس و تدریس سے منسلک ہونے کے سبب اپنا پیش کردہ مقالہ ترک کر دیا۔ تاہم، ۱۹۸۴ء میں انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا گیا۔ لندن یونیورسٹی نے انہیں تھیسس کے بدلے اپنی پہلی کتاب "Radical Technology: Religion, Ideology, and power in the drama of Shakespeare and his Contemporaries" پیش کرنے کی اجازت دی۔ اس کتاب کے تین ایڈیشن ہوئے جن میں پہلا ۱۹۸۴ء دوسرا ۱۹۸۹ء جب کہ تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۰ء کو شائع کیا گیا۔ اُنہوں نے اِس کتاب کے ابتدائی جلد میں یہ دلیل دی ہے کہ انسانیت پسند تنقیدی روایت نے جدید قارئین کے لیے ابتدائی جدید انگریزی ڈرامے کی اصل بنیاد پرست فعال کو مسخ کر دیا ہے۔ جس کا تعلق نظریہ تنقید کے ساتھ آدمی کے سیاسی اور طاقت کے تعلقات کی باقاعدگی اور منحرف ہونے سے تھا۔ اس کے علاوہ ڈولی مور نے ادب پر اپنی بحث کو مرکوز کرتے ہوئے تنقید، اخلاقیات اور جمالیات کے درمیان تعلق کو دریافت کیا۔ علاوہ ازیں "ایلن سن فیلڈ" (Alan sin field) کی طرح "ثقافتی مادیت" (Cultural Materialism) پر بات کرتی ہیں اس ضمن میں ڈولی مور کا خیال ہے کہ تاریخی سیاق و سباق، نظریاتی طریقہ، سیاسی وابستگی اور متنی تجزیہ کا مجموعہ ہے۔ ثقافتی مادیت پسند کو آئیڈیلسٹ نقطۂ نظر کے بجائے مادیت پر غور کرتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ تنقیدی کلچروں کو رد کرنا۔ جیسا کہ شیکسپیئر کی تخلیقات "انسانی فطرت" نامی کسی چیز کے انکشاف کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس طرح جہاں روایتی تنقید شیکسپیئر کے دور کا ایک قدامت پسند سیاسی جمود کو آرام سے برقرار رکھنے والے دور کے طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ثقافتی مادیت کو اختلاف یا انحراف کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ڈولی مور، کے مطابق تنقید ایک ایسا علمی دائرہ ہے جس میں سیاست موجود ہے اور اسی تناظر میں شیکسپیئر اور دیگر ادبی تحریروں کی غیر جانب دارانہ پڑھائی پیش کرتی ہے۔ ثقافتی مادیت پسندوں کے لیے تمام ریڈنگز سیاسی ریڈنگ ہیں۔ ڈولی مور نظریۂ جمالیات، اخلاقیات اور سیاست پر بحث کرنے کے ساتھ

ساتھ اس بات پر بھی غور کرتے ہیں کہ کس طرح ایک بنیاد پرست مادیت پسند عمل کے لیے خواہش کو روحانیت کے ساتھ متحرک کیا جائے، وہ ثقافتی مادیت کی مسلسل مطابقت کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ وہ ثقافتی حیاتیات کی عینک سے انسانی فطرت کا جائزہ لیتا ہے۔ علاوہ ازیں ،اِس اِمکان پر بھی غور و فکر کرتے ہیں کہ ثقافت بذات خود ارتقائی مخالف ہو سکتی ہے۔ ڈولی مور کی یہ "ثقافتی مادیت" کی اصطلاح گزشتہ نو تاریخیت کے مترادف ہے۔ اس طرح ڈولی مور کے نظریات نَو تاریخیت کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں جن کو انہوں نے اپنی مختلف کتب میں قلم بند کیا ہے:

1. Radical tragedy: Religion, Ideology, and Power in the Drama of Shakespeare and his Contemporaries, 1984 A.D.
2. Political Shakespeare: New Essays in Culture Materialism, 1985 A.D.
3. Sexual Dissidence: Augustine to Wilde, Freud to Foucault, 1991 A.D.
4. Death, Desire and Loss in Western Culture, 1998 A.D.
5. Sex, Literature and Censorship, 2001 A.D.

iv. ایلن سن فیلڈ(Alan Sinfield):

ایلن سن فیلڈ(Alan Sinfield) ، ۱۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو"ساؤتھ گیٹ، شمالی لندن" میں پیدا ہوئے۔ ایلن سن فیلڈ ،کا تعلق انتہائی غریب گھرانے سے تھا۔ انہوں نے ۱۹۹۴ء میں بی۔ اے کیا۔ ۱۹۶۷ء میں ایم۔ اے اور ۱۹۸۷ء میں ڈی لٹ کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سن فیلڈ ۱۹۶۵ء میں "سیکس یونیورسٹی" (University of Sussex) میں انگریزی کے لیکچرار کے طور پر مقرر ہوئے۔ درس و تدریس کے پیشے سے مستقل جڑے رہنے کے باعث آخر کار ۱۹۹۰ء میں انگریزی اور ثقافتی علوم کے پروفیسر بن گئے۔ "دی گارڈین" (The Guardian) ان کے متعلق لکھا ہے:

"Sussex now developed its reputation as the most exciting, theoretically informed English is taught in Universities with Alan."(17)

ایلن سن فیلڈ کا کام" ادب، سیاست اور ثقافتِ برطانیہ میں جنگ کے بعد " (Literature, Politics and Culture in the Past War Britain) ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ ایلن سن فیلڈ، ۲۰۰۴ء میں "سُسیکس" (Sussex) سے ریٹائر ہوئے۔ ۲۰۱۶ء میں ایلن سن فیلڈ ایک جریدے سے منسلک ہوئے۔ یہ طویل عرصہ تک اُس جریدے کے ایڈیٹر رہے۔ انہوں نے "سات اوپر پانچ" سال کی عمر میں وفات پائی۔ انہوں نے برطانیہ میں حیران کن مُطالعات کا آغاز کیا اور شیکسپیئر کی تفہیم میں نئ جہتیں شامل کیں۔ انہوں نے "سسکیس یونیورسٹی" (Sussex university) میں اپنی درس و تدریس اور اپنی تحریر ،دونوں میں پیچیدہ نظریاتی خیالات کو قابل رسائی بنایا۔ ماضی کے متن کو اپنے موجودہ مسائل سے جوڑا۔ ان کا زیادہ تر کام "الزبتھین ڈرامے" (Elizabethan Drama) سے لے کر مقبول ثقافت تک اکیڈمی سے باہر کیا گیا ہے۔ اس میں جنگ کے بعد کا ادب، ثقافت اور سیاست شامل ہیں۔ بیسویں صدی کا تھیٹر، آسکر، وائلڈ ٹینشن اور جدید پاپ میوزک میں ثقافتی شکلوں اور سیاسی اور اقتصادی طاقت کے درمیان تعلقات کے بارے میں ان کی دقیق فکر ہے۔ اس فکر کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ سماجی اخراج اور جنسی شناخت کے ساتھ، معاشرے اور اس کی ثقافتوں کو تبدیل یا تباہ کیا جا سکتا ہے۔ ایلن نے طاقت کے دیگر رشتوں، عمر، نسل، جنس اور سب سے بڑھ کر طبقے کے ساتھ جنسیت کے پیچیدہ اور اکثر ٹیڑھے چوراہوں کی کھوج کی۔ ایلن کا مقصد صرف ایک نقطہ نظر کو دوسرے نقطہ نظر سے بدلنا نہیں تھا بلکہ اس بات کی تحقیق کرنا تھا کہ تشریحات کے درمیان تصادم کے پیچھے کیا پوشیدہ ہے۔ اس نے متبادل معنی تلاش کرنے پر اصرار کیا اور اپنی کتاب "فالٹ لائنز" (Fault Lines) میں اس نے ایک ایسا خاکہ پیش کیا جس میں ظاہر کیا گیا کہ کس طرح غالب ثقافتی شکلیں، چاہے شیکسپیئر کے زمانے سے جڑی ہو یا موجودہ زمانے سے اتنی بھی ہم وار نہیں

ہوتیں جتنی ظاہری طور پر نظر آتی ہیں۔ ایلن نے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخر میں ثقافتی مادیت کی اپنی مخصوص شکل پیش کی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "The British counterpart of New historicism is called cultural materialism, an expression made currents in 1985 by Jonathan Dolli more and Alan sin field in the Book they edited, political Shakespeare (1994). A politicized framework in cultural materialism includes the historical context, theoretical approaches, and textual analysis with political commitments. Cultural materialism is described as a politicized form of historiography, Culture includes all forms of culture high as well as popular"(18)

ایلن سن فیلڈ نے انسانی عمل اور اقتصادی مظاہرات کے مابین قائم ہونے والے تعلق کو تہذیبی مادیت کے تنقیدی طریقہ کار کے چار مرحلوں "تاریخی سیاق، نظری طریق کار، تاریخی وابستگی، اور متنی تجزیہ" میں تقسیم کیا ہے۔ تاریخی سیاق ادبی متون کے لازمانی کردار کو اُجاگر کرتا ہے۔ ان کے مطابق:

> "ادبی فن پارہ اپنے تاریخی دورانیے کی معنویت تک ہی محدود نہیں رہتا، وہ بعد میں آنے والے زمانوں کی ترجمانی کر کے ہمہ تاریخ سے بھی متصف ہو سکتا ہے۔"(۱۹)

یہ لازمانیت کا وصف اس لیے ابھرا کیوں کہ تہذیبی مادیت تاریخ کے بازیافتی عمل میں ادبی متن کو آزادی دیتی ہے۔ جس طرح سماجی، سیاسی اور اقتصادی مظاہر ادب پاروں میں اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں بالکل اسی طرح ادبی متون بھی سماجی اور تہذیبی اشکال کے خدوخال نمایاں کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ تہذیبی مادیت میں متن اپنی تفاعلی حیثیت کے ذریعے نوآبادیاتی، پس نوآبادیاتی، مابعد جدید صارفی اور صنعتی سماج کا مطالعہ کر کے عصری نو تاریخیت اور تہذیبی مادیت دونوں ساختیات کے اثرات قبول کر کے علم

کی حقیقتوں، متن کی نوعیتوں پر مبنی ہر قرأت پر تنقید کر کے حالتوں اور معاشرے کے اقتصادی سیاق سے تجاوز نہیں کرنے دیتے۔ ایلن سین فلیڈ کی کتب کو ان کے تصورات کی صورت میں پرکھا جاتا ہے۔ ان کی کتب مندرجہ ذیل ہیں:

1. Literature, Politics and Culture in PostWar Britain, 1989 A.D.
2. Faultlines: Cultural Materialism and the Politics of Dissident Reading, 1992 A.D.
3. The Wilde Century: Effeminacy, Oscar Wild, and the Queer Moment, 1994 A.D.
4. Out on Stage: Lesbian and Gay Theatre in the Twentieth Century, 1999 A.D.
5. Shakespeare, Authority, Sexuality: Unfinished Business in Cultural Materialism, 2006 A.D.

درج بالا کتب میں " ایلن سن فیلڈ " نے اپنے اساسی نظریات کے ساتھ ساتھ سیاست، ثقافت، مقتدرہ، تاریخ اور نو تاریخیت کے نظریات کو بھی پیش کیا ہے۔

حوالہ جات

1. Gary Gutting, Foucault: A Very Short Introduction, oxford university press, oxford, 2005, P: 2
2. Marmie Hughes-Warrington, Fifty key thinkers on history, London, Routledge, 2000, P: 95.
3. Michel Focualt, Archeology of knowledge, Routledge, London, 1989, P: 120.
4. Luke Ferretter, Louis Althusser, Routledge, London, 2006, P: 02
5. Louis Althusser, On the reproduction of capitalism: ideology and ideological State Apparatuses, Verso, London, 2014, P: 15.

۶. لوئی آلتھیوسے،وکی پیڈیا،https://en.wikipedia.org/LouisAlthusser

۱۲ دسمبر ۲۰۲۲ء، 08:00 am

۷. مورس ڈکسٹین،وکی پیڈیا،https://en.Wikipedia.org/wiki/MorrisDickstein

۲ جنوری ۲۰۲۲ء، 10:00 am

8. Mark Robson, Stephen Greenblatt, Routledge, London, 2008, P: 01.
9. Stephen Greenblatt, Catherine Gallagher, Practicing New historicism, University of Chicago Press,London, 2000,P:01
10. Stephen Greenblatt,Renassiance Self-Fashioning:From more to Shakespeare, University of Chicago Press,2005, P:26

۱۱. محمد اشرف کمال ، ڈاکٹر،تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات ، مثال پبلشر رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ ،امین بازار،فیصل آباد، سنہ اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۱۳۹

۱۲. سید ازور عباس،اُردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث، مقالہ برائے ایم۔ فل اردو، مملوکہ: شعبہ اُردو زبان وادب، پنجاب یونیورسٹی،لاہور،۲۰۱۸، ص ۹۶

۱۳. لیزا جارڈائن،ہسٹری ٹوڈے،https://www.historytoday.com/archive/lisa-jardine

۲ جنوری ۲۰۲۲ء، 10:00 am

۱۴. ریمنڈ ہنری ولیمز، وکی پیڈیا، https://www.wikipedia.org/wiki/RaymondWilliams

۳ جنوری ۲۰۲۲ء، 11:00 am

۱۵. سید ازور عباس، اُردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث، مقالہ برائے ایم۔ فل اردو، مملوکہ: شعبہ اُردو زبان و ادب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۸، ص ۱۰۹

16. Dolli more, Jonathan, Desire: A memoir, Bloomsburg, London and New York, 2017. P: 45.

۱۷. ایلن سن فیلڈ، دی گارڈین: http://www.theguardian.com، ۳ جنوری ۲۰۲۲ء، 12:00 pm

۱۸. ایلن سن فیلڈ، یوٹیوب، 2018 https://youtube/fNW1AiL1axw، ۳ جنوری ۲۰۲۲ء، 01:00 pm

۱۹. سید ازور عباس، اُردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث، مقالہ برائے ایم۔ فل اردو، مملوکہ: شعبہ اُردو زبان و ادب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۸، ص ۲

باب سوم:

اُردو تنقید اور نُو تاریخیت: نظری مَباحث

الف۔ اُردو تنقید میں نُو تاریخیت کے نظری مَباحث کا آغاز اور روایت

نظریہ، فکر اور آئیڈیالوجی کو جدید ادبی تنقید کی مَباحث میں اساسی اہمیت حاصل ہے۔ تنقید کے نظریاتی پہلو کو اہمیت دینا، دراصل اس کو فلسفے کے قریب لانا ہے۔ اس واسطے کے، فلسفیانہ کارگزاری اپنی اصل میں نظریہ اور فکر سے معاملہ کرتی ہے۔ جدید عہد کی ادبی تنقید کے فکری کلامیوں میں " پیراڈایم شفٹ" (Paradigm Shift) دیکھنے میں آئی ہے۔ علوم کی بیش بہا ترقی نے اِس امر کو ممکن بنایا ہے۔ بیسویں صدی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اِس نے متنوع کو کسی ایک مظہر یا مسئلے کی شناخت میں یک جائی کا موقع فراہم کیا ہے۔ علوم کی روایتی حدبندیوں کے ٹوٹنے سے ایک مظہر کی تفہیم اب کئی علوم، طریقہ ہائے کار اور حکمت عملیوں کے توسط سے ممکن ہوئی ہے۔ اسے اصطلاح میں "بین العلومیت"(Interdisciplinary) اور "کثیر العلومیت" (Trans Disciplinary) کہا جاتا ہے۔ کائنات کے تمام مظاہر جس طرح ایک زنجیرِ ہستی سے منسلک ہیں، ایسے ہی علوم اور فکری نظام باہم مربوط ہیں۔ یوں تو تنقید کا نظری یا نظریاتی پہلو شروع سے ہی قابلِ غور رہا ہے معاصر عہد میں فلسفہ اور ادبی تنقید کے بین العلومی روش پر ارتباط نے اس امر میں بہت زیادہ وسعت پیدا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید کے نظری یا نظریاتی پہلو، اس کی آئیڈیالوجی پر جتنی آج توجہ دی جارہی ہے، اتنی پہلے کبھی ممکن نہ تھی۔ تنقید کے اس کثیر جہتی رخ کو تھیوری اور ادبی تھیوری نے مشکل کیا ہے۔ ادبی تھیوری، کسی ادبی یا ثقافتی متن میں معنی کے قیام کے لائحہ عمل کی وضاحت کرتی ہے۔ معنی کیا ہے؟ ادبی متن میں معنی کیسے قائم ہوتا ہے؟ کیا ادبی متن میں معنی اکہری اور واحد حالت میں ہوتا ہے؟ یا اس میں کثرت پائی جاتی ہے؟ معنی کی کثرت سے کیا مراد ہے؟ متن میں معنی کے قیام کی نفسیاتی، سماجی اور تاریخی جہات کیا کیا ہیں؟ یہ سارے سوالات "وجودیات"(Ontology) کے

شعبے سے تعلق رکھتے ہیں اور تھیوری کی مباحث کے تحت سامنے آئے ہیں۔ وجودیات، مستقل طور پر فلسفے کا شعبہ ہے، جو اشیاء اور مظاہر کی حقیقت سے بحث کرتا ہے۔ اشیاء کی حقیقت کیا ہے اور یہ اپنی اصل میں کس نوعیت کی حامل ہیں، اس سے بحث کرنا فلسفیانہ عمل ہے۔ فلسفہ، اشیاء و مظاہر کی حقیقت کے ادراک کا نام ہے۔ لہٰذا نظریہ اور آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ادبی تنقید کی مباحث میں تبدیلی، دراصل ادب اور دوسرے علوم انسانی (Humanities) کے باہمی انسلاک کا نتیجہ ہے۔ ادبی نظریے پر اصرار فلسفے اور ادب کے بین العلومی ارتباط کا حاصل ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیرؔ، نے تنقید کے تقابل میں مذکورہ تبدیلی کو "انقلابی نوعیت" کی حامل قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> "گزشتہ چند دہائیوں میں تنقید کے مفہوم اور مقصد میں انقلابی نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں۔ یہ تبدیلیاں بڑی حد تک معاصر سائنسی اور سماجی علوم میں ہونے والی غیر معمولی پیش رفت سے ہم آہنگ بھی ہیں اور ان کا نتیجہ بھی۔ واضح رہے کہ تنقید ابتدا ہی سے معاصر علوم سے وابستہ رہی ہے اور اس سے بصیرتیں اخذ کرکے ادب کی تعبیر اور تجزیے کی ذمہ داری نبھاتی رہی ہے، مگر علوم میں تعقلات اور طریق کار کی سطح پر انقلابی تبدیلی پیش رفت ہوئی ہے اور تنقید نے ان دونوں سطحوں پر اثرات قبول کیئے ہیں۔ جو لوگ معاصر علوم اور ان سے تشکیل پانے والی، روحِ عصر، سے بے خبر یا لاتعلق ہیں، انھیں معاصر تنقید کے مفہوم اور مقصد کو سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ معاصر تنقید کی امتیازی جہت، اس کا بین العلومی ہونا ہے۔ بین العلومیت ایک اعتبار سے موجودہ زمانے کی "اے پس ٹیم" کی بھی امتیازی جہت ہے۔" (۱)

موجودہ زمانے کی ،اے پس ٹیم، نظریے پر توجہ مرکوز رکھتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معاصر عہد میں نظریات کی گرم بازاری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اس عہد کو "نظریات کے تصادم" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "سیموئیل پی ہن ٹنگٹن" (Samuel P Huntington) نے جسے "تہذیبوں کے تصادم" (Clash

کا نام دیا ہے، وہ دراصل نظریوں کا تصادم ہی ہے۔ مختلف اور متنوع تہذیبوں کی تشکیل of Civilization) متفرق نظریات اور تصورہائے کائنات کی بنا پر ہوتی ہے۔ لہٰذا اس عہد میں زندگی کا کوئی بھی شعبہ بالعموم اور ادب وادبی تنقید بالخصوص نظری، نظریاتی یا اصولی وابستگی سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔

ادبی تنقید(Literary Criticism) ، مستقل طور پر دو شعبوں میں منقسم ہے۔ **ایک: نظری تنقید (Theoretical Criticism)،دوسری: عملی یا اطلاقی تنقید(Applied Criticism)**۔ یہ دونوں شعبے آپس میں باہم منسلک ہیں۔ متن کی عملی تنقید جس نظریے یا اصول کو مدِ نظر رکھ کر سر انجام دی جاتی ہے، وہ نظریاتی تنقید ہے۔ لہٰذا مراتب کے لحاظ سے نظری تنقید کو عملی تنقید پر اولیت حاصل ہے۔ سادہ الفاظ میں: "وہ اصول، رسمیات اور تناظرات جو ادبیات کی تفہیم و تعبیر کی غرض سے وضع کیئے جائیں، نظری تنقید کہلاتی ہے۔" نظری تنقید میں جو اصول وضع کیے جاتے ہیں، وہ ادب اور غیر ادب کے افتراق میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اُسے اصطلاح میں "تعین قدر" کے مسئلے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ معاصر ادبی منظر نامے میں جسے فن پارے یا متن کی شعریات(Poetics) سے موسوم کیا جاتا ہے، وہ بھی نظری، تنقید سے مرتبط ہے۔ شعریات، متن یا ادب کی تشکیلی حالتوں، رسمیات اور اُن اصولوں کی دریافت سے عبارت ہے، جو اسے بناتے یا تشکیل دیتے ہیں۔ نظری تنقید کی تعریف کرتے ہوئے "میئرہاورڈ ابرامس"(Meyer Howard Abrams) نے لکھا ہے:

> "Theoretical Criticism undertakes to establish on the basis of general principles, a coherent set of terms, distinctions and categories to be applied to the consideration and interpretation of work of literature as well as criteria (The standards and norms) by which these works and their writers are to be evaluated". (2)

میئرہاورڈ ابرامس، نے نظریاتی تنقید کو اصولوں کے ایک ایسے مجموعے سے عبارت بتایا ہے، جن کو مد نظر رکھ کر نقاد، کسی ادبی یا ثقافتی متن کی تعبیر کر سکتا ہے۔ مزید یہ کہ نظریاتی تنقید کی بنا پر اخذ شدہ اصول ہی عملی تنقید

کے مرحلے میں تعین قدر کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ ابوالکلام قاسمی نے نظری تنقید کے بنیادی تعلق کی وضاحت اپنے ایک اہم مضمون: "ادبی تنقید کی نظریاتی بنیادیں" میں تفصیل سے کی ہے۔ نظری تنقید وضاحت، اور اسے اطلاقی تنقید سے الگ کرتے ہوئے، لکھتے ہیں:

> "اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ تنقید کا کوئی بھی عمل اپنے پس منظر میں اصولی اور نظریاتی بنیادیں ضرور رکھتا ہے۔ اس بات کو عام فہم انداز میں اس طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ کہ اگر ہم کسی فن پارے میں شعری تدبیروں اور شاعرانہ صنعتوں کی نشاندہی کرنا چاہیں، تو ان کا پس منظر یہ ہو گا کہ شاعرانہ ذہن کیوں کر اشیاء میں مماثلتیں تلاش کرلیتا ہے؟ وہ کیسے مختلف حقائق کے اسباب علل میں تبدیلی یا حُسن پیدا کر کے اپنے بیان میں لطف اور کشش پیدا کرتا ہے، یا یہ کہ رمز و کنایہ اور اشارے کا استعمال کیوں کر سامنے کے متعین معنوں کے ساتھ دوسرے معنوں کا امکان پیدا کر دیتا ہے؟ ان باتوں میں اول الذکر پس منظر سے تشبیہ یا استعارہ پیدا ہوتا ہے، ثانی الذکر کے باعث حسن تعلیل کی صنعت عمل میں آتی ہے اور موخر الذکر پس منظر، فن پارے کو زمان و مکان کی تبدیلی کے باوجود بامعنی رکھتا ہے۔ یہ تمام رویے شعری تنقید کے لیے نظری بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ یہی رویے جب اطلاقی سطح پر تنقیدی عمل سے مربوط ہو جاتے ہیں تو فکری یا نظریاتی سطح پر اس کے سرچشمے انسانی زندگی یا تہذیب و ثقافت سے پھوٹے ہوئے محسوس ہونے لگتے ہیں۔" (۳)

ابوالکلام قاسمی کی وضاحت کے مطابق، کوئی بھی اطلاقی تنقید، چاہے وہ تاثراتی نوعیت کی ہی کیوں نہ ہو، اصولوں اور نظریات سے مبرا نہیں ہوتی۔ ہر نقاد اپنی ذہنی سطح اور تعصبات کی بنا پر ادب اور متن کی تفہیم کے کچھ اصول و نظریات وضع کرتا ہے اور عملی مطالعے میں ان کو مدِ نظر رکھ کر رائے قائم کرتا ہے۔ یہ اصول اُس کے

تجربے ومشاہدے، تاریخی صورت حال، سماجی پس منظر مطالعات اور تعصبات کی دین ہوتے ہیں۔ ہمیں یہاں ان اصولوں کے درست یا نادرست ہونے سے سروکار نہیں۔ صرف اس امر کی وضاحت مقصود ہے کہ کسی فکری پس منظر اور نظریاتی سیاق کے بغیر اطلاقی تنقید کا امکان نہیں ہے۔ یہی فکری اور نظریاتی پس منظر تنقید کے نظری تناظر سے عبارت ہے۔ اسی بنیاد پر بعض ناقدین نے نظری تنقید کو عملی تنقید پر فوقیت دی ہے۔ حسن اختر ملک، نے لکھا ہے: "نظریاتی تنقید کی اہمیت عملی تنقید سے اس لحاظ سے زیادہ ہے کہ نظریاتی تنقید کی روشنی میں ہی عملی کی جاسکتی ہے۔ نظریاتی بحث سے تنقید کے وہ اصول اور قوانین معرضِ وجود میں آتے ہیں جو عظیم ادب کی پیدائش میں مُمد ثابت ہوں"۔ (۴) ڈاکٹر عبارت بریلوی نے تنقید کے نظری پہلو کی اہمیت کو عظیم ادب اور آرٹ کی تخلیق سے جوڑا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ تنقیدی نظریات ادب اور آرٹ کی تخلیق کے لیے ماحول بناتے اور فضا کو ساز گار کرتے ہیں۔ اس سے فن کاروں کو تخلیقی عمل کے دوران درست سمت کا پتہ چلتا ہے۔ (۵)

معاصر عہد میں نظری تنقید (عملی تنقید سے ہٹ کر بھی) اپنے ایک مستقل وجود کی حامل نظر آتی ہے۔ تنقید کے جس فلسفیانہ رُخ کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، اُس نے علم، دانش، سماج، مقتدرہ سے بحث کے حوالے سے نظری تنقید کو ایک فکری میدان فراہم کیا ہے جس میں وہ ان موضوعات پر بحث کرتی اور سوال اٹھاتی نظر آتی ہے۔ عالمی اور اُردو تنقید میں تھیوری کے ذیل میں جو نئے مباحث وارد ہوئے ہیں، انھوں نے تاریخ، سماج اور اس کی جدلیات، نوآبادکار کی حکمت عملیوں، ماحول اور فرد کے روابط اور عورت کے وجود واختیار کے ضمن میں جن سوالات کو اٹھایا اور بحث کا مستقل حصہ بنایا ہے، وہ نظری تنقید کی اہمیت کو دوچند کرتے ہیں۔ نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی تنقید، استعمار زدہ آبادیوں میں نوآبادکار کے ہتھکنڈوں، رویوں اور حکمت عملیوں کو خالص عملی اور تاریخی بنیادوں پر منکشف کرتی ہے۔ ماحولیاتی تنقید نے فرد اور کائنات (فطرت) کے باہمی رشتے کی تفہیم کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس ذیل میں وہ ماحولیاتی بصیرتوں سے استفادہ کرتے ہوئے، انسان کے فطرت سے روا رکھے گئے سلوک کو نقد کا نشانہ بناتی ہے۔ یہ نقد ایک لحاظ سے جدید انسان کے تمام وسعت پسندانہ تصورات اور

اعمال کو سوال کی زد میں لا کھڑا کرنے کے مترادف ہے۔ تانیثیت نے عورت کے وجود، اس کے اثبات اور اختیار کے ذیل میں جن مباحث کو اٹھایا ہے وہ سراسر دانش ورانہ نوعیت کی ہے۔ تھیوری کے ورود سے قبل تنقیدی دستانوی میں اتنی گنجائش ہی نہ تھی کہ وہ ان مباحث کو تنقید کا نام دے کر گفتگو کا حصہ بنا سکیں۔ اسی طرح نو تاریخیت نے تاریخ کے دو بڑے رخ، دائروی حرکت، دوزمانی حرکت اور فوکو کی ایپس ٹیم کے حوالے سے جس ڈسکورس کو وضع کیا ہے وہ متعلقاً نظریاتی نوعیت کے ہیں۔ لہٰذا اس صورت حال کے مطابق نظریاتی تنقید ادب کے محیط میں رہتے ہوئے (فن پارے پر اطلاق سے ماسوا بھی) ایک دانش ورانہ کارگزاری کی حیثیت سے سامنے آئی ہے، جس نے زبان، سماج، ثقافت، صنف، فطرت اور مقتدرہ کی تفہیم کے لیے عملی ڈسکورس کو وضع کرنے میں اہم کردار نبھایا ہے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ اب نظری تنقید محض نظریات اور اصولوں کو بحث کا حصہ بنانے کا عرصہ (Space) نہیں رہی، بل کہ اب وہ "نظریہ سازی" (Theorization) کا میدان ہے۔ ژاک دریدا کی مثال سامنے کی ہے، جس نے انسان کے طرز عمل سے پوری مغربی فکر کی تاریخ میں "ثنویت پسندانہ" (Dualistic) رویے کا انکشاف کیا۔ ژاک دریدا، نے افلاطون کی کتاب "Pheadrus" میں الفاظ کے استعمال اور معنی کے کھیل کی وضاحت سے، شناخت کے سلسلے میں یورپی رویے کی وضاحت کی، جو اشیا کو جوڑوں میں بانٹ کر" غیر"(The Other) کی تخلیق کا باعث ہے۔ یورپ کے اسی فکری رویے نے متخالف جوڑے (Binary opposition) پیدا کیے اور شناخت کے ضمن میں حاکم، محکوم، عورت و مرد، ہندوستانی، یورپی، سفید و کالے وغیرہ کی ثنویتوں کو وضع کیا۔ دریدا کی اس دریافت کو " قاضی افضال حسین " نے مغرب کی دو ہزار سالہ فکری تاریخ کے اساسی حوالے سے موسوم کیا ہے۔[٦] ایڈورڈ سعید، اورن دھتی رائے، ٹیری ایگلٹن وغیرہ کا بنیادی اظہار یہ ادبی تنقید کے شعبے سے متعلق ہے، تاہم وہ سماجی دانش ور کے عنوان سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ناقدین مقتدرہ، طاقت اور سماج میں طاقت کے بہاؤ کے بیانیوں پر تنقیدی آراء اور نظریات رکھتے ہیں جن کی مدد سے یہ تاریخ اور ادب کے علاوہ معاصر عہد کی تفہیم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

اُردو میں نظری تنقید کے ابتدائی نقوش تذکروں میں نظر آتے ہیں، تاہم تذکروں کے تنقیدی بیانات خاصے دھندلے ہیں۔ دھندلے اور غیر واضح ہونے کے علاوہ یہ بیانات نہ صرف یہ کہ ترقی یافتہ نہیں بل کہ تقلیدی نوعیت کے ہیں۔ تقلیدی سے مراد یہ ہے کہ، ان کی تنقیدی روش فارسی ادبیات سے مستعار ہے اور ان میں کوئی ایسا اجتہادی رویہ نظر نہیں آتا جس نے انھیں فارسی تذکروں کی روایت سے ممتاز بنایا ہو۔ فارسی اور عربی انتقاد کے تطابق سے یہ تذکرے طرزِ ادا، علم بیان وبدیع کی مباحث اور علم معانی سے سروکار رکھتے ہیں۔ تاہم بیاضوں میں رائج طریقہ کار سے زیادہ تذکروں کے مندرجات میں تنظیم وترتیب کا خیال رکھا گیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ تذکروں کی تنقید میں ترقی ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ فرمان فتح پوری نے انیسوی صدی کی تذکرہ نگاری کو دستاویزی شہادتوں اور شعری حوالوں کی مناسبت سے بیاض سے آگے کی چیز قرار دے کر ادبی تاریخ، ادبی تنقید اور ادبی سوانح نگاری کی جانب جست قرار دیا ہے۔(۷) یاد رہے کہ تذکروں کو تنقیدی شعور کی ابتداء کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ اگر اسے آج کے نظری اور تنقیدی معیاروں کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، تو ظاہر ہے وہ پورا نہیں اتریں گے۔

ادبی تنقید کی سنجیدہ نظری تنقید کا ابتدائی دور مولانا محمد حسین آزاد کے لیکچروں، اور بعد ازاں حالی کے مقدمہ شعر وشاعری سے متشکل ہوتا ہے۔ اس عہد میں اردو تنقید کے نظریہ ساز مغربی افکار سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اسے نو آبادیاتی اثرات کے تحت تاثیر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس عہد کی ادبی تنقید میں باقاعدہ ایک اٹھان نظر آتی ہے جو تذکروں کی تنقید سے بہت مختلف اور فکری حوالے سے وسعت یافتہ ہے۔ ڈاکٹر عزیز ابن الحسن نے حالی کو اردو کے پہلے جدید تجزیاتی نقاد اور نظریہ ساز کے عنوان سے یاد کیا ہے۔(۸) حالی نے شاعری کی استعداد، شعر کی ماہیئت، شاعری کی شرائط، شعر کی تاثیر، شاعری اور غیر شاعری میں فرق، اصناف کی استعداد اور شعری خوبیوں اور نقائص پر تفصیلی مباحث کیں اور اردو میں نظریہ پردازی کا عمل سرانجام دیا۔ ان کے انتقادی نظریات مشرق ومغرب سے مستعار سہی، تاہم انھوں نے پہلی مرتبہ اردو کی شعری روایت کو

ایک منظم بحث کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر نقاد نے انھیں اپنے عہد کا بہترین اُردو نقاد مانا ہے اور مقدمے کے خصائص کو تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اپنے زمانے، اپنے ماحول، اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ لائقِ ستائش ہے۔ حالی صرف اردو تنقید کے بانی ہی نہیں، اس وقت کے بہترین اردو نقاد بھی ہیں"۔(۹)

اُردُو تنقید کی نظریاتی مباحث میں شعر و شاعری کو ناقدین نے موضوعِ بحث بنائے رکھا۔ حالی کے بعد شبلی نعمانی نے اپنا نظریۂ شعر پیش کیا۔ انھوں نے شاعری میں جن دو امور کو اہمیت دی۔ وہ محاکات، اور تخیل، سے عبارت ہیں۔ محاکات، سے شبلی کی مراد "شعری پیکر تراشی"(Poetic Imagery) ہے، یعنی شعر میں ایک شے کو اس طرز پر ادائیگی کا حصہ بنایا کہ اُس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ تخیل کی قید نے، شبلی کے نظریۂ محاکات میں ایک تخلیقی جست کے ناوصف، ارسطو کے نظریۂ محاکات کی ایک ترقی یافتہ صورت کو پیش کیا۔ شبلی کے بقول، تخیل مسلم اور طے شدہ باتوں کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتی بل کہ دوبارہ ان پر تنقیدی نظر ڈالتی ہے اور بات سے بات پیدا کرتی ہے(۱۰)۔ مزید یہ کہ حالی نے انشاء پردازی میں الفاظ کو کلیدی اہمیت سے ہم کنار کیا۔ اس دور کی نظری تنقید میں پہلی دفعہ لفظ و معانی کی مباحث کو مکالمے کا حصہ بنایا گیا۔ شعر کا اخلاقی تصور بھی اسی عہد میں سامنے آتا ہے۔ حالی و شبلی کے بعد امداد امام اثر کا نام قابل ذکر ہے۔ زمانی حوالوں سے، امداد امام اثر کو حالی کے بعد شبلی پر برتری حاصل ہے۔ ان کی کتاب، "کاشف الحقائق"، جو کہ ۱۸۹۷ء میں سامنے آئی۔ انھوں نے اپنے نظریۂ شعر کی پرداخت میں مشرق و مغرب کے تنقیدی میلانات سے استفادہ کیا۔ کاشف الحقائق، کے سرورق پر لکھا جملہ: "دربیان شاعری مصر و یونان وایطالیہ و عرب" اس امر کی دلیل ہے۔ اثر، کے تنقیدی نظریے میں جن امور کو اہمیت حاصل ہے ان میں ایک یہ ہے کہ وہ اولاً شعر کو اسلامیانے کی سعی کرتے اور شعر و شاعری کی حقیقت کو صداقت میں منحصر گردانتے ہیں۔ یہ وصف بادی النظر میں اُن کے ہاں: "ابو علی حسن بن رشیق القیروانی

یا المسیلی"(Abu Ali Hasan Bin Rasiq Al-Kairwani or Al-Masili) کے نظریۂ شعر سے استفادہ معلوم ہوتا ہے، جو کلام کی صداقت کو کتاب اللہ سے اس کی تطبیق میں منحصر گردانتا ہے۔ اثر کے نظریے کی سب سے اہم جہت، جسے اُردو تنقید میں اُن کی دریافت سے موسوم کیا جانا چاہیے، وہ یہ ہے کہ اثر عالم کو دو حصوں یعنی عالم درونی اور عالمِ بیرونی میں تقسیم کرتے ہیں۔ وہاب اشرفی نے اسے اثر کو اولیات میں سے قرار دیا ہے۔[۱۱] اثر کے نزدیک شاعری کا معروضی (Objective) پہلو عالم فی الخارج، جبکہ موضوعی (Subjective) پہلو، داخلی دنیا، سے مخصوص ہے۔ یوں اثر کے نظریے نے اردو تنقید میں پہلی دفعہ شاعرانہ موضوعات کی ترتیب بندی کرتے ہوئے داخلیت اور خارجیت کی نظری بحث کا آغاز کیا۔

مارکسی ناقدین نے کارل مارکس کی " جدلیاتی مادیت "(Dialectical Materialism) سے مستفید ہو کر شعر وادب کو مادی ومعروضی بنیادوں پر نظریہ پانے کی کوشش کی۔ انھوں نے ادب کو طبقاتی کش مکش پر اظہار سے مخصوص کرنا چاہا۔ اپنی اصل میں یہ بھی ادب کا ایک اقداری نظریہ ہے۔ اس حوالے سے اختر حسین رائے پوری، سید سجاد، مجنوں گورکھ پوری اور سید احتشام حسین کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ ان ناقدین نے اپنے اپنے اختصاص اور اسلوب کے ساتھ مارکسی تصورِ کائنات سے استفادہ کرتے ہوئے ادب اور زندگی کے باہمی رشتے کے مباحث کو اردو تنقید کے متن کا حصہ بنایا اور سماجی واقتصادی امور کو ادبیات کے ضمن میں اہمیت سے ہم کنار کیا۔ ان ناقدین نے تاریخی اور سماجی حقیقت کے ذیل میں ادب میں ہیئت اور مواد کے باہمی تعلق پر مباحث کا آغاز کیا۔ مارکسی اور ترقی پسند ناقدین کی کاوشوں نے اردو تنقید کو ایک نئی جست دی، جس کے باعث یہ سوانحی، تاثراتی وتشریح انداز سے آگے بڑھی اور اس نے سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی۔ نظری سطح پر اُردو تنقید میں پہلی مرتبہ ادب کے تصور کو مادی بنیادوں پر استوار کیا گیا۔ جس سے نظریۂ ادب کو نہ صرف وسعت ملی، بل کہ اندازِ نظر میں تبدیلی رونما ہوئی۔ ان ناقدین نے پہلے زندگی اور ادب کے مسئلے پر خوب نظری مباحث کیں، بعد ازاں اس بنیاد پر، زندگی کے کلیدی مادی کردار پر زور دیا۔

ادبی تنقید کے جمالیاتی تناظر نے بھی نظریاتی پہلو پر خاصی توجہ مرکوز رکھی۔ رومانوی اور جمالیاتی نقادوں نے حُسن، حُسن کی ماہیئت، اس کے تاثر پر خصوصی طور پر مکالمہ کیا۔ انھوں نے مادی حُسن اور مجرد حُسن میں افتراق کیا۔ جمال کا سر چشمہ کہاں ہے؟ جمال یا حُسن اضافی ہے یا مطلق؟ جمال اور خبر کا آپس میں کیا ربطہ ہے؟ جمال کی قدر زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اور اس طرز کے دیگر سوالات کے ساتھ جمالیاتی ناقدین نے حُسن اور جمال کے انکشاف کے بنیادی مسئلے کے ساتھ ادبی نظریے کو پر اون چڑھایا۔ یوں تو فلسفۂ حُسن (جمالیات) کے ادبی مباحث کا آغاز مغرب سے ہوتا ہے، پہلی دفعہ "بام گارٹن" نے اس لفظ کو استعمال کیا، اور ہیگل نے باقاعدہ اس پر فلسفیانہ مباحث پیش کیں، تاہم بعد ازاں، کروچے نے اِس میں اضافے کر کے اپنے فلسفہ اظہاریت سے اِسے منسلک کیا۔ ہندوستان اور یہاں کی مقامی ادبی روایات کا حُسن و جمال سے بہت قدیم رشتہ ہے۔ یہ رشتہ محض تاثراتی نوعیت کا نہیں ہے، بل کہ باقاعدہ فلسفیانہ نوعیت کا ہے۔ قدیم سنسکرت ادبیات میں اس کا نظریہ اس امر پر دال ہے، جسے بھرت منی نے "ناٹیہ شاستر" میں تیسری صدی قبل مسیح میں پیش کیا تھا۔ ادبیاتِ عالم کی تاریخ کے دقیق مطالعے کے بعد آپ اس نکتے کے انکشاف پر مجبور ہو جائیں گے کہ ،رَس (Rasa) جیسا گہرا، پُر از کیفیت نظریہ دنیا کی کسی ادبی روایت میں موجود نہیں۔ "کیسی ئس لانجائنس" (Cassius Longinus) کا نظریۂ ترفع (The Theory of Sublime)، اپنی شدت، کیفیت اور گہرائی میں ،رَس، کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، اُس نباتات کا بنیادی ترین عرق ہونے کی مناسبت سے ،ادبی تخلیق سے اخذ ہونے والا بنیادی ترین معانی، جذبہ یا کیفیت ہے، جو تخیل اور احساس کو ماورائی، حسی، ہر دو تجربات سے گزارتا ہے۔ میر اجی اس متعلق رقم طراز ہیں: "اس کا کام کیف ایک تسکین ذہنی ہے، ایسی تسکین جس میں احساس ذہنی ہر شے سے ہٹ کر ایک مرکز پر کام کر رہا ہو۔ کسی بات میں کھوٹے سے احساس کیف حاصل ہو جاتا ہے، خواہ وہ غم ہی کیوں نہ ہو"۔ [۱۲]

رَس (Rasa)، جمالیات کا اعلیٰ ترین تجربہ ہے، جو صرف ادب تک محیط نہیں، بل کہ یہ پھیل کر کے تمام فنونِ لطیفہ کو محیط ہے۔ یہی نہیں، اس نظریے کے ناقدین رَس کی وسعت کو پوری تہذیب پر اطلاق کرتے

ہیں۔(۱۳) ہندوستانی شعریات میں رَس کے نظریے کی موجودگی نے اردو ہندی اور دیگر مقامی ادبی روایتوں کو جمالیات کی اعلیٰ ترین سطح سے ہم کنار ہونے کی مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ اگرچہ اردو کی تنقیدی روایت نے اس سے خاطر خواہ استفادہ نہ کیا۔ تاہم اس نظریے کے آثار ہمیں اردو تنقید کی روایت میں نظر آتے ہیں۔ استفادہ نہ کرنے کی بنیادی وجہ اردو ادب کا شروع میں فارسی، عربی روایت سے، اور بعد ازاں کلی طور پر مغرب کی طرف مائل ہونے کا رویہ ہے۔ بہر حال، جمالیاتی تناظر میں اردو ناقدین میں میر اجی، نیاز فتح پوری، مہدی افادی، عابد علی عابد کے اسماء اہم ہیں۔ نفسیاتی و عمرانی تناظرات نے بھی جدید نفسیات اور سماجیات کے انکشاف کی بنیاد پر ادبی تنقید میں مخصوص نظریات کو پروان چڑھایا۔ نفسیاتی تنقید کے اثرات کے تحت اردو تنقید میں فرائیڈ، یونگ، ایڈلر وغیرہ کے نظریات کا بہت شہرہ رہا۔ تحلیل نفسی، ایڈی پس کمپلیکس، شعور، تحت شعور اور لاشعور، نظریہ ج،بلت کے مباحث کی رُو سے اردو ادب میں نظری مباحث کا ایک خاصہ طویل مکالمہ موجود ہے۔ اڈ، سپر ایگو، ایگو، لبیڈو، جنسی انرجی، احساسِ کم تری، فردی اور اجتماعی لاشعور کے نظریات، نے ادبی تناظر کے طریقہ ہائے کار میں نئی تبدیلیاں قوع پذیر کیں۔ اب نثری اور شعری ادب کی عملی تنقید میں نظری بنیادوں پر استوار، ان رجحانات کے آثار نظر آنے لگے۔ اپنے مضمون "اُردو تنقید کا نفسیاتی دبستان" میں ریاض احمد لکھتے ہیں:

> "نفسیاتی تنقید نے ہمیں بتایا ہے کہ ان ظاہری اور پیش پا افتادہ معنی کے پیچھے ایک ایسے شخصی اور اجتماعی محرکات کی ایک وسیع دنیا کار فرما ہوتی ہے جو نوعیت کے اعتبار سے زیادہ تر غیر شعوری ہوتے ہیں۔ انہیں عوامل کی تفہیم خواہ وہ غیر شعوری ہی کیوں نہ ہو، ادب کو معنوی حُسن اور تاثیر بخشتی ہے۔ نفسیاتی تنقید کے زیر اثر بعض عالمگیر عوامل مثلاً جنس، بعض نفسیاتی الجھنیں مثلاً اوڈی پس کمپلیکس، احساس کم تری، بعض نفسیاتی گمراہیاں مثلاً ایذا پرستی یا ایذا دہی وغیرہ ایسی چیزیں ہیں، جن کے مظاہر ادب میں بالعموم نظر آنے لگے ہیں"۔ (۱۴)

اُردو تنقید میں نظریاتی تناظر کی نظری مباحث کو ریاض احمد، عبد العلیم، شکیل الرحمان، سلیم اختر وغیرہ نے فروغ دیا۔ حسن عسکری نے اُردو تنقید میں باقاعدہ نظریہ سازی کی کوشش کی۔ حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ حسن عسکری نے بہت بنیادی نوعیت کے سوالات اٹھائے اور ان کے جوابات اُردو کی طویل ادبی روایت کے مزاج سے اخذ کرنے کی کوشش کی۔ اُن کا بنیادی سوال "روایت" اور "ادبی روایت" کے متعلق تھا۔ روایت کے سوال کے ذریعے حسن عسکری نے، بقول قاسم یعقوب، ادب کی روایت یا دوسرے لفظوں میں ادب کے اصول مرتب کرنے کی کوشش کی۔ (۱۵) حسن عسکری نے اپنے نظریۂ روایت کی بنیاد مشرقی ادب کی مابعد الطبعیاتی جہت میں تلاش کی۔ شمس الرحمن فاروقی، نے مغرب کی جدیدیت میں اپنی طرف سے اختراعی نوعیت کی تبدیلیاں سرانجام دے کر ادب میں نظری مباحث کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کیا۔ اُن کے اٹھائے گئے مباحث میں اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ جدید فرد کی وجودی کیفیات، تنہائی اور تشکیک کے منکر نہیں، تاہم اسی پر کلی انحصار بھی نہیں کرتے، جیسا کہ جدیدیت کی عمومی روش ہے۔ اس کے ساتھ وہ روایت اور کلاسیکی ادب کی شعریات کا احیاء بھی کرتے ہیں۔ مابعد جدید نظریہ سازوں میں: "گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، قاضی افضال حسین، وزیر آغا اور ناصر عباس نیّر" کے نام قابل ذکر ہیں، جنھوں نے اردو ادب میں جدید ترین نظری مباحث کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ "قاسم یعقوب، ابوالکلام قاسمی، محمد نعیم، سرور الہدی" کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

ادبی تنقید کی تاریخ کا غائر مطالعہ اس امر کے انکشاف میں معاون ہے کہ مختلف ادبی نظریات اور تھیوریاں ایک دوسرے سے اخذ و اکتساب بھی کرتی ہیں، اور رد و انحراف کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی ادبی تھیوری یا نظریہ آنِ واحد میں وجود میں آجائے اور اس کے سیاق میں کوئی تاریخی پس منظر یا دیگر ادبی نظریات سے زیادہ یا کم استفادے کی صورتیں موجود نہ ہوں۔ اس امر کو مزید واضح کرنے کے لیے، متن کی تشکیل کے متعلق "بین المتونیت" (Intertextuality) کے موقف پر نظر کرنی چاہیے۔ بین المتونیت کا ماننا ہے کہ کوئی بھی متن مجرد انفرادیت کا مجموعہ نہیں، بل کہ یہ ماقبل متون سے اخذ و استفادہ کر کے وجود میں آتا ہے۔ اس میں

دوسرے متون کے اثرات ہوتے ہیں۔ رولاں بارتھ کے الفاظ میں :"متن اقتباسات کا ایسا حلیہ ہوتا ہے، جو تہذیب کے بے شمار مراکز سے مل کر تیار کیا جاتا ہے"۔[۱۶] متن کی طرح تنقیدی نظریات بھی ماقبل نظریات کو یاتو رد کرتے ہیں، یا ان کے اثرات قبول کرتے ہیں۔ یا اُن نظریات کے خلا کو پُر کرکے اضافہ کرتے ہیں۔ نو تاریخیت کے نظریے کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے بعد آزادی خیال کی تحریک نے زور پکڑا۔ اس نے مذہب اور مذہبی شدت پسندانہ تصورات کو پس پشت ڈالنے اور خالص عقلی و تحلیلاتی بنیادوں پر سوچنے کے عمل مہمیز دی۔ زندگی کے ہر شعبے کی طرح ادب نے بھی بڑی سرعت سے ان نئے تصورات کی معنویت کو قبول کیا۔ یوں بھی ادب کی تشکیلی ساخت آزادی اور انتخاب کے حق جیسے عناصر پر اصرار سے عبارت ہے۔ انیسویں صدی عیسویں میں ادب نے رومانویت کے زیر اثر نعرہ آزادی بلند کیا۔ اس نعرے نے ادب میں تخیل (Imagination) کے مظہر کو بنیادی قدر کے طور پر متعارف کرانے میں تاریخی کردار ادا کیا۔ اِن حالات میں ادب میں تاریخ، ثقافت اور ماحول کی اہمیت خاصی مدھم ہوتی چلی گئی۔ لہٰذا" چارلس سینٹ بیو" (Charles Sainte-Beuve) اور "ہیپولائٹ طین"(Hippolyte Taine) (جیسے اُردُو دان عموماً:" ساں بویا بیو اور طین " لکھتے ہیں ، جیسا کہ "سجاد باقر رضوی" نے اپنی معروف کتاب:" مغرب کے تنقیدی اُصول" میں لکھا۔ بے جا اُردُو انا رنگ دے کر۔)ادبی تخلیق کی فہم وافہام کے ذیل میں تاریخ اور تاریخی عمل کی معنویت پر اصرار کیا اور من مانی(Arbitrary) تعبیرات کا راستہ مسدود کرنی کی کوشش کی۔ ادب میں تاریخی عمل پر اصرار کی یہ پہلی باضابط اور منظم کوشش تھی۔ طین، کا ماننا تھا کہ کوئی بھی ادبی فن پارہ ایک مخصوص عہد، نسل، ماحول اور ایک مخصوص لمحے کی تخلیق ہوتا ہے اور یہ کہ فن پارے ان حدود سے نہیں نکل سکتا۔ لہٰذا اُس نے فن پارے کی تخلیق میں تین اساسی عناصر کو نشان زد کیا۔ جو کہ یہ ہیں:

۱. نسل(Race)

۲. ماحول(Milien)

۳. لمحہ(Moment)

ان عناصر پر اصرار، یا الفاظ دیگر فن پارے اور فن کار کی تاریخی صورت حال پر زور دینا ہے۔ سجاد باقر رضوی نے طین کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے سانحات اور سانحات سے متاثر ہونے والے افراد کو نسل، ماحول اور لمحے کے تجزیے سے سمجھا جاسکتا ہے اور یوں طین کا طریقہ کار تاریخ اور سوانح حیات دونوں کے لیے مفید ہے۔ چونکہ طین کی نظر میں ادب اس ذہن کی تخلیق ہوتا ہے جو گردوپیش کے واقعات وسانحات، نسلی مزاج اور لمحے کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالتا ہے۔ لہذا یہ طریق کار ادب کے مطالعے کے لیے بھی اہم ہے"۔ (۱۷)

"ہیپولائٹ طین"، کے نظریے اور "چارلس سینٹ بیو" کے طریقہ کار نے تاریخی تنقید کے دبستان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ تاریخی تنقید نے ادب کے فنی پہلوؤں کی بجائے اس کی تاریخی صورت حال کو کلیدی اہمیت دے کر منظر نامے پر اجاگر کیا۔ بیسویں صدی میں مارکسی تنقید نے مادی جدلیات کے تصور کی رو سے تاریخ کو پھر سے مرکز میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اگرچہ انھوں نے تاریخ کو اپنے مخصوص معاشی زاویے کی بنیاد پر مادی تناظر میں دیکھنے کی سعی کی۔ تاہم اس امر میں کوئی شک نہیں کہ مارکسی تنقید کا ایک رُخ تاریخی تنقید سے استفادے کی صورت میں تشکیل ہوتا ہے۔

جدیدیت کے ظہور نے ادب کے فنی اور لسانی وہیئتی پہلوؤں کو از سر نو جِلا بخشی۔ ہیئتی تنقید، نئی تنقید اور روسی فارملزم نے ادبیات کا اساسی مقصد "فارم" (Form) اور ہیئت کی تاریخی، ندرت کو قائم رکھنے میں محصور کر دیا۔ ان کے مطابق، بقول ڈاکٹر محمد حسن "اس تازگی کا کوئی تعلق نفسِ مضمون سے نہیں بل کہ ہیئت کی مدد سے

پیدا ہونے والی کیفیت سے ہے اور اس تازگی کو برقرار رکھنے کے لیے مختلف تکنیک اور اسالیب استعمال کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ادبی تنقید کو اپنی تمام تر توجہ ہیئت کے اندر پائے جانے والے مختلف رشتوں اور رابطوں پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ اور ادب اور سماج (یا اردگرد کی زندگی کے تقاضوں) سے ادب کے تعلق کو بالکل نظر انداز کر دینا چاہیے"۔(۱۸) اس سے یہ ہوا کہ ادبی تنقید محض لفظ و تراکیب، معنیات، صوتیات، تمثال اور صرف و نحو میں مقید ہو کر رہ گئی۔ ثقافت، سماج اور تاریخ کو یک سر فراموش کر دیا گیا۔ یہاں اِس نکتے کی طرف اشارہ کر کے آگے بڑھنا چاہیے کہ ساختیات کا معاملہ اِس سے الگ ہے، کیوں کہ انھوں نے ثقافت کی قید کو لسانی مطالعے میں برقرار رکھا۔ زبان ایک ثقافتی تشکیل ہے۔ لہٰذا دال اور مدلول کا تعین ثقافت کے توسط سے ہوگا۔ ثقافت پر اصرار، یا الفاظ دیگر تاریخ کی اہمیت کو ایک حد تک ماننا ہے۔ **ہیئت پرستوں نے جس انوکھی صورت حال میں ادب کو دیکھنے کی سعی کی اِس کے رد عمل میں "تاریخیت" (Historicism) کا ظہور ہوا۔** اپنی اصل میں تاریخیت، جدیدیت کے سامنے آنے والے ہیئت اساس تنقیدی نظریات سے منحرف ہے۔ دوسری طرف یہ رومانویت کے مطلق متخیلہ پر انحصار کو بھی رد کرتی ہے، جس کے سبب ادب کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر دب کر رہ جاتا۔ تاریخیت، ایک تنقیدی دبستان سے زیادہ فن پارے کے تعبیر اور تعین قدر کا حربہ ہے۔ انگریزی تنقیدی روایت میں ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائی میں اس کا شہرہ رہا۔ اردو اور برصغیر پر راست برطانوی اثرات اور انگریزی ادب سے اُردو دان طبقے کی دل چسپی کے باعث، برطانوی دھاوے کی مباحث نے اُردو تنقید میں فروغ حاصل کیا۔ تاریخیت کی بنیاد تاریخ پر ہے۔ یہ ایک ادبی فن پارے کو اُس کے تاریخی تناظر اور لمحۂ تخلیق کی مناسبت سے پرکھنے پر اصرار کرتی ہے۔ باالفاظ دیگر تاریخیت، ادب اور تاریخ کے راست، اکہرے اور مسطح ارتباط کا نام ہے۔ لہٰذا ہر وہ ادبی مطالعہ جو تاریخی اور ثقافتی سیاق کو کلی طور پر رد کر دے یا کسی دوسرے عنصر کو غالب اہمیت دے کر تاریخی پس منظر کو دھندلانے کا باعث بنے، تاریخیت کا موردِ نقد ہے۔ ادب اور تاریخ کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اس لیے تاریخ کی اہمیت سے انکار کسی طور پر بھی ممکن نہیں۔ گوپی چند نارنگ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ادبیات کا وہی مطالعہ درست اور مناسب ہے جو

سماجی اور تاریخی تناظر کے ساتھ کیا جائے۔[19] تاریخیت، کیوں کہ ادب اور تاریخ کے یک زمانی ربط پر اصرار کرتی ہے۔ اس لیے یہ ادبی مطالعے کی ایک طرز تو ہو سکتی ہے، کُل نہیں۔ اس کے تحت ادب کو محض تاریخی پس منظر میں ہی پرکھا جا سکتا ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں ادبی فن پارے میں کار فرما دیگر عناصر اور فکریات کی نفی ہوتی ہے۔ سب سے اہم یہ کہ تخلیقی عمل کے اہم ترین عنصر: "تخیل" کی نفی ہوتی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ، نے تاریخیت کے نقائص بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ طریقہ کار مطالعہ ادب کی ہمہ جہت ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ تاریخیت، ادبی معنی اور قدر کے تعیّن کو قطعی پیمانہ مہیا کرنے سے قاصر ہے۔ اس سے تنقید کے انتہائی حساس عمل تخیل کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔[20] **سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ تاریخیت، ادب پر تاریخ کو برتر قرار دیتی ہے۔** اس تناظر سے ادب کا مفعولی یا انفعالی تناظر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ (تاریخیت، کا تفصیلی تعارف باب ہٰذا کے جز "ج" میں اوپر کرایا گیا ہے۔)

نَو تاریخیت (New Historicism)، مابعد جدیدیت کے تحت سامنے آنے والے فکری اور ادبی رجحانات میں سے ایک ہے۔ **مابعد جدیدیت ہر اُس مہابیانیے (Meta Narrative) کو شکست سے دوچار کرتی ہے، جو کسی مظہر یا ادبی متن کی اکہری اور یک رُخی تعبیر کرتا ہے۔** مابعد جدید فکر نے ادبی تنقید کو فکری وسعتوں سے ہم کنار کیا۔ لہٰذا مابعد جدید طرزِ فکر سے استفادے کے باوصف، نو تایخیت نے ادب اور تاریخ کے باہمی ربط کو گہرے تسلسل سے نکال کر دو زمانی تناظر میں بدل دیا۔ تاریخیت کے تحت ادب اور تاریخ میں یک زمانی ربط پر اصرار تھا، اور تاریخ کو ادب پر فوقیت حاصل تھی۔ تاہم نو تاریخیت نے اِس ارتباط کو دو زمانی قرار دیا اور ادب کو تاریخ کے مساوی مرتبہ فراہم کرنے کی سعی کی۔ لہٰذا ادب میں مرکزیت کا تصور پگھلنے لگا۔ یوں بھی مابعد جدید کا اختصاص ہے کہ وہ مرکز جُو نہیں، بل کہ مرکز گریز ہے اور اتھارٹی کے ہر تصور کی رد تشکیل کرتی ہے۔ نو تاریخیت ادب اور تاریخ کو مساوی متن مان کر ادبی مطالعے کی راہیں باز کرتی ہے۔ نو تاریخیت اپنی اصل میں طاقت اور مقتدرہ کو چیلنج کرنے سے عبارت ہے۔ ریمنڈ ولیمز کی ثقافتی تھیوری سے استفادہ کے باوصف، یہ مقتدر ثقافت کے ہم

راہ حاشیے میں دھکیلی گئی ثقافتوں پر بھی توجہ مد کوز رکھتی ہے۔ اس حوالے سے نو تاریخی تناظر نے فوکو کے نظریات سے خصوصی طور پر استفادہ کیا ہے۔ فوکو طاقت اور اس کے بہاؤ، پاگل پن، حیاتیات، ثقافت، آرکائیو لوجی، اور سماجوں کے تاریخی عمل کے حوالے سے خصوصی نظریات رکھتا ہے۔ اُس کے نزدیک ہر عہد کی اپنی ایک "Episteme" ہوتی ہے۔ یہ وہ مقتدر رجحان ہے جو کسی مخصوص عہد کی فکری تشکیل کی وضاحت کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ لہذا فوکو کے فکری ماڈل، ریمنڈ ولیمز کی "ثقافتی مادیت"(Cultural Materialism) اور کیتھرین بیلسی کے نظریات نے نو تاریخیت کی شکل وصورت کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس تناظر نے دریدا کے نظریات سے بھی خصوصی استفادہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نو تاریخیت ،ادبی متن میں معنی اور حقیقت کو اکہرے اور واحد قائم تناظر کی بجائے کثیر جہتی حوالے سے دیکھنے پر اصرار کرتی ہے۔ (نَو تاریخیت، کا فکری اور ارتقائی تعارف بھی باب ہٰذا کے جز "د" میں تفصیلاً کروایا جاچکا ہے۔)

اُردو تنقید میں نو تاریخیت کی پہلی آواز "ڈاکٹر وزیر آغا" کی کتاب: "دستک اُس دروازے پر" میں سُنا گئی۔ یہ کتاب کسی ایک موضوع پر نہیں لکھی گئی، بل کہ مکالمے کی صورت میں زندگی اور ادب کے متنوع موضوعات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں وزیر آغا جو کہ متکلم ہیں اور کتاب میں، مَیں ، کی صورت میں ظاہر ہیں،تُو، سے کئی موضوعات اور افکار پر مکالمہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس گفتگو کے ذیل میں جہاں وزیر آغا نے کئی تنقیدی مکاتبِ فکر کے خدوخال کو تخلیقی انداز میں بیان کا حصہ بنایا ہے،وہیں تاریخیت اور نو تاریخیت کے تصور پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس گفتگو میں مقدمے کے طور پر وزیر آغا نے بیسویں صدی کے لامرکز فلسفے کو بنیاد بنا کر واحد قائم بیانیے کو چیلنج کیا ہے اور نو تاریخیت کے فکری جواز کی راہ ہم وار کی ہے۔ لامرکزیت نے جب مقتدرہ کے تصور کو پگھلایا، تو تاریخیت کے تاریخ کے متعلق اکہرے تناظر پر بھی چوٹ پڑی اور تاریخ وادب کے دوطرفہ بہاؤ پر توجہ دی گئی۔ اس دوطرفہ بہاؤ میں ہر دو ایک دوسرے کے معاون ہیں، اتھارٹی کسی کو بھی حاصل نہیں۔ وزیر آغا نے ادب کے مطالعے میں تاریخی حوالے کی اہمیت کو بھی نشان زد کیا ہے۔ آخر

میں بحث کو سمیٹتے ہوئے، تخلیقی انداز میں نو تاریخیت کو ایک نئے رجحان کے تحت متعارف کراتے ہوئے، انھوں نے دوسرے مکاتبِ فکر سے اس کا اختراق یوں پیش کیا ہے:

> "تاریخی، سوانحی تنقید نے ترازو کا پلڑا تاریخ کی طرف جھکا دیا تھا، روسی فارمل ازم، نئی تنقید اور ساختیات نے اسے عدم تسلسل کی طرف جھکا دیا۔ اب نو تاریخیت آتی ہے جس نے دونوں کو پلڑوں کو برابر کرنے کی کوشش کی ہے"۔(۲۱)

وزیر آغا نے، جن دونوں پلڑوں کو برابر یا مساوی کرنے سے تعبیر کیا ہے، وہ دراصل ادب اور تاریخ کے تئیں نو تاریخیت کے متوازن بیانیے کی جانب اشارہ ہے۔ کیوں کہ وزیر آغا نے اس کتاب میں مختلف فکری اور تنقیدی مکاتب کی طرف محض اشاروں سے کام لیا ہے، لہٰذا تفصیل کی تلاش بے جا ہے۔ تاہم اِس اشارے سے فائدہ یہ ہوا کہ اُردو تنقید میں پہلی مرتبہ نو تاریخیت کے بنیادی تصور کی قدرے وضاحت ہوئی۔ اسی اشارے نے اُردو ناقدین کو پہلی مرتبہ نو تاریخیت پر مزید مطالعے کی تشویق بھی دی۔

"ریاض صدیقی" نے سب سے پہلے نظری تناظر میں نو تاریخیت پر دو مضامین بعنوان، "نو تاریخیت" اور "اُردو تنقید کا مسئلہ اور نو تاریخیت" قلم بند کیے۔ پہلے مضمون کا محرک "وزیر آغا" کی کتاب "دستک اُس دروازے پر" ہے۔ اول الذکر مضمون ۱۹۹۳ء میں، جب کہ آخر الذکر ۱۹۹۵ء میں وزیر آغا کے ہی رسالے "اوراق" میں بالترتیب شمارہ نومبر، دسمبر ۱۹۹۳ء اور فروری مارچ ۱۹۹۵ء میں طبع ہوئے۔ "تاریخیت اور نو تاریخیت"، کے عنوان سے "پروفیسر عتیق اللہ" کا مضمون ڈاکٹر ندیم احمد کی مرتبہ کتاب، "ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت"، میں ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ "ڈاکٹر ناصر عباس نیّر" کی کتاب: "جدید اور مابعد جدید تنقید"، جدید و مابعد جدید انتقادی رجحانات کی تفہیم کے حوالے سے اساسی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں ایک مقالہ "نئی تاریخیت" کے عنوان سے بھی موجود ہے۔ یہ کتاب "انجمن ترقی اردو، کراچی" سے ۲۰۰۴ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ "وہاب

اشرفی "کا مختصر مضمون "مابعد جدیدیت- تاریخیت، نو تاریخیت " بھی ۲۰۰۴ء میں اُن کی کتاب "مابعد جدیدیت: مضمرات وممکنات " میں چھپا۔ ۲۰۰۵ء میں نو تاریخیت کے حوالے سے دو انتہائی اہم مضامین سامنے آئے۔ ایک:"ڈاکٹر گوپی چند نارنگ " کا اہم مضمون :"تاریخیت اور نو تاریخیت " اُن کی کتاب "جدیدیت کے بعد " کی زینت ہے۔جب کہ دوسرا: "پروفیسر عتیق اللہ " کا نو تاریخیت پر انتہائی اہم مقالہ "نو تاریخیت اور اس کا پیش وپس " بھی ۲۰۰۵ء میں ہی سامنے آیا۔ یہ مضمون اُن کے مضامین کے مجموعے پر مشتمل کتاب "تعصبات " میں چھپا۔ "ڈان ای۔وین "کا اہم مضمون:" نو تاریخیت " کو " فرحت احساس " نے ترجمہ کیا۔ یہ مضمون ۲۰۰۶ء میں " علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ " کے شش ماہی رسالے " تنقید " کے شمارہ: ۱۰، جلد: ۲ میں شائع ہوا ہے۔اِس رسالے نے جدید تنقید پر اہم مباحث کو اٹھایا۔ اِس رسالے کے کچھ شمارے ہی چھپ سکے۔ اس کے بعد کئی سال کا وقفہ ہے، جس میں نو تاریخیت کے حوالے سے کوئی مضمون سامنے نہ آسکا۔ الطاف انجم کی کتاب "اردو میں مابعد جدید تنقید"، ۲۰۱۳ء میں نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ایک مقالہ "نو تاریخیت " کے عنوان سے موجود ہے۔ " تاریخ اور نو تاریخیت "، کے عنوان سے " ڈاکٹر قاسم یعقوب " کا مضمون ۲۰۱۷ء میں اُن کی اہم کتاب "لفظ اور تنقیدِ معنی " میں شائع ہوا۔ "ڈاکٹر حنا جمشید " نے نو تاریخیت کے موضوع پر پی ایچ ڈی سطح کا مقالہ تحریر کیا ہے۔ جس کا ذکر مقالہ ہذا میں "مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق " میں بھی کیا جا چکا ہے۔ان کا مضمون ۲۰۲۰ء میں بعنوان "ادب اور ثقافت اور نو تاریخیت: ایک مطالعہ " تحقیقی جرنل:" الماس " کے شمارہ نمبر ۲۳ میں شائع ہوا، یہ مقالہ انھوں نے "ڈاکٹر شازیہ عنبرین " کی شراکت سے لکھا ہے۔"تاریخ، تاریخیت اور نو تاریخیت، بنیادی تعلقات " کے نام سے "سید ازور عباس " اور " ڈاکٹر مطاہر شاہ "کا مضمون " انجمن ترقی اُردو، کراچی " کے تحقیقی مجلے "اُردُو"، کی "جلد: ۹۷، شمارہ:۲ ،جولائی-دسمبر ۲۰۲۱ء " میں طبع ہوا۔ لیکن اس شمارے کی اشاعت ۱۰ جنوری ۲۰۲۲ء میں ہوئی۔ "معاصر تنقیدی رجحانات "، "ڈاکٹر عبدالعزیز ملک " کی کتاب ہے، جو " مثال پبلشرز، فیصل آباد " سے ۲۰۲۲ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر سامنے آئی۔ اس کتاب میں ایک مضمون :"نَو تاریخیت " کے

عنوان سے موجود ہے۔ حال ہی میں "اورنگ زیب قاسمی" کی کتاب: "ادبی تھیوری: بنیادی تصورات اور مباحث" شائع ہوئی، جس کا باب سولہ بنام: "نو تاریخیت"، تھیوری کے ذیل میں نو تاریخیت کے تصور کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ کل: " چودہ "(۱۴) مضامین ہیں جو نو تاریخیت کی نظری مباحث کو پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ" سید ازور شیر ازی "کا" ایم۔ فل "کا مقالہ "اُردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث"، بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ یہ مقالہ انہوں نے ۲۰۱۸ء میں ڈگری کے حصول کے لیے تحریر کیا اور ہنوز مطبوعہ صورت میں سامنے نہیں آیا۔ اُردُو میں نو تاریخیت کے نظری مَباحث کے ذیل میں :"ریاض صدیقی (اولین مضامین کے تناظر میں)، پروفیسر ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی اور الطاف انجم" ، کے نام اہم ہیں۔ ذیل میں ہم اُردُو میں نَو تاریخیت تناظر کے تحت سامنے آنے والے اِن مضامین کا اور مقالہ جات کا جائزہ لیں گے، اور اِن نظری وضع کردہ اصول وضوابط وجِہات پر بحَث کریں گے۔

ب۔ اُردو تنقید میں نو تاریخیت کے نظری مَباحث

ذیل میں اُردو تنقید میں نو تاریخیت کے نظری مباحث کے جن مضامین ومقالات کے مشمولات کا نقد الانتقادی جائزہ لیا جائے گا، اُن کی فہرست یہ ہے:

مضامین:

۱۔**نو تاریخیت** ، ریاض صدیقی، ۱۹۹۳ء

۲۔**اُردُو تنقید کا مسئلہ اور نو تاریخیت**، ریاض صدیقی، ۱۹۹۵ء

۳۔ **تاریخیت ونو تاریخیت**، پروفیسر عتیق اللہ، ۲۰۰۲ء

۴۔ **نئی تاریخیت**، ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ، ۲۰۰۴ء

۵۔**مابعد جدیدیت ---تاریخیت، نئی تاریخیت**، وہاب اشرفی، ۲۰۰۴ء

۶۔ **تاریخیت اور نو تاریخیت: ادبی تھیوری کا ایک اہم مسئلہ**، گوپی چند نارنگ، ۲۰۰۵ء

۷۔ **نو تاریخیت اور اس کا پیش و پس**، پروفیسر عتیق اللہ، ۲۰۰۵ء

۸۔ **نئی تاریخیت**، ڈان ای۔ وین، مترجم: فرحت احساس، ۲۰۰۶ء

۹۔ **نئی تاریخیت**، ڈاکٹر الطاف انجم، ۲۰۱۳ء

۱۰۔ **تاریخ اور نُو تاریخیت**، قاسم یعقوب، ۲۰۱۷ء

۱۱۔ **ادب اور ثقافت اور نو تاریخیت: ایک مطالعہ**، ڈاکٹر حنا جمشید، ڈاکٹر شازیہ عنبرین، ۲۰۲۰ء

۱۲۔ **تاریخ، تاریخیت اور نو تاریخیت: بنیادی تعقلات**، سید ازور عباس، ڈاکٹر مطاہر شاہ، ۲۰۲۲ء

۱۳۔ **نو تاریخیت**، ڈاکٹر عبد العزیز ملک، ۲۰۲۲ء

۱۴۔ **نو تاریخیت**، اورنگ زیب قاسمی، ۲۰۲۲ء

مقالہ:

۱۔ **اُردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مَباحث**، سید ازور عباس، ۲۰۱۸ء

دستک اُس دروازے پر، میں وزیر آغا کے نو تاریخیت کے متعلق اشارات کو جواز بنا کر، **"ریاض صدیقی"** نے اُردو میں اس تناظر پر پہلا مضمون بعنوان: **"نو تاریخیت"** قلم بند کیا۔ مضمون کا آغاز وزیر آغا کے جملے؛"تازہ دستک پر باہر آنے والا فکری کردار، نو تاریخیت، تھا"، سے ہوتا ہے۔ آغاز میں ریاض صدیقی نے وزیر آغا کی مذکورہ کتاب کو کلامیہ (Discourse) کی تخلیقی یا مکالماتی صورت قرار دیا ہے۔ انہوں نے ڈسکورس کا ترجمہ، باتوں، کیا ہے، جو کہ نادرست ہے۔ ڈسکورس باتیں نہیں، بل کہ افکار و نظریات کا ایک جاری تسلسل ہے جو باہم مربوط و مدغم ہیں۔ اکہرے اور بے جوڑ نظریات اور تصورات بھی ڈسکورس کی خاصیت پر پورا نہیں اترتے۔ ڈسکورس کے

ذیل میں صرف وہی تصورات اور نظریے شامل ہوں گے، جو باطنی طور پر ایک جاری نظامِ فکر کا حصہ ہوں۔ قاضی افضال حسین نے فوکو کی ڈسکورس کے متعلق تعریف کا ترجمہ کیا ہے:

> "نظام کلام (Discourse) کو نہ تو اس کے سواد کے ذریعے بیان کرسکتے ہیں اور نہ ہی اس کو خالص تصورات کے مفہوم میں بیان کیا جاسکتا ہے اور یہ کہ معروض نہیں بلکہ استدلالی قیضوں کے درمیان قائم ہونے والے رشتوں کا شیزازہ ہے"۔(۲۲)

ڈسکورس کی تشریح یہاں اس لیے کی گئی کہ ریاض صدیقی کا "دستک اُس دروازے پر" کو ڈسکورس قرار دنیا اہم ہے۔ وزیر آغا نے جدید تنقید کے مختلف نظریات کو اکہرے اور واحد تصورات کی بجائے ایک دوسرے سے مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ یہ اُس تسلسل کی شرط پر پورا اترتے ہیں جو ڈسکورس کی وجودی (ontological) شرط ہے۔ لہذا اس کتاب کو ڈسکورس کہنا نا صرف درست ہے، بل کہ لائقِ تحسین بھی ہے۔ دوسری طرف صاحب مضمون نے اختلافِ رائے کو جمہوری حق قرار دے کر اختلاف کی صورت بھی پیدا کی ہے۔

اس مضمون کی قرأت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریاض صدیقی کا بنیادی مطمعِ نظر نو تاریخیت کے نظریے کی وضاحت نہیں، بل کہ مغرب میں رائج نام نہاد جمہوریتوں کے سیاہ رُخ کی پیش کش ہے۔ مغربی حکومتیں اہل الرائے پہ ایسی پابندیاں عائد کرتی ہیں، جن کو ہمارے یہاں شاید تسلیم ہی نہ کیا جائے۔ انھوں نے ایڈورڈ ودیع سعید کی، " کوئسچن آف فلسطین"، کی مثال دی ہے۔ جسے کوئی امریکی ناشر شائع کرنے پر رضا مند نہ تھا۔ آخر کار بڑی کوششوں کے بعد ۱۹۷۸ء میں "نیویارک ٹائمز" نے اس کو طبع کیا۔ واضح ہے کہ اس کتاب کو شائع نہ کرنے کی وجہ اسرائیلی لابی اور صیہونی حکومت کا دباؤ تھا۔ مقالہ نگار نے نو تاریخیت پر بحث کم، جب کہ مغرب میں اہل علم کی مشکلات کے ساتھ ساتھ بعض ناقدین کی جانب سے سیاسی بنیادوں پر مخصوص نظریات کے پرچار پر زیادہ توجہ دی ہے۔بادی النظر میں وہ مغرب سے آنے والے بہت سے نظریات کی طرح نو تاریخیت کو دھاکہ

تھیوری(Theory Explosion) کی صورت حال کا حاصل گردانتے ہیں۔ جدید سائنسی نظریات مثلاً ؛نیوٹن کی طبعیات اور اضافیت(Relativism) کے تصور کو، یونیورسٹیوں کے نصاب پر مسلط کر کے تعلیمی معیار کی کمر توڑ دی گئی۔ مغرب کے دوغلے رویے کو بے نقاب کرتے ہوئے ریاض صدیقی نے ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ کے چہرے پر پڑی نقاب کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس حوالے سے مورس ڈکسٹین کی آراء سے استفادہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایلیٹ کی رائے کہ آرنلڈ نقاد نہیں تنقید کا پروپیگنڈہ باز تھا، اُسے قبول نہیں۔ اپنے تجزیے میں وہ آخرالذکر کو ایک بالغ نظر اور آزمائی فکر رکھنے والا نقاد قرار دیتا ہے۔ نجی زندگی اور خوب رو نوجوان ، جین ورڈینل،(Jean verdenal) سے تعلقات سے قطع نظر اس نے دلائل و شواہد کے بنا پر ایلیٹ کو بورژوا قرار دیا ہے، جس کی اصل تمنا اعلیٰ معیار تھی۔ ڈکنسن کا خیال ہے کہ اس کی فکر میں بہت سے مثبت پہلو ہیں مگر سوشلزم کے خوف نے اس کو منفی سمت دے دی۔ یہی وجہ ہے کہ کیتھولک عقائد کو اس نے ادب کی بُنت میں اتار دیا۔ ایذرا پاونڈ کی فاشزم نوازی سے متعلق اس کی تحریروں کے حوالے اروِنگ ہو(Irving Howe) نے ۱۹۷۳ء میں بر سرِ عام کر دیے۔ مسولینی سے اس کے گہرے روابط تھے اور اس کی ایما پر پاونڈ نے ایڈیو تقاریر کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ہو نے ایسے کینٹوز کے بھی حوالے دیئے ہیں جن کا موضوع فاشزم کی ہمنوائی تھا۔" (۲۳)

ریاض صدیقی نے پورے مضمون میں زیادہ توجہ مغربی دانش وروں کی سیاسی دل چسپیوں پر مرکوز رکھی ہے۔ اس صورت حال میں یہ دیکھنا بھی فائدے سے خالی نہیں کہ اِن دانش وروں پر تنقید کا ماخذ بھی مغرب کے ہی اہل علم ہیں۔ انھوں نے یہ تنقید مورس ڈکسٹین، مارک ایڈمنین اور اورنگ ہو کے توسط سے سرانجام دی ہے۔ لہٰذا مغربی دانش وروں کے محض منفی رُخ کو منظر نامے پر اُجاگر کرنا صائب نہیں۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ پورے

مقالے میں کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ ریاض صدیقی نو تاریخیت کی علمی اور فلسفی بنیادوں کے انکشاف کے روپے ہیں۔ وہ سرنامے میں جس عنوان کو قائم کرتے ہیں، مقالے میں اُسے نبھانے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نو تاریخیت پر اُردو میں پہلے مضمون کی مناسبت سے صاحبِ مضمون اس تناظر کی عملیاتی اساس اور فکری محیط کی کُھل کر شرح کرتے اور اپنی تاریخی بصیرت کی بنیاد پر اسے رد کرتے تو حرج نہ تھی۔ تاہم انہوں نے دوسری راہ اپنائی اور اسے مغرب سے آنے والی دھماکہ تھیوری کے ذیل میں رکھ کر دیکھا۔ لیکن مضمون میں انھوں نے کم ہی سہی، مگر نو تاریخیت پر کچھ اظہارات ضرور کیے ہیں۔ نو تاریخیت کے حوالے سے ریاض صدیقی کا ماننا ہے کہ اس اصطلاح کو مغربی دانشوروں نے تاریخیت کی اصطلاح کے متقابل اس لیے وضع کیا ہے، تاکہ حدِ امتیاز کا فرق زائل ہو جائے۔ وہ، تاریخ، کے عمل کو بنیاد بنا کر تاریخیت اور نو تاریخیت کے فرق کو ختم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تاریخ اپنے تسلسل کو عدم تسلسل کے باوجود، خود سے جدا نہیں ہونے دیتی۔ یعنی تاریخ کا ذاتی وصف ہے کہ وہ تسلسل کو برقرار رکھتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علوم کی نئی دریافتیں جتنی چاہیں ترقی کر لیں، تاریخ کے تسلسل کا امر ہر صورت برقرار رہتا ہے۔

> "کوانٹم، عدم یقینیت اور اضافیت کے نتائج اپنی جگہ حقیقت سہی مگر زندگی کے ہر عمل اور ہر رُخ پر ان کا انضباط نہیں کیا جا سکتا ہے۔ فن کی ایک متعین سطح تک نیوٹن کی طبعیات آج بھی اتنی ہی مستند اور ناگزیر ہے، جتنی کہ انیسویں صدی میں تھی۔ دورِ حاضر کی تاریخ کو تھوڑی دیر کے لیے ہائی زن برگ کی مثال یعنی برقی پنکھا مان لیجئے۔ جب وہ اپنی انتہائی رفتار پر چلتا ہے تو پروں کی مقامیت کا اندازہ لگانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ مگر پروں کی مقامیت معدوم نہیں ہوتی جیسی ہے ویسی رہتی ہے۔۔۔۔ سائنسی حقائق جب نامعلوم تھے تب بھی اپنا وجود رکھتے تھے اور جو نامعلوم ہیں وہ بھی وجود رکھتے ہیں۔" (۲۴)

یہاں رُک کر ریاض صدیقی کے استدلال کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ ریاض صدیقی روسی فارملزم، جدیدیت اور نیو کریٹسزم کی منطق سے آشنا نہیں۔ انھوں نے متن کے تجزیے میں تاریخ کو جس طرح نظر انداز کیا وہ ناقدین پر واضح ہے۔ تاہم ایسا نہیں ہے۔ مضمون میں انہوں نے ہیئت پرستوں کی منطق کی وضاحت کی ہے۔ ہیئت پرستوں نے تاریخ اور ثقافت کو نظر انداز کرکے جو خلا پیدا کیا، نو تاریخیت نے اُسے جدید سائنسی دریافتوں سے استفادہ کرکے بحال کرنے کی سعی کی۔ یہ امر مابعد عہد کے فکری طریقہ کار کی مناسبت سے، حقائق کے انکشاف میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ مابعد جدیدیت کے تحت مختلف علوم کی سرحدوں کو ملانے، اور مختلف مظاہر کی شناخت کے سلسلے میں علوم کی باہمی مشارکت پر زور دیتی ہے۔ عرف عام میں اسے بین العلومیت اور کثیر العلومیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کار کے تحت سماجی اور سائنسی علوم ایک معروض کی شناخت کے لیے ایک دوسرے کی حکمت عملیوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ اگر "نظریۂ اضافت"(Relativity) اور "نظریۂ مقادیر برقیات"(Qunantum Mechanics) نے وقت کے تصور میں نئی چست لگائی ہے، تو انسانیت کے لیے کونسی مشکل آن پڑی ہے کہ وہ ان دریافتوں سے اخذ واستفادہ کرکے تاریخ کے دوزمانی تصور کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں؟ ریاض صدیقی جسے تاریخ کا تسلسل کہہ رہے ہیں، اسے جدید طبعیات نے سائنسی اور ریاضیاتی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ کیا ان سے استفادہ کرنا، جہالت ہے؟ اور غیر علمی طریقہ کار ہے؟ آخری تجزیے میں ہم ان دریافتوں کو کسی صورت دھماکہ تھیوری کا لیبل دے کر نظر انداز نہیں کرسکتے۔ نو تاریخیت کا یہ طرز عمل صائب ہے کہ اُس نے ہیئت پرستوں کے ارتداد میں تاریخ کے جس تصور کو جِلا بخشی، وہ جدید سائنسی علوم کی جانب سے بھی موردِ تائید ہے۔

مضمون کے آخر حصے میں ریاض صدیقی "انگلش انسٹی ٹیوٹ آف کیمبرج" میں منعقدہ ایک سمینار میں نو تاریخیت پر "ویلز" اور "اسٹیٹ یونیورسٹی نیویارک" کے اساتذہ میں ہونے والے مکالمے کے نتائج کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ یہ نکات اہم ہیں۔ تاہم مضمون نگار نے ان کا صرف ترجمہ پیش کیا ہے اور کسی تشریح سے گریز کیا ہے۔

یہاں ان آرا سے اخذ اہم نکات کو درج کیا جاتا ہے۔ نو تاریخیت ادب کی "ادبیت"(Literariness) کو بحال کرنے کے لیے اس کا مطالعہ تاریخ کے تناظر میں کرتی ہے۔ یہ وہی طریقہ کار ہے جس کو "لیو کاش"، "ٹرلنگ" اور "ولسن" نے اپنایا ہے۔ نو تاریخیت کا ظہور ڈی کنسٹرکشن کے سمٹنے سے ہوا ہے۔ ڈی کنسٹرکشن ادب کا تجزیہ متن کی بنیاد پر کرنے کی قائل ہے، اس طریقہ کار سے مصنف اور قاری غائب ہو جاتے ہیں اور متن اصل ٹھہرتا ہے۔ ڈی کنسٹرکشن کے اس طریقہ کار کے سیاق میں "مصنف کی سوت" کا دعویٰ کار فرما ہے۔ لہٰذا جب ڈی کنسٹرکشن سمٹنے کا عمل شروع ہوا تو ادب کے تجزیے کی دیگر جہات کی طرف توجہ کی گئی۔ ان میں سے ایک طریقہ کار نو تاریخیت ہے۔ تھیوری کے اس رُخ نے، بادی النظر میں سیاہ فام یہودیوں، خواتین اور ہم جنسوں کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک کا جواب دیا ہے۔ مارکسی ناقدین نے اسٹالن سے ادبیت اور ادبی اقدار پر جس بحث کا آغاز کیا تھا، اُس کی نوعیت کلی نہیں تھی، بل کہ یہ اختلاف چند ایک جزوی مسائل پر تھا۔ اس نکتے سے یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مارکسزم کئی معاملات میں حق بجانب تھا۔ مثلاً تاریخ پر اُس کا اصرار بے جا نہ تھا۔ نو تاریخیت نے نقادوں کے اس رویے کو حرفِ غلط قرار دیا ہے۔ جس کے تحت وہ ماضی کی قدر و قیمت کو ترک کرتے ہیں۔ ادبی تنقید کی اس نئی جہت نے ادب اور نظریے کی بحث کو ازِ سر نو (تاریخ کے سیاق میں) زندہ کیا ہے۔ بعض جواں سال سماجی تاریخ نویس سیاسی اعتبار سے بائیں بازو کے رویے کے حامل ہیں۔ حالاں کہ نو تاریخیت ادبی متن میں جس تاریخ کو منکشف کرنے پر زور دیتی ہے وہ روایتی دستاویزی تاریخ نہیں، بل کہ تاریخ کا غیر روایتی تناظر ہے۔ لہٰذا ان سماجی تاریخ نویسوں کا مذکورہ رویہ زیادہ صائب نہیں ہے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ جنسیت، نسلیت اور نو آبادیات کے خلاف نو تاریخیت نے ادب شاعری جیسے وسائل سے استفادہ کیا ہے، یہ اس نظریے کی سیاسی جہت ہے۔ ظاہر ہے نو تاریخیت، ریمنڈ ولیمز، کی ثقافتی مادیت کی بنیاد پر مقتدرہ کو چیلنج کرتی ہے۔ اس چیلنج اور گریز کے بہترین نمونے نو آبادیوں کے ادب میں موجود ہیں۔ یہ نمونے علامتی اور غیر علامتی ہر دو صورتوں میں موجود ہیں۔ ان کا نو تاریخی تجزیہ مقتدرہ یا نو آبادکار کی جانب سے مرتب کی گئی متعصب تاریخ کی رد تشکیل کرنے کا سامان ہے۔ "گرین بلاٹ،

بر کوچ، میکائل منشر اور ایڈورڈ ودیع سعید "کا شمار اُن ناقدین میں ہوتا ہے، جنہوں نے تاریخ، اساس، تنقید کی بنیادیں فراہم کیں۔ واضح رہے کہ ان مصنفین کی کتب میں تجزیاتی سطح پر تاریخی مواد سے بے پناہ استفادہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان کا طریقہ کار نو تاریخی نظریے سے میل کھاتا ہے۔ اسی طرح ادب، شاعری دیگر ماخذات کی طرح تاریخ کے حصول وادراک کے ماخذات ہیں۔ "پال ایڈولف مشیل ڈی مان" (Paul Adolph Michle De Man)، نے تاریخ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ محض خیالی اڑان کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے برعکس نو تاریخی نظریے کی درست ترجمانی "لن ہنٹ" اور "لین واوز" نے کی ہے، جن کا ماننا ہے کہ ادب اور تاریخ کا رشتہ ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ ادب مجموعی طور پر ٹھوس اور مادی حالات کی ہی پیداوار ہے۔ لہٰذا نو تاریخی ناقدین کی یہ کاوش لائقِ تحسین وداد ہے کہ انہوں نے ماضی کے بہترین ادبی و فکری سرمایے کو از سرِ نو ادبی تاریخ میں شامل کیا ہے۔

ریاض صدیقی کا مذکورہ مضمون، نو تاریخیت کے حوالے سے ابتدائی نوعیت کا ہے، جس کے مطالعے کے بعد کوئی واضح تصور ابھر کر سامنے نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مقالہ نگار نے کئی معلومات کو اس فرض کے ساتھ متن کا حصہ بنایا ہے کہ قاری ان سے آشنا ہو گا یا انہوں نے یہ مضمون ہی ایک خاص اور محدود طبقے کے لیے تحریر کیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ریاض صدیقی نے یہ مضمون عجلت میں تحریر کیا ہے۔ پورے مضمون میں کوئی فکری ربط نظر نہیں آتا۔ مزید یہ کہ جس ڈرافٹ کے بارہ نکات کے ترجمے پر انحصار کیا گیا ہے، اُس میں کئی نکات تشریح طلب ہیں۔ جب تک اردو کے قاری کے لیے اُن کی شرح نہ کی جائے، وہ قابلِ فہم نہیں۔

ریاض صدیقی، کا دوسرا مضمون: **"اُردُو تنقید کا مسئلہ اور نو تاریخیت"** وزیر آغا کے رسالے اوراق میں ۱۹۹۵ء میں سامنے آیا۔ اس مضمون میں کئی باتیں تو پچھلے مضمون کی تکرار ہیں، اس لیے اُن کا دوبارہ یہاں تذکرہ نہیں کیا جائے گا۔ پورے مضمون کی قرأت کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے، کہ اس کا ڈھانچہ پچھلے مضمون کے ہی مطابق ہے۔ تاہم ریاض صدیقی نے اس مضمون میں مباحث کو قدرے تفصیل کے ساتھ، اور زیادہ منظم انداز

میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے فکری دائرہ کار میں رہتے ہوئے حالیہ مضمون سابقہ کی نسبت اہم اور کار آمد ہے۔ مقالہ نگار اس مضمون میں بنیادی طور پر اُردو تنقید کی زوال پذیر صورت حال اور اس پر مغربی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے نو تاریخی تناظر کی اہمیت کو باور کرانا چاہتا ہے۔ نو تاریخیت کے تصور کی وضاحت کی غرض سے انھوں نے بیسویں صدی کے سیاسی منظر نامے کو کھل کر اجاگر کیا، جس کے دوران نو تاریخیت کا ظہور ہوا۔ اس منظر نامے کی وضاحت میں، بین اسطور وہ جدیدیت کے فکری نقائص کا احاطے کرتے ہیں اور مابعد جدیدیت یا ساخت شکنی کی آمد کے نتیجے میں لامرکزیت نے کس طرح تاریخ اور محکوم ثقافتوں کو دوبارہ احیا کیا، کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔ اس مضمون کی بنیاد بھی، سابقہ مضمون کی طرح وزیر آغا کے بیانات ہیں، جس میں مقالہ نگار اپنے تئیں اضافے کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ مضمون دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: پہلا حصہ؛ اردو تنقید کے مسائل کے متعلق ہے، جب کہ دوسرا حصہ؛ نو تاریخیت کے متعلق۔ ریاض صدیقی اردو تنقید کی عصری صورت حال سے مطمئن نہیں ہیں۔ وہ تنقید کو معاشروں اور ادب کی عملی اور ثقافتی نشوونما کی لازمی شرط گردانتے ہیں اور اسے شعر و ادب کا ہراول دستہ کہتے ہیں۔ انھوں نے معاصر تنقید کے بین العلومی رویے کا اثبات کیا ہے۔ اُردو دان سماج میں تنقید کے ہراول دستے کی عدم موجودگی پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے، انھوں نے اسے بے تنقید، سماج کے عنوان سے یاد کیا ہے۔ اُردو تنقید میں زوال آمادگی کے بھونچال آنے کی علت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اردو تنقید کی جواں سال روایت پر زوال کا حملہ اُس وقت ہوا جب عالمی شعر و ادب اور تنقید سے اس کے رشتے پائیدار ہو گئے تھے۔ سجاد ظہیر، عزیز احمد، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ممتاز حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ، فیض، قرۃ العین حیدر، حسن عسکری، فراق، کلیم الدین احمد، ڈاکٹر احسن فاروقی، ریاض احمد، ابتدائی دور کے وزنی اہلِ نظر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں بین الاقوامی ادب اور تنقید کا پیش منظر صاف دکھائی دیتا ہے۔ یہی دور تھا جب تنقید کی

قلم ومیں بھونچال آگیا۔ اس صورتِ حال کے پس پردہ حکم ران طبقے کے اختیار
واقتدار کی طاقت کار فرما تھی"۔ (۲۵)

تنقید پر زوال کی آمد کو وہ حکم ران طبقے کے اختیار اور مقتدرہ کے جبر سے جوڑتے ہیں۔ جب طاقت کا ہمہ گیر رسوخ پھیلتا ہے، تو ریاستی ادارے جن میں علمی، ادبی و تحقیقی ادارے بھی شامل ہوتے ہیں، اس قتدار و طاقت کے زیرِ اثر کام کرتے ہیں۔ ان اداروں کا مجموعی کام اہلِ اقتدار کے نقطہ نظر کے موافق تاریخ کو مسلط کرنا ہے، جس سے اصل تاریخ پس منظر میں گم ہو جاتی ہے۔ ریاض صدیقی نے ،اکادمی ادبیات، کو اسی طرز کا ایک ادارہ قرار دیا ہے۔ اس مقام پر مضمون کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جو نو تاریخیت سے متعلق ہے۔ تاریخ کو مسخ کرنے کی جو کوشش مقتدرہ کی جانب سے سر انجام دی جاتی ہے، اُسے نو تاریخی تناظر کے ذریعے رد تشکیل کے عمل سے گزارا جاسکتا ہے۔ ریاض صدیقی اسی وجہ سے نو تاریخیت کے تفاعل کو سراہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ماضی اور تاریخ کا حقیقی رُخ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ انھوں نے مقتدرہ سے روابط کے ذیل میں "ذوق، محمد حسین آزاد اور غالب" کی مثال دی ہے۔ ذوق اور بعد ازاں محمد حسین آزاد کو، اپنے زمانے کی مقتدرہ کی حمایت حاصل تھی۔ محمد حسین آزاد نے ذوق کی شعری عظمت کو جتنا بھی بڑھانا چاہا، تاہم تاریخ کے فطری بہاؤ اور مستقبل نے غالب کو منتخب کیا۔ لہٰذا جدیدیت پسند نقادوں نے اپنے سیاسی ہتھ کنڈوں کے ذریعے تنقید کی جو روایت پروان چڑھائی، وہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ جدیدیت نے ادبی تنقید پر سماجی، سیاسی اور تاریخی شعور کی اثر پذیری کو غیر ادبی کوڑا کرکٹ قرار دیا اور اس کارد کیا۔ تاہم زمانے کے پھیرنے، ادبی مطالعات میں نظر انداز کیے گئے تاریخی شعور، کو دوبارہ متن کے مرکز میں لا کھڑا کیا۔

اس کے بعد ریاض صدیقی نے جدیدیت کے اُس سیاسی کھیل کو موضوع بنایا ہے، جس نے ادبی تجزیے کے حربوں اور اسالیب سے تاریخ اور ثقافتی شعور کو خارج کرنے میں اساسی کردار نبھایا۔ انہوں نے جدیدیت کی اس انحراف پسند منطق کی وضاحت "آرتھر ایم۔ سالزمین "(Arthur M. Sallzman/Saltzman) کے الفاظ

میں یوں ہے کہ: "موڈرنزم کی لغویت نے ہماری حسیت میں اتنی آلودگی و بے معنویت بھر دی ہے کہ ہمیں ہر انقلابی قدامت پرست محسوس ہونے لگا ہے، وہ ہماری خواہشات کے سامنے آئینہ رکھ دیتی ہے اور اس آئینے میں جو جھوٹی تصویر (Virtual Image) نظر آتا ہے، اسے صداقت قرار دیتی ہے۔"[۲۶] امریکہ میں جدیدیت نے اپنی بہت سی شاخوں مثلاً: "نئی تنقید، فارملزم، فنامنالوجی (فینومینولوجی)، ساختیات اور پسِ ساختیات" کے ذریعے ویلز سکول، لبرل، ریڈیکل اور مارکیسوں کے خلاف محاذ آرائی۔ یہاں اس نکتے کی تفہیم بہت ضروری ہے۔ کہ نئے عہد کی جدیدیت اور اس کے سائے میں پروان چڑھنے والے تنقیدی مکاتب غیر سیاسی ہرگز نہیں ہیں۔ عمومی طور پر بیسویں صدی کا ادب سیاست کے اثر و رسوخ سے کٹ کر قابلِ فہم حالت میں نہیں رہتا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد خاص طور پر ادب نے سیاسی مضمرات کو نمایاں کرنے کی سعی کی۔ بادی النظر میں، جسے ہیئت اور فن پر اصرار سے عبارت کیا جاتا ہے، وہ آخری تجزیے میں فکری انہدام کو لازم گردانتی ہے۔ جدیدیت نے ہیئت اور فن پر مطلق توجہ دے کر نام نہاد جمہوری حکومتوں کے لیے ادب کے ذریعے فکری انقلاب کی تشکیل کی راہیں ہم وار کیں۔ مارکسی ناقیدین، ریڈیکل ولبرل محققین کا جدیدیت پر یہی اعتراض ہے۔ ریاض صدیقی نے امریکہ میں جدیدیت کے ذریعے فروغ پانے والے "میکارتھیت" (Mc Carthgism) کے رجحان کو بطور مثال پیش کیا۔ اس ادبی گروہ کی سرپرستی امریکی حکم ران "ٹرومین" اور اس کے رفیق کار "جوزف میکارتھی" کر رہے تھے۔ اس تناظر کے ردِعمل میں ادباء کے ایک بڑے گروہ نے تنقید و تخلیقی ادب میں سماجی و سیاسی شعور اور تاریخی کی بازیافت پر زور دیا۔ انھوں نے واضح کیا کہ "جدیدیت پسند تنقید کی خرابی یہ ہے کہ وہ معروض لکھاری، اس کے کام اور سامنے کے سماجی پس منظر کو حوالہ بنائے بغیر معروض کو اٹھا کر نظریات کی بھٹی میں جھونک دیتی ہے اور اس طرح معروض تحلیل ہو جاتا ہے"۔[۲۷] انھوں نے "لیونئل ٹریلنگ" (Lionel Trilling) کے مضمون "فرائڈ اور ادب" کے حوالے سے لکھا ہے: "جدیدیت پسند لکھاری دروں بینی، نظری ارتقا اور تاریخی شعور سے گریز کو عقیدہ بنائے

ہوئے ہیں۔ گویا انھوں نے آنکھوں پر رنگین عینک لگا رکھی ہے۔ چناں چہ اِن کو متن اور دنیا کے درمیان اگہی کی ترسیل کا رجحان دکھائی نہیں دیتا"۔ (۲۸)

مذکورہ بالا سیاسی صورت حال کے دوران نو تاریخیت کا ظہور ہوتا ہے اور بادی النظر میں ادب اور تنقید کی فطری جست کا نتیجہ ہے۔ ریاض صدیقی نے نو تاریخیت کے بنیادی نکتہ نظر، اس کے مختلف رویوں اور اس پر مابعد جدیدیت وساخت شکنی کے اثرات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ان کے بقول ادب اور تنقید کا تاریخیت سے رجوع کرنا ایک فعال تعمیری رجحان ہے اور اس عالم گیر حقیقت پر دلیل کہ آرٹ اور ادب اپنے گردوپیش سے الگ کوئی شے نہیں جس کی مطلق ماورائے سماجی آزادی اور خود مختاری کو مان لیا جائے۔ تاریخی نقاد جمالیاتی خود مختاری کی تردید کرتے ہیں۔ اس مقام پر ریاض صدیقی ساخت شکنی کے نو تاریخیت پر اثرات کی وضاحت میں قدرے تامل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے ہی پہلے دہرائے گئے مطالب کی تردید کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ نو تاریخیت کے طاقت کو چیلنج کرنے کے رویے کو ساخت شکنی کے لامرکزیت پر مبنی سے متاثر قرار دیتے ہیں:

> "ساخت شکنوں نے عالم کو ایک متن قرار دیا ہے۔ بقول دریدا کوئی شے ماورائے متن ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ نو تاریخی بھی دنیا کا مطالعہ وسیع تر متن ہی کے حوالے سے کرتے ہیں اور مدعی ہیں کہ ماضی کا براہ راست اور مکمل صداقت پر مبنی ادراک ممکن نہیں۔ لوئس مانٹروز اس نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے دعویٰ کرتا ہے کہ ماضی کی صحیح آگہی تاریخ نہیں صرف ادب ہی پیش کر سکتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کے استادوں اور ماہروں کو ادب سے رجوع کرنا پڑے گا۔ اس کے ضابطے کے دو جزو ہیں، تاریخ کی متنیت، اور، متنیت کی تاریخ، آخرالذکر کے بارے میں لکھتا ہے کہ ثقافتی خواص اور سماجی شعور جو ہر نوع کی تحریر کا حصہ ہوں، متنیت کی تاریخ، ہیں۔ اسی موڑ سے تاریخ اور ادبی تاریخ میں حد امتیاز قائم ہوتی ہے"۔ (۲۹)

اگرچہ ریاض صدیقی نے اپنے پہلے بنائے ہوئے موقف کی تردید کی ہے۔ تاہم وہ اس حقیقت کی دریافت میں درست ڈگر پر چلے ہیں کہ نو تاریخیت طاقت اساس بیانیوں کی تردید اور رد تشکیل کرتی ہے۔ یہی نکتہ نظر انھیں نو تاریخیت کے حقیقی تصور کے قریب آنے میں مدد کرتا ہے کہ ادب اور تاریخ حقائق کے انکشاف کے دو مساوی متون ہیں اور یہ کہ دونوں ایک دوسرے کی شراکت سے تاریخ کے طاقت اساس بیانیے کو رد کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ادب، تاریخ کا غیر راست متبادل بیانیہ قرار پاتا ہے۔ طاقت کی رد تشکیل کرنے والے نکتے کے انکشاف نے انھیں نو تاریخیت کے معاصر عہد میں کردار کو واضح کرنے میں مدد فراہم کی ہے۔ لہٰذا وہ لکھتے ہیں کہ: "نو تاریخیت اپنے مطالعے کی ابتدا نچلی سطح سے کرتی ہے اور اُن طبقات کو بھی مساوی اہمیت دیتی ہے جن کو ایک زمانے تک ستر پردوں میں رکھا گیا مثلاً محنت کش، کسان، غلام خواتین، جواں سال بانکے، سیاہ فام، تارکینِ وطن آبادکار اور اصل مقامی امریکی۔"[۳۰] اس بیان نے انھیں تاریخی تنقید کو مابعد جدید تناظر سے ہم آہنگ کرنے والے ناقدین "سکوان برکووچ" اور "ایڈورڈ ودیع سعید" کے اعتراف پر بھی مجبور کیا ہے۔ اُردو کے تناظر میں اسی لیے وہ وزیر آغا کی تنقیدی کارگزاری سے اختلاف کے باوجود قائل نظر آتے ہیں۔ نو تاریخیت پر وزیر آغا کی آرا کو تفصیل سے درج کرنے کے بعد، ریاض صدیقی نے، اُن کے امتزاجی تنقید (Synthetic Criticism) کے طریقہ کار کو بھی سراہا اور لائق توجہ قرار دیا ہے۔ یہیں وہ اُردو ادب کے نو تاریخی مطالعے پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس لیے وہ اردو ادب پر تاریخ اور سوانح کے اثرات کو دوسرے تمام اثرات سے زیادہ مانتے ہیں:

> "اردو کی گم ہو جانے والی تنقیدی روایت پر تاریخ و سوانح کی چھاپ بہت گہری ہے اور ادبی و فکری سطح پر اسے قبول بھی کیا گیا ہے۔ اس لیے بحث کے موضوعات کو اہلِ اردو کے سامنے پیش کرنا مفید ہو گا جو کہ ساختیات، پسِ ساختیات، ساخت

شکنی اور اسلوبیات کے مقابلے میں اردو روایت و ثقافت سے زیادہ قریب محسوس ہوتی ہے"۔(۳۱)

ریاض صدیقی کا مذکورہ مضمون اس حوالے سے اہم ہے کہ اس کے ذریعے پہلی دفعہ اردو تنقید میں تاریخی تنقید کے مابعد جدید تناظر کا ایک شمہ سامنے آیا۔ یہ بات دھیان میں رہے کہ ریاض صدیقی اس مضمون میں زیادہ تر تاریخیت، سوانحی تنقید اور تاریخی تنقید کو نو تاریخیت کا نام دے کر موضوع بناتے نظر آتے ہیں۔ تاہم مضمون کے آخر میں ایک دو اقتباسات میں وہ نو تاریخیت کے حقیقی تصور اور مطالعاتی منہج کے قریب آتے ہیں اور یہیں مضمون ختم ہو جاتا ہے، تا آں کہ یہاں سے بعد (آگے) ہی تو وہ اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

پروفیسر عتیق اللہ، کے مضمون: **"تاریخیت و نو تاریخیت"**(۲۰۰۴ء) کو اُردُو میں نو تاریخی تناظر کے نظریے کی دقیق وضاحت پیش کرنے والی پہلی اہم تحریر قرار دیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ادبی تھیوری کے قدیم و جدید دبستانوں میں تقریباً ہر ایک پر الگ الگ مضامین لکھے ہیں۔ جدید، مابعد جدید ادبی تھیوری پر اُن کی رائے سند اور اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔ تاریخ اور ادب کے تناظر میں، ادب اور تاریخ کے تصور کو بنیادی موضوع قرار دے کر، ادب میں تاریخی نقطۂ نظر کے تین مختلف طریقہ ہائے کار کی وضاحت کرتے ہیں۔ جو کہ ان کے مطابق؛ روایتی، مارکسی اور نو تاریخی طریقِ رسائی ہیں، جن کی مزید تفصیل آگے اسی جائزے میں پیش کی جائے گی۔ آغاز میں انہوں نے تاریخ کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: "تاریخ نام ہے عہدِ رواں کے تسلسل کا، جو وقوعہ بہ وقوعہ، ساعت بہ ساعت ماضی کے عظیم لاشعور کدے میں ڈھلتا جارہا ہے۔۔۔۔ تاریخ اسی طویل ترین ماضی کا نام ہے جو عہد بہ عہد اپنے حال کے صیغے ہی سے پہچانا جاتا ہے"۔(۳۲) (شاید اُردُو میں کم ہی کوئی ناقد ہو کہ جو نو تاریخیت کو تاریخ کے تناظر میں اہم سمجھ کر اپنے موضوع کا آغاز تاریخ سے کرے۔) اس کے بعد انہوں نے ادبی متون کے تاریخی مطالعے کے طریقہ کار اور تاریخیت کے زیرِ اثر تنقید میں تاریخی لسانیات کے انغمامی عمل کی وضاحت کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ ادبی متن کا تاریخی تناظر میں مطالعہ، تفہیم کی سطح پر ماورائی یا خود کار جمالیاتی قدر

کو دعوے کی بنیاد بنانے سے گریز کرتا ہے اور اس یقین کا اعادہ کرتا ہے کہ تاریخ ایک زبردست و غالب قوت کے باوصف انسانی فہم، جذبوں نیز ادب و فن اور لسانی نظام کو نئی حرکت سے آشنا کرتی ہے۔ ادب کی سطح پر تو تاریخ کا تفاعلی کردار واضح ہے۔ تاہم لسانی نظام پر تاریخیت کے اثرات کا محاکمہ کرتے ہوئے، اُن کا کہنا ہے کہ تاریخیت کے زیر سایہ ادبی نقاد "بین الادواری تقابل کے ذریعے زبان میں واقع تدریجی تبدیلیوں، الفاظ کی نئی تعبیرات ترک کردہ، پامال، گم کردہ، غریب دخیل اور نئے الفاظ اور ان کے نئے خوشوں اور مرکبات، نیز نئے موضوعات اور ان کے اشتقاقات جیسی نوعیتوں پر مطالعے کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس کی بنا پر ترجیح فن کار اور اس کے فن کے باہمی رشتے کے علاوہ لسان کے اس تاریخی کردار پر بھی ہوتی ہے جو تدریجاً جدلی ہوتا ہے اور مختلف لسانی تہذیبیں جس پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں"۔ [۳۳] اس وضاحت کے ذریعے صاحبِ مقالہ نے تاریخی لسانیات کے بنیادی تفاعل کو بڑی عمدگی سے قابلِ اطلاق حالت میں واضح کیا ہے۔ اس کے بعد ادب اور تاریخ کے باہمی رشتے کی مناسبت سے تاریخی ادبی مطالعے کے تین طریقہ ہائے کار کی وضاحت کرتے ہیں۔ یہیں سے مضمون تین حصوں میں منقسم بھی ہوتا ہے۔ وہ تین طریقہ ہائے کار درج ذیل ہیں:

۱۔ روایتی تاریخی طریقِ رسائی(Traditional Historical Approch)

۲۔ مارکسی تاریخی طریقِ رسائی(Marxist Historical Approch)

۳۔ نو تاریخی طریقِ رسائی(New Historical Approch)

تاریخ اور ادب کی باہمی مشارکت کا پہلا طریقہ کار روایتی نوعیت کا ہے اور مارکسی نظریے کی آمد سے پہلے کی ادبی تنقید میں رائج رہا ہے۔ عتیق اللہ کے بقول، اس طریقہ کار کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ ادب کا سیاق ان تہذیبی اور سماجی رشتوں سے مرکب ہے، جن کا مرکز و محور تاریخ ہوتی ہے۔ اگر نسل اور خاندان کے تصورات بھی اس میں شامل کریں تو یہ سلسلہ نفسیاتی دھارے سے تاریخی نفسیات تک پہنچتا ہے۔ مضمون نگار نے اس طرزِ فکر کے بنیادی نظریہ ساز اطالوی فلسفی "ویچو"(Vico) کو قرار دیا ہے۔ یاد رہے یہ وہی ویچو ہیں جن کے تصورات

سے ایڈوڈودیع سعید نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''Orieentalism'' میں بھرپور استفادہ کیا ہے۔ سعید نے ویچو کے تصورِ تاریخ، اور اقوامِ عالم، کے تصور سے بھرپور استفادہ کیا۔[۳۴] ویچو(Vico) ادب اور تاریخ کے باہمی رشتے کے اثبات میں " تاریخی سائیکل "کا نظریہ پیش کرتا ہے جو کہ تاریخی تبدیلی کا ایک دائرے میں حرکت کرنے والا نامختتم سلسلہ ہے۔ جب یہ سائیکل چلتا ہے تو ہر تاریخی دور کے اختتام پر سیاسی، تہذیبی اور لسانی صورتیں بدل جاتی ہے۔ فوکو کے "اے پیس ٹیم "(Episteme) کے نظریے کے بطن میں ویچو کے تاریخی سائیکل کی بازگشت بھی سنی جاسکتی ہے۔ ویچو کے مطابق شاعری کی زبان ہیروئی عہد میں استعاراتی ہوتی ہے اور احساسی سطح پر بے حد فروغ پاتی ہے۔ اُس نے ہومر کے رزمیے کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ ادبی نقاد اس مکتبِ فکر کے تحت تاثیر ادب کے توسط سے ہر عہد کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس طرز فکر کے دیگر فلسفی بنیاد گزاروں میں "ہرڈر "اور "ٹیلسن " کے نام اہم ہیں۔ عتیق اللہ کے بقول ادبی نقاد اس تصورِ تاریخ کے تحت ادب کے ذریعے درج ذیل سوالات کے جوابات تلاش کرتا ہے:

> "زمانے کے فرق کے ساتھ ادبی بصیرتوں میں کس کس نوع کی تبدیلی واقع ہوتی ہیں؟ اور ایک عہد کا ادبی محاورہ دوسرے عہد سے کیوں کر میل نہیں کھاتا؟ وہ کون سے اجزا ہیں جو ایک عہد کے فن پارے کو دوسرے عہد میں اجنبی یا زیادہ با معنی بنادیتے ہیں۔ تاریخی قوتوں کا عمل اگر فیصلہ کن اور ثابت ہے تو ایک عہد کے یکساں تاریخی سیاق میں ادبی یا تخلیقی تجربے کی نوعیت بھی یکساں کیوں نہیں ہوتی؟۔۔۔۔۔۔۔انفرادی اور اجتماعی سطح پر عہد بہ عہد تصورات، مفاہیم اور مذاق کی نوعیت کیا تھی؟ہیئت ولسان، اصناف اور اسالیب، نیز قوسیاتArchetypes اور مشعراتAllusions کے نظام میں جو بدلی ہوئی صورت ہے، اس کے تاریخی یا غیر تاریخی محرکات کیا ہیں؟"۔(۳۵)

یہ سوالات اپنی نوع میں بہت اہم اور کارآمد ہیں۔ تاہم مضمون نگار نے اس بات کا اعادہ بھی کیا ہے کہ کوئی بھی تاریخی مطالعہ ہمہ جہت ادبی مطالعے کی ضرورت کو پورا نہیں کرتا، اس لیے کہ وہ تاریخ سے بہر حال منتھی ہے اور اس انسلاک کے باعث، تخیل، کی نفی ہوئی ہے۔ عتیق اللہ نے ادب اور تاریخ کے یک رُخی مطالعے کے حوالے سے "ڈاکٹر جانسن، ایف۔ او۔ میتھی سن اور ایل۔ سی فائنس" کے ناموں کو قابلِ ذکر گروانا ہے۔ تاریخ اور ادب کے باہمی انسلاک کا قائل دوسرا نظریہ یا طریقہ کار مارکس کے تصورات سے اخذ شدہ ہے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ مارکس نے تاریخ کو آئیڈیالوجی کے ساتھ مدغم کیا ہے اور یوں اُس نے تاریخ کو تاریخی مادیت کے تصور میں منقلب کر دیا۔ اس تناظر کے تحت تاریخ طبقاتی کش مکش اور جدلیات کے انکشاف کا مظہر ہے۔ مضمون نگار کے الفاظ میں :"مارکسی نظریہ تاریخ میں طبقاتی کش مکش یا سماجی تاریخی عوامل کی حیثیت بنیادی ہے اور ادب پوری صداقت کے ساتھ ان عوامل اور اس کش مکش کی بطورِ حقیقت نمائندگی کرتا ہے۔ حقیقت Reality جسے سماجی حقیقت Social Realism کہنا زیادہ مناسب ہو گا، یہ الفاظ مارکس فی نفسہٖ تغیر آشنا اور حرکت پذیر ہوتی ہے۔"[۳۶] لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مارکس کا تصورِ تاریخ، مجرد تاریخ کے تصور سے مختلف ہے اور اسی مناسبت سے ادب میں بھی اس کی فعالیت متنوع ہے۔

تاریخ اور ادب کے ملاپ کا تیسرا طریقہ کار، نو تاریخیت ہے۔ نو تاریخیت کی اصطلاح پہلی مرتبہ "ویسلی مارس" نے ۱۹۷۲ء میں استعمال کی۔ اپنی اصل میں یہ پہلے بیان کی گئی دونوں صورتوں کی توسیع بھی ہے اور اُن کی از سرِ نو بحالی بھی۔ عتیق اللہ کا ماننا ہے کہ نو تاریخی طریقہ کار میں نو مارکسی طرزِ تنقید کی جھلک نمایاں ہے جو ادب اور نظریے کے مابین ایک نئے اور با معنی رشتے کی جستجو کرتا ہے۔ نو تاریخیوں نے مارکس اور اینگلز کے تصورات پر از سرِ نو نظر ڈالی۔ اس پر مستزاد جدید مارکسی نقادوں کے آئیڈیالوجی کے تصورات نے بھی مہمیز کا کام سرانجام دیا۔ یوں اس نئے طرزِ فکر میں تاریخ کے سابقہ تمام نظریات ایک نئی روح کے ساتھ منقلب ہو کر منظر نامے پر اجاگر ہوئے۔ یوں بقول مورس ڈکسٹین ادبی تنقید نے پھر سے اپنا کھویا ہوا سیاسی اور سماجی پس منظر حاصل کر لیا۔ عتیق

اللہ نے نو تاریخیت اور سیاست کے باہمی ربطہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اکثر نو تاریخی نقاد سیاست اور تاریخ کے ربطہ پر خاصہ اصرار کرتے ہیں۔ اس حوالے سے عتیق اللہ کا کہنا ہے کہ نو تاریخی تنقید سیاست کو تاریخ کے تناظر کے طور پر اخذ نہیں کرتی بل کہ سیاست، تاریخ ہی نہیں دیگر تمام سماجی امور وصورتِ حالات کی ایک متحرک قوت کا کردار ادا کرتی ہے۔ نیز یہ کہ تمام متون قطعاًسیاسی معنی کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ، کیوں کہ نو تاریخیت بہت سی، ان کہیوں، کو ادب کی مدد سے دریافت کرتی ہے۔ پس یہ دیکھنا اہم ہے کہ متن کی تاریخی تشکیل کے دوران کئی خالی جگہیں متن میں رہ جاتی ہیں، پسِ ساختیات اسے "اپوریا"(Aporia) کی اصطلاح سے واضح کرتی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے خرم شہزاد نے لکھاہے:

> "یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ناقابلِ گزر راستہ(Unpass able path) کے ہیں۔ خطابت میں اس سے مراد ایسا شک ہے جو بولنے والے کے ذہن میں معنی کے حوالے سے قائم ہو تا ہے(ژاک دریدا) نے اس ناگزاریہ سے مراد وہ فکری تعطل لیا ہے جو معنوی حدبندی قائم کرتا ہے۔ قاری کے لیے معنیاتی نظام میں تناقص (Paradox) جنم لیتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر قاری نہیں جانتا کہ (معنی کی تلاش میں) اب کس سمت جانا ہے اور وہ خود کو بے یارو مدگار محسوس کرتا ہے۔" (۳۷)

ادبی متن میں تاریخ کی واضح صورت کے برعکس ایک صورت ناگزاریہ (Aporia) کے طور پر بھی موجود ہو سکتی ہے۔ عتیق اللہ نے مارکسی تنقید کے تناظر میں نو تاریخی تنقید کے ذیل میں ان سوال کو اٹھایا ہے:

> "ایک صورت وہ ہے جس کی طرف ماشیرے نے اشارہ کیا ہے کہ کوئی بھی ادبی متن، اپنی ہیئت اور افسانویت کے باعث خود اپنی آئیڈیالوجی سے کیوں کر بعید ہو جاتا ہے؟ ہر متن پوری طرح مکمل نہیں ہوتا، اس میں بہت سی سکوت نیز

درزیں پاسکتے Silences اور خالی جگہیں رہ جاتی ہیں اور یہ خالی جگہیں Gaps جو نہیں کہا گیا، کی مظہر ہوتی ہیں۔ ماشیرے نے اسی بنیاد پر متنی لاشعور texual contiousness کا تصور قائم کیا ہے۔مارکسی نقاد کو متنی لاشعور سے ان حقائق کو نکال کر باہر لانے کی سعی کرنی چاہیے جو کسی دباؤ کے تحت کہنے سے رہ گئے ہیں۔ ٹیری ایگلٹن کے نزدیک بھی تنقید کا خاص مبحث متن کے وہ مضمرات ہونے چاہئیں جو ان کہے Unsaid رہ گئے ہیں۔"(۳۸)

گویا عتیق اللہ مارکسی تناظر کے حامل ناقدین کے بیانات سے استفادہ کر کے نو تاریخیت کے ادبی کردار وان خالی وقفوں کو بھرنے کی کوشش سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ متن میں یہ خالی وقفے کیوں رہ جاتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مقتدرہ کا جبر اور طاقت اساس نظام کی موجودگی میں ادیب اظہار کے علامتی یا نامکمل صورتوں کو اپناتا ہے۔ نو تاریخیت اور پسِ ساختیات معنی کے ان سکتوں کو بھرنے کے درپے ہے، یہ وجہ ہے کہ بعض ناقدین نے نو تاریخیت کو تہذیبی مادیت کے مماثل قرار دیا ہے۔ تہذیبی مادیت تاریخ میں مقتدرہ کے انکار سے عبارت ہے۔ عتیق اللہ نے مضمون کے آخر میں پسِ ساختیات، بین المتونیت اور نو تاریخیت کے باہمی مناسبات کا تذکرہ بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ نو تاریخیت بین المتونی مطالعے پر اصرار کرتی ہے۔

عتیق اللہ، کا مذکورہ مضمون پہلی بار نو تاریخیت کی مختلف جہات کو اردو میں متعارف کرواتے ہوئے نظر آتا ہے۔ تاہم اس کی بنیادی خامی یہ ہے کہ اس نے نو تاریخیت سے زیادہ تاریخی تنقید، تاریخیت اور تاریخ کے مارکسی تصورات پر اہمیت دی ہے۔ مزید کہ مضمون کے آغاز میں مباحث کی جو ترتیب درج کی گئی ہے، آخر تک پہنچتے پہنچتے وہ کہیں گم ہو جاتی ہے اور مباحث ایک دوسرے میں ضم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مضمون کی زبان وضاحت سے زیادہ تشکیک پیدا کرنے کا مباحث بنتی ہے۔ تاہم مجموعی طور پر اُردو میں پہلی مرتبہ نو تاریخیت کو پسِ ساختیات، بین المتونیت اور مارکسی و نو مارکسی تنقید سے اس کے انسلاک کی بنیاد پر پرکھا گیا ہے۔ یہ امر بھی قابلِ

ذکر ہے کہ نو تاریخیت کے بنیاد گزار محققین فوکو اور گرین بلاٹ کا تذکرہ محض نام لینے کی حد تک ہے۔ان کے تصورات کو چھیڑا تک نہیں گیا۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر، کا اہم ترین مضمون:**"نئی تاریخیت"** اُن کی کتاب "جُدید اور مابعد جدید تنقید"، میں ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔راقم کی نظر میں نو تاریخیت کے نظری مباحث پر اردو میں شائع ہونے والے تین چار اہم ترین مضامین میں سرِ فہرست ہے۔ کلی طور پر اس مضمون میں؛ تاریخ، تاریخی تنقید، تاریخیت، نو تاریخیت، تاریخیت ونو تاریخیت کے باہمی افتراقات واشتراکات، فوکو کے تصورات، گرین بلاٹ کی تصریحات، کیتھرین.بیلسی اور ریمنڈ ولیمز کی تنقیدات اور دیگر انتقادی مکاتب میں نو تاریخیت کے اختصاص' کو موضوعِ بحث بنایا گیاہے۔ مضمون کے آغاز میں نو تاریخیت کو مابعد جدید فکر اور تھیوری کا اہم مظہر قرار دیا گیاہے۔ناصر عباس نیّر کا ماننا ہے کہ، ادب اور تاریخ کی ہم بستگی کا تصوراتنا قدیم ہے، جتنا یہ دونوں۔۔۔ تاہم یہ تصور ایک شکل میں، ایک واحد اور جامد نظریے کے طور پر کبھی موجود نہیں رہا، کبھی ادب کو تاریخ پر اور کبھی تاریخ کو ادب پر برتری دی گئی ہے اور کبھی دونوں کو یکساں اہمیت بھی دی گئی ہے۔(۳۹) اس وضاحت کی کوکھ میں تاریخی تنقید، تاریخیت اور نو تاریخیت کے نظریات کے تحت تصورِ تاریخ کی بدلتی ہوئی صورت حال کو نشان زد کیا جاسکتاہے۔ تاریخ سے کیا مراد ہے؟ اس کے جواب میں صاحبِ مضمون کا کہنا ہے کہ اس لفظ کو دو معنوں میں استعمال کیا جاتاہے۔اول؛وہ واقعات جو عہد رفتہ میں وقوع پذیر ہوئے،۔دوم؛ان واقعات کا بیان اور بیان کے اسالیب۔مقالہ نگار نے اس بات کی خصوصی طور پر وضاحت کی ہے،پہلے یہ تصور کیا جاتا تھا کہ نیوٹن کے طبیعاتی ماڈل کی رو سے ہر مظہر کی تعبیر کی جا سکتی ہے۔ تاہم انیسویں صدی کے وسط میں ڈلھتے اور ہنرخ رکرٹ نے بتایا کہ تاریخ اور سائنس کی تعبیر کے اصول یکساں نہیں۔ان کے اثرات کے باعث تاریخ کو نئے زاویوں سے سمجھنے کی سعی کی گئی۔لہذا قدیم تاریخ کی جگہ تاریخیت نے لے لی۔

تاریخیت، سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کے جواب میں ناصر عباس نیّر کا کہنا ہے کہ تاریخیت، تاریخ میں اترنے، تاریخ کو سمجھنے اور برتنے کا طریقہ ہے۔۔۔۔ تاریخیت کے مختلف سیاقات میں جرمن، امریکن اور برطانوی اہم ہیں۔ تاریخیت ایک منہاجیاتی اصول ہے جو کسی مظہر یا واقع کو اس کے زمانی تناظر میں سمجھتا ہے اور تعبیر کرتا ہے۔ دوسرا نکتہ اس حوالے سے یہ ہے کہ تاریخیت ہر واقع کو (سماجی اور ثقافتی) کل کی نسبت سے سمجھتی ہے اور اسے کل (کی تشکیل) کا ایک مرحلہ گردانتی ہے، جس میں اس واقع نے کوئی مخصوص قدر و معنویت قائم کی۔ یوں تاریخیت دراصل تاریخ کی فلسفیانہ بصیرت دریافت کرنے سے عبارت ہے۔[۴۰] ناصر عباس نیّر نے تاریخیت کے مختلف مکاتب کی تفصیل بیان کر کے، اس امر کی صراحت کی ہے کہ اردو میں تاریخیت برطانوی فکر کی راہ سے وارد ہوئی ہے۔ مزید برآں، انھوں نے تاریخیت اور مارکسی فکر کے ارتباط سے تفصیلی بحث کی ہے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ تاریخیت نے تاریخ کو ادب کے متوازی ایک بیانیے کے طور پر پیشِ نظر رکھا، ایک ایسا بیانیہ جو اپنے اثر و رسوخ کے اعتبار سے حاوی ہے اور ادب جس کے اندر اور ماتحت ہے۔ یعنی یہ ادب اور تاریخ کا یک رُخا، اکہرا اور سیدھا سادہ ارتباط ہے۔ عملی اصطلاح میں اسے "یک زمانی"(SynChronic) کہا جاتا ہے۔ یک زمانی مطالعہ کسی شے کے اس تہہ نشیں نظام کو دریافت کرتا ہے جس کی موجودگی سے وہ شے مخصوص کارگردگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ زمانی جہت کی وجہ سے تاریخ ہمیشہ ادب پر حاوی رہتی ہے اور ادب کی خود مختار حیثیت سوال کی زد میں آتی ہے۔

اگر تاریخیت میں ادب اور تاریخ باہمی روابط کا خیال رکھا جاتا ہے، تو نو تاریخیت نے کیا نیا یا اختراعی تصور وضع کیا؟ اور ادب کو کس نئے زاویے سے خود مختار حیثیت سے ہم کنار کیا؟ اس کی تشریح میں مقالہ نگار نے "فرڈی نینڈ ڈی سوشیور"(Ferdinand de Saussure) سے مستعار "دو زمانیت" (Diachronic) کی اصطلاح برتی ہے۔ دو زمانی مطالعے میں، کسی شے کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کو سمجھا جاتا اور اُن کی توجیہہ کی جاتی ہے اور یوں ہر واقعے کو منفرد اور غیر تکراری قرار دیا جاتا ہے۔ یک زمانی مطالعہ کلچر سے، جب کہ دو زمانی مطالعہ تاریخ کے

واقعات سے استمداد حاصل کرتا ہے۔ دوزمانی جہت کی رو سے نوتاریخیت ادب اور تاریخ کے سیدھے سادھے باہمی ربط کی قائل ہے، نہ ایک کو دوسرے پر برتری دیتی ہے۔ یہ دونوں کو مساوی اہمیت سے ہم کنار کرتی ہے۔ تاریخ اور کلچر ہر دو کو ممزوج کرتی، تاریخ کو ایک متن گردانتی اور ادبی متن سے اس کے رشتے کو دریافت کرتی اور پھر ادبی و تاریخی متون کو ایک ثقافتی شعریات کا مشترک حصہ مانتی ہے۔ یوں نوتاریخیت نہ تو ادب کو تاریخ سے بالکل آزاد اور کٹا ہوا سمجھتی ہے، اور نہ ہی ادب کو تاریخ کے سہارے پر مطلقاً چھوڑ دیتی ہے۔ لہٰذا وہ ادب کی محدود خود مختاری کی قائل نظر آتی ہے۔ مزید لکھتے ہیں:

> "نئی تاریخیت ادب کو اس کے خارجی منظر نامے سے منسلک قرار دیتی ہے، مگر یہ ادب اور خارج یا تاریخ میں براہ راست اور سیدھے سادے رشتے کی قائل ہر گز نہیں۔ اس کی رو سے ادب سماجی صورتحال اور تاریخی قوتوں کا صاف اور سچا عکس نہیں۔ نوتاریخیت ادب اور تاریخ اور ان دونوں کے ربطِ باہم کے ان تصورات کی حامل ہے جو ساختیات اور پسِ ساختیات نے دیے ہیں۔ نوتاریخیت میں ادب اور تاریخ دونوں متن اور ڈسکورس ہیں اور یہی دونوں کو ایک ناگزیر منطقی رشتے میں باندھتی ہے"۔(۴۱)

نئی تاریخیت کی اس شرح سے، ریاض صدیقی کے نوتاریخی تناظر کے سیاسی پس منظر کے حوالے سے بیانات کی تردید بھی ہو جاتی ہے۔ جو ساختیات کو نئی تنقید کی مثل قرار دے کر اسے جدیدیت کی پروپیگنڈا تھیوری کے ذیل میں دیکھتے ہیں۔ ریاض صدیقی کی ساختیات شناسی، ادھوری تفہیم کا نتیجہ ہے، اس لیے کہ ساختیات میں لسانی عمل براہ راست کلچر سے جڑا ہوا ہے اور کلچر وسیع معنوں میں تاریخ کا ناقابلِ تفکیک جزو ہے۔

ناصر عباس نیّر کے نوتاریخی تناظر کی ہمہ جہتی کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے "کولاژ"(Collage) کے مثل قرار دیا ہے۔ کولاژ آرٹ کی وہ صورت ہے جس میں کسی کینوس پر مختلف اشیاء کو بے ترتیبی اور غیر منظم انداز میں

جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ عمل اپنی اصل میں علامتی ہے اور بے ربطی کے ذریعے کثرت کا اظہار یہ ہے۔ مقالہ نگار نے نو تاریخیت کی فکری پر داخت میں اس کے بنیاد گزار گرین بلاٹ (Stephen Green blatt) اور فوکو کے نظریات کا تفصیلی محاکمہ بھی مضمون کے متن کا حصہ بنایا ہے۔ فوکو کے "اے پیس ٹیم "(Episteme) کے تصور کے تحت، مقالہ نگار نے، نو تاریخیت کو ادب اور تاریخ کے متون کی باہمی مشارکت کو ثقافتی شعریات کی تشکیل میں معاون گردانتا ہے۔ جبکہ گرین بلاٹ کے تصورات کے ضمن میں اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ نو تاریخیت ایک عہد کے کسی ادبی متن کو اس عہد کے کسی بھی متن کے متوازی رکھتی اور دونوں میں کارفرما مشترک حکمت عملیوں کو نشان زد کرتی اور ان کا تجزیہ کرتی ہے۔ ناصر عباس نیّر نئی تاریخیت کے برطانوی روپ کی شرح کرتے ہوئے، ثقافتی مادیت کے نظریے کی وضاحت کی ہے۔ اس نظریے کے اہم پر چار ریمنڈ ولیمز اور کیتھرین بیلسی ہیں۔ نو تاریخیت کی طرح، یہ بھی ادب اور تاریخ (ثقافت) میں لازمی تعلق کی نوعیت کے سلسلے کو تھیوری کی صورت میں واضح کرتی ہے اور اس ضمن میں پس ساختیاتی مفکرین مثلاً دریدا، آلتھیوسے اور فوکو وغیرہ کے افکار سے استفادہ کر کے، ایک امتزاجی روپ میں سامنے آتی ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> "ریمنڈ ولیمز کی یہ ثقافتی تھیوری ادبی تاریخ اور ادبی متن کو ایک نئے زاویے سے پیش کرنے کا امکان رکھتی ہے۔ نہ صرف ادب کی بعض اصناف اور بعض ادوار کو حاوی، باقیاتی اور نوخیز کلچر کے نمائندوں کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے، بلکہ ایک متن کے اندر کلچر کی یہ تینوں صورتیں بھی تلاش کی جاسکتی ہیں۔ ریمنڈ ولیمز ثقافت سے تعرض کرنے کی بنا پر تاریخ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا مگر کیتھرین بیلسی نہ صرف تاریخ پر توجہ مرکوز کرتی ہے بلکہ سیاست اور ادب کے تعلق پر بھی تفصیلاً اظہارِ خیال کرتی ہے۔ اُس کی نظر میں ادب سیاسی تاریخ سے الگ نہیں، ادب ایسا متن نہیں ہے جو خود مرتکز (Self-Centred) اور خود مختار ہو۔ اپنے

اس نقطہ نظر کے اثبات کے ضمن میں وہ فوکو کے تصورِ تاریخ کو بہ طور پر استدلال پیش کرتی ہے"۔ (۴۲)

اس وضاحت سے یہ تاثر بھی ابھر کر سامنے آتا ہے کہ نو تاریخیت کا برطانوی روپ، تاریخ اور ادب کے رشتے کے ضمن میں مقتدرہ اور اتھارٹی کو چیلنج کرنے کا رویہ بھی ہے۔ فوکو کے تصورِ تاریخ، بیلسی کے ادب وسیاست کے باہمی ملاپ سے سامنے آنے والی ثقافتی مادیت تمام طاقت اساس رشتوں کی نفی کرتی ہے۔ یوں، بادی النظر میں نو تاریخیت میں نو آبادیاتی طرزِ فکر سے قریب ہو جاتی ہے۔

ناصر عباس نیّر کا مذکورہ مضمون اردو میں نو تاریخی نظریے کی وضاحت کرنے والا کلیدی ترین مضمون ہے، جس میں اس نظریے کے بنیاد گزاروں کے اصلی بیانات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر مغرب میں ہونے والی جدید ترین مباحث کو بڑی سلاست، روانی اور کسی حد تک آسان زبان میں سامنے لایا گیا ہے۔ نو تاریخیت کی وجودیات اور علمیات کے انکشاف میں نہ صرف یہ کہ اہم ناقدین کی آراء سے استفادہ کیا گیا ہے، بل کہ مضمون میں جابجا مقالہ نگار نے اپنی تنقیدی بصیرت سے دانش ورانہ آرا بھی پیش کی ہیں۔ نو تاریخیت کے مختلف مکاتبِ فکر کی تفصیل میں تقابلی طریقہ کار کے ذریعے خامیوں اور خصائص ہر دو کو منظر نامے پر اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ، تاریخی تنقید اور تاریخیت کے طریقہ ہائے کار کی وضاحت کے ذریعے، تنقید و فکر کے نو تاریخیت تک سفر کو، مضبوط علمی بنیادیں فراہم کی گئی ہیں۔ مضمون کی سب سے اہم خوبی مباحث کا منظم اور آشکار ہونا ہے۔

وہاب اشرفی کا مختصر مضمون:**"مابعد جدیدیت---تاریخیت، نئی تاریخیت "**اُن کی کتاب"مابعد جدیدیت۔۔۔ مضمرات وممکنات"، میں شامل ہے۔ یہ کتاب بھی ۲۰۰۴ء میں سامنے آئی۔ وہاب اشرفی، نے نو تاریخیت پر بات کرتے ہوئے، تاریخ، تاریخیت پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ فوکو، پر مضمون میں سب سے زیادہ بات کی گئی ہے، اس کے علاوہ "گرین بلاٹ" اور "ثقافتی مادیت" کے نظریے پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مضمون

کے آغاز میں تاریخیت کو ایک ایسی تھیوری کے طور پر دیکھا گیا ہے، جو انسانی اعتقادات، تصورات، اخلاقیات اور رہائش کے طریقے کا ایک واضح بیانیہ سمجھی جاتی رہی ہے۔ مزید یہ کہ اس کا ایک مقصد ثقافتی رابطے کو واضح کرنا ہے۔[۴۳] مقالہ نگار نے نو تاریخیت کی فکری پرداخت سے پہلے تاریخ نگاری کے عمومی تصور کی تفصیلی بحث لازمی سمجھی ہے۔ کہتے ہیں کہ؛ عمومی تصور میں تاریخ نگار ہمہ تن متن میں شریک ہو کر ایک پاس دار بن جاتا ہے اور اس کی آنکھ پر ایک عینک چڑھی ہوتی ہے، جس سے وہ چیزوں کے ایسے دیکھتا ہے، جیسے عینک اُسے دکھاتی ہے۔ لہٰذا اس وقائع نگاری کوئی معتبر شے نہیں۔ گویا یہ یک طرفہ تاریخ ہے جو ہر وقت ایک ہی طرف بیانات جاری کرتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس، وہ نو تاریخیت کو مابعد جدید رویہ ہونے کے باوصف نئے تناظر کو سامنے لانے والی اور یکسانیت کو ختم کرنے والا مظہر گردانتے ہیں۔ یہ دو طرفہ عمل سے عبارت ہے۔ وہاب اشرفی کے بقول، نو تاریخیت تاریخی تجزیے میں سامنے آنے والے سادہ روابط سے عبارت نہیں، بل کہ یہ روابط کو ادبی متن کا درجہ دینے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ گویا تاریخ نگاری اب ادبی کام ٹھہرا اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

> "نو تاریخیت کسی بھی مرحلے میں اتحاد سے برسرِ پیکار نظر آتی ہے۔ پرانی تاریخیت Unity پیش کرتی ہے اور یہی ادبی متن سے توقع رکھتی ہے۔ جب کہ نو تاریخیت میں اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے کہ متن Dynamic ہوتا ہے۔ جس میں کثرت کے مختلف عناصر داخل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے متن کو Unstable ہونا ہی ہے"۔(۴۴)

وہاب اشرفی، نے نو تاریخی ناقدین میں باختن، آلتھیوسے، ہیڈن وی وائٹ، گولڈمان، ریمنڈ ولیمز، کلی فورڈ اور فوکو کے نام درج کیے ہیں۔ جبکہ فوکو کے تاریخ اور طاقت پر تصورات کا مختصر تذکرہ بھی کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ فوکو کا یہ خیال رہا ہے کہ پرانی تاریخ نویسی ثقافت کے مختلف روپ اور رنگ کو دیکھنے سے دل چسپی نہیں رکھتی بل کہ ایک طرح کے متعینہ ثقافتی کلچر کی نشان دہی کرتی ہے۔ لہٰذا اس کا متن گہرا اور صورتِ واقعہ سے دور

ہے۔ حالاں کہ ثقافت مختلف مراحل سے دوچار رہتی ہے، اس میں تضادات ہوتے اور طاقت و حکم رانی کے نشانات ، منقش ہوتے ہیں۔ لہذا فوکو نے ثقافت کی تفہیم کے حوالے سے ایک ایسا بیانیہ تشکیل دینے کی کوشش کی جس کے ذریعے طاقت کے تضادات نمایاں ہوں اور تاریخی عمل میں طاقتوں کی نمود کا واضح اظہار ہو سکے۔(۴۵) گرین بلاٹ نے فوکو کے نظریات سے متاثر ہو کر نو تاریخیت کی تھیوری کو علمی بنیادوں پر استوار کیا اور ثقافتی شعریات کو دریافت کیا۔ وہاب اشرفی، نے ثقافتی مادیت کی توضیح اور نو تاریخیت سے افتراق و اشتراک پر Geremy Howthorn کا طویل انگریزی اقتباس بھی درج کیا، تاہم اس اقتباس میں درج ایک بھی نکتے کے موضوع نہیں بنایا اور نہ ہی اس پر کسی تاثر کا اظہار کیا ہے۔ اس اقتباس میں ثقافتی مادیت کو کلچر سے، جب کہ نو تایخیت کو ماضی (تاریخ) سے وابستہ قرار دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر مضمون نگار کسی نئی بات کا انکشاف نہیں کرتا۔ مزید یہ کہ مختصر ہونے کی بنا پر نا تو نو تاریخیت کا واضح تصور ابھر کر سامنے آتا ہے اور نہ ہی اس کی متعلقہ مباحث کے متعلق ٹھوس آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ نسیم عباس احمر کے مطابق: "وہاب اشرفی کا مضمون تاریخیت اور نو تاریخیت کے اٹوٹ رشتوں کے بیان کی ادھوری سرگزشت ہے"۔(۴۶)

گوپی چند نارنگ، کا مضمون: **"تاریخیت اور نو تاریخیت :ادبی تھیوری کا ایک اہم مسئلہ"** اُن کی کتاب "جدیدیت کے بعد" میں شامل ہے، جو کہ ۲۰۰۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس مقالے میں گوپی چند نارنگ نے ادب اور تاریخ کی جدلیات، ہیئت پرستی کے اردو اور عالمی تنقید پر اثرات، جدیدیت اور اس کا زوال، ادب اور ثقافت کے باہمی روابط، تاریخیت، نئی تایخیت، آلتھیوسے کے تفکرات اور نو تاریخیت کے تانیثی و مابعد نو آبادیاتی تنقید سے روابط کو، تنقید کے ایک تاریخی سفر کے طور پر قلم بند کیا ہے۔ مباحث کی تقسیم مختلف حصوں کی مرہون ہے اور زمانی ترتیب کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مباحث کا ترتیب وار تجزیہ کیا جائے۔ مضمون کا آغاز استفہامیہ انداز کا حامل ہے۔ گوپی چند نارنگ، نے سوال اٹھایا ہے کہ اگر پوچھا جائے کہ کیا ادب بے تعلق تاریخ ہے؟ تو ہر شخص کہے گا نہیں۔۔۔ لیکن اگر تاریخ کی قید سے باہر نہیں تو پھر یہ خود مختار و خود

کفیل کیسے ہے؟ صاحبِ مقالہ نے اس تضاد کو ابھار کر کہا ہے کہ مسئلہ اتنا سیدھا سادا نہیں، جتنا بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ ادب اور تاریخ کا جدلی رشتہ شروع سے چلا آرہا ہے۔ ادب تاریخ کا آئینہ ہے بھی اور نہیں بھی۔۔۔ ادب تاریخ کا ترجمان ہے بھی اور نہیں بھی۔۔۔ چناں چہ اس رابطہ کے متعلق دو طرح کے متخالف رویے موجود ہیں۔ "اول یہ کہ ادب تاریخ کا زائیدہ ہے اور ادب کا وہی مطالعہ صحیح اور مناسب ہے جو تاریخی اور سماجی تناظر کے ساتھ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ادبی متن ایک نامیاتی کُل ہے۔ یہ آزاد اور خود مختار ہے اور ادبی مطالعہ ادبی اصولوں کی مدد سے آزادانہ کرنا چاہیے نہ کہ خارجی یعنی تاریخی (سماجی وسیاسی) اصولوں کی مدد سے"۔[۴۷] یہ دونوں رویے دو مختلف تعبیرات کے حامل ہیں۔ اول الذکر؛ میں یونانی دور سے چلے آرہے "نظریۂ نقل"(Mimesis) کے اثرات نمایاں ہیں، ثانی الذکر؛ کے ڈانڈے "ارسطو" کے ادب کے داخلی نظام پر زور دینے کے تصور سے ملتے ہیں۔ اسی طرح حقیقت نگاری کا رابطہ اول الذکر سے ہے، جبکہ فارملزم اور دیگر تمام ہیئت پسند ادبی مکاتب ثانی الذکر نظریے کی شرح ہیں۔ بیسویں صدی میں ہیئت پسندوں نے اتنی شدت اختیار کی ہے کہ تاریخیت کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ یہ تفریق جدیدیت کے نتائج میں سے ہے، جسے ترقی پسندی نے رد کیا ہے اور تاریخ کی اہمیت سے ہم کنار کرنے کی کوشش کی۔ گوپی چند نارنگ نے اُردو ترقی پسند نقادوں کو ادبی مطالعات میں تاریخ کو محض سرسری اور آرائشی حیثیت دینے پر گرفت کیا۔ مزید بر آں، اس نکتے کو بھی اٹھایا ہے کہ جدیدیت کے تحت سامنے آنے والے ہیئت پسند تناظرات کو اُردو میں اُس وقت سامنے لایا گیا، جب مغرب میں ان کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ جو کہ ایک اہم نکتہ ہے۔ اس تمام صورت حال نے رفتہ رفتہ بغاوت کے رویے کو جنم دیا اور آخر کار ادبی مطالعے کا جو نیا طور سامنے آیا، اسے نو تاریخیت کہا جاتا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اس تمام بحث کو خالص تنقیدی اصطلاحات کے ذریعے اسے ادب کی "معروضیت" (Objectivity) اور "اور یجنلٹی"(Originality) کے تصور سے جوڑا ہے۔ ان دونوں رویوں میں ادب کی "Intrinsic" اور "Extrinsic" اقدار کی مباحث کو جنم دیا۔ اس تناظر میں نو تاریخیت کے سوال نے ان مباحث کو دوبارہ نئے زاویے سے روشن کیا:

"نئی تاریخیت کو سامنے لانے کا بڑا مقصد یہی تھا کہ ادب اور تاریخ کے رشتے کی پیچیدگی پر از سرِ نو غور کیا جائے اور اس گتھی کو ادب کی خاص نوعیت کے پیشِ نظر سلجھایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ادب کی اوریجنلٹی اور داخلی اقدار کے تصور کو جہاں تک ممکن ہو سکے انگیز کیا جائے، کیونکہ ادب جہاں ثقافت کا پیدا کردہ ہے وہاں ادب ثقافت کو پیدا بھی کرتا ہے"۔ (۴۸)

اردو میں، گوپی چند نارنگ نے نو تاریخیت کی نظری مباحث میں ادبی اقدار کے مسئلے کو اجاگر کر کے، اسے ادب کی وجودیات کے سوال میں بدل دیا۔ یہ اب تک سامنے آنے والی نو تاریخی مَباحث کی تفہیم کا وسیع اور اختراعی نقطۂ نظر ہے۔ اس کے بعد گوپی چند نارنگ نے ساختیات کے متعلق پائی جانے والی عمومی غلط فہمی کہ وہ بھی تاریخ و ثقافت کو نظر انداز کرتی ہے، کا ازالہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ساختیات ثقافت پر انحصار کرتی ہے اور یہ نکتہ اپنی اصل میں تاریخیت کے گہرے بیج کا حامل ہے، کیوں کہ ثقافت تاریخ کے محور اور تاریخ کے اندر رہے۔ انہوں نے نشانیات اور قاری اساس تنقید کے تدریجی سفر کے ذریعے نو تاریخیت کے لسانی مضمرات کو بھی واضح کیا ہے۔

اسٹیفن جے گرین بلاٹ، نے تاریخ اور ادبی متن کے رشتے پر از سرِ غور کیا۔ بلاٹ کے ادبی سفر کے تدریجی مراحل کے بیان کے بعد، گوپی چند نارنگ نو تاریخیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "نو تاریخیت دراصل قرأت کے اس عمل کا نام ہے، جس کے ذریعے یہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ کس طرح ادبی متون نہ صرف اپنے زمانے کے طور طریقوں اور اعتقادات کو ظاہر کرتے ہیں، بل کہ ان طور طریقوں اور اعتقادات کو بناتے اور متاثر بھی کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح سماج وحدانی نہیں ہے، ادب بھی واحدانی نہیں ---ادب نہ صرف ثقافتی طور پر پیدا ہوتا ہے، بل کہ ثقافتی اطوار کو پیدا بھی کرتا ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ شیکسپیئر برطانوی کلچر کی، کالی داس قدیم ہندوستانی کلچر کی، دانتے اطالوی کلچر کی، گوئٹے جرمن کلچر کی، حافظ ایرانی اور غالب مغل کلچر کی پہچان مانے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا ذہن وشعور یا ان کی "تخلیقیت" ان کے اپنے کلچر کی زائیدہ و پروردہ

ہے۔"[۴۹] اس بحث کے ذریعے انہوں نے نو تاریخیت کے دو رخی تصور کی وضاحت کو اپنے قائم کیے ہوئے مقدمے (ادب کی داخلی و خارجی اقدار) کے تناظر میں آگے بڑھایا ہے۔ اس مقام پر نو تاریخیت اور تاریخیت کے افتراق کو کلچر کے واحدانی اور غیر وحدانی نظام کے مطابق سے سمجھانے کی سعی کرتے ہیں اور کلچر و تاریخ کے تصور کو فوکو کے نظامِ فکر کی مدد سے نمایاں کرتے ہیں۔

نو تاریخیت کے برطانوی دھاوے؛"ثقافتی مادیت" کی وضاحت میں انہوں نے مختلف ناقدین کی آرا سے استفادہ کرتے ہوئے، بات کو فوکو، باختن، آلتھیوسے اور ریمنڈ ولیمز کی آراء کے ذریعے سمیٹا ہے۔ ثقافتی مادیت کے تصور کے تحت ریمنڈ ولیمز نے کلچر کے تین اطوار؛"بچا کچھا، حاوی اور نمو پذیر" کو بیان کیا ہے، اس کی وضاحت ناصر عباس نیّر نے اپنے مقالے میں کی ہے، گوپی چند نارنگ نے اسے مزید واضح کیا ہے۔ تاہم آلتھیوسے کے تصورات کے ذریعے ثقافتی مادیت کی تعبیر اور کلچر کی وضاحت نارنگ نے ہی پہلی مرتبہ سرانجام دی ہے۔ انہوں نے یہ صراحت بھی کی کہ بیلسی کے تصورات کو آگے بڑھانے میں آلتھیوسے کی ہم کاری "مشل پیشو" (Michel Pecheox) نے کی۔ نارنگ نے اس نئے نکتے کا اضافہ بھی کیا کہ برطانوی ثقافتی مادیت نے فوکو کی تاویلات سے بچنے کے لیے باختن کے تصورات سے استفادہ کیا۔ "میخائل میخائیلو وچ باختین" کی ادبی فکر میں "کارنیوال" (Carnival) کا تصور اور "ڈیگالوسیا" (Diglossia) اسے ایک ریڈیکل بنیاد فراہم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ان مباحث سے وہ ثقافتی مادیت کے تصور کی وضاحت کے بعد نو تاریخیت کو وہ ثقافتی اور تاریخی معنی کی بازیافت سے تعبیر کرتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے نو تاریخیت اور پسِ ساختیاتی فکر سے اس کے انسلاک کی بنیاد پر، نسوانیت اور مابعد نو آبادیاتی فکر سے مطابقت کی صورتوں کی وضاحت بھی کی ہے۔ اس ذیل میں نئی تاریخی سوچ مذکورہ بالا دونوں مکاتبِ فکر سے ہم آہنگ ہے کہ یہ بھی طاقت کو اور مقتدرہ کے تسلط کو ماننے سے انکار کرتی ہے۔[۵۰]

گوپی چند نارنگ کا مذکورہ مضمون اُن کے تنقیدی افق کی ہمہ جہت وسعت اور ادبی تفہیم کی گہرائی کا عکاس ہے۔ انھوں نے مغربی تنقید کے تاریخی و فکری ارتقاء اور اس کے نو تاریخیت تک کے تسلسل کو بڑے وقیع اور مدلل و منظم انداز میں پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں کئی نئی کوششوں اور نئے محققین کی آرا کو نو تاریخیت کے فکری محیط کی وضاحت میں بر سرِکار لایا گیا ہے۔ اردو میں نو تاریخیت کی نظری مباحث پہلی بار تفصیل سے "آلتھیوسے"، "باختین" وغیرہ کے نکتہ ہائے نظر سے آشنا ہوئی۔ مزید بر آں، نو تاریخیت کو دیگر مابعد جدید تھیوریوں سے مرتب کر کے دیکھنا بھی گوپی چند نارنگ کے اختصاصات میں سے ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ، کا مفصل مقالہ (مضمون) بعنوان :**"نو تاریخیت اور اس کا پیش و پس"**، ۲۰۰۵ء میں اُن کی کتاب "تعصبات" میں سامنے آیا۔ یاد رہے کہ عتیق اللہ کا نو تاریخیت پر یہ دوسرا مضمون ہے۔ اس سے پہلے اُن کا ایک مضمون ۲۰۰۲ء میں طبع ہوا تھا۔ اس مضمون کے حوالے سے یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ اس کا بیش تر حصہ پرانے مضمون کے مشمولات پر مشتمل ہے۔ عتیق اللہ نے پرانے مضمون میں ایک جان دار ابتدائیہ، تاریخ و تخیل کا ربط، تاریخی تشکیل میں زبان کا کردار، تہذیبی مادیت اور نو تاریخیت اور اس کے سر گردہ ناقدین کی تفصیلی آرا کو شامل کر کے، اسے مکمل کیا ہے۔ ان اضافوں نے نو تاریخیت کی نظری مباحث میں واقعتاً اضافہ کیا ہے۔ لہٰذا نئی صورت میں یہ مقالہ اردو میں نو تاریخیت کے نظریے پر اہم دستاویز بن گیا ہے۔

شروعات میں عتیق اللہ نے چند سوالات قائم کیے ہیں اور بعد ازاں ان سوالات کے جواب میں مضمون کے ابتدائی حصے میں مباحث کی تنظیم ہے۔ کہتے ہیں کہ تاریخیت اور نو تاریخیت کی تفصیل سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ تاریخ اور تاریخ نگاری کے عمل کی نوعیت کیا ہے؟ تاریخ اپنی اصل میں کیا ہے؟ اس کے معاون عوامل کیا ہیں؟ تاریخ کے متن کے ماخذ کی کسوٹی کیا ہے؟ پہلے سوال کے مطابق سے "تاریخ" کی وضاحت انہوں نے "فرینکلن رڈولف اینکر سمیٹ " (Franklin Rudolf AnkerSmit) کے بیانات کی روشنی میں یوں کی ہے:

"(اُس نے) تاریخ کو ایک ایسے انفرادی بیانات کا مجموعہ کہا ہے جن کی بنیاد پر متون تشکیل پاتے ہیں۔اس میں بعض محض خیالی اور من گھڑت بھی ہوتے ہیں۔ چوں کہ ان کا تعلق ماضی سے ہے اس لیے ماضی بحیثیت ایک زمانے کے ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہوتا ہے۔اسی لیے ان بیانات کے جھوٹ اور سچ کا پتہ لگانا بھی بڑا مشکل کام ہے۔ بعض ماخذات کی تحقیق سے ہمیں ان کے اصل اور ان کی حقیقت کا جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی مکمل نہیں ہوتا۔ تاریخ بھی مجازی، تخیلی اور کہانی کی طرح تخلیقی نوعیت رکھتی ہے۔اس لیے تاریخ کو واقعیت کی نمائندہ یا واقعی طور پر تجزیے اور مشاہدے پر مبنی سچ کا نام نہیں دیا جاسکتا۔۔۔۔۔ ہمارے لیے ماضی کے واقعات کا ماخذ ماضی کے وہ بیان یا کہانیاں ہیں جن میں تاریخ کو متنایا گیا ہے۔"(۵۱)

یعنی تاریخ کبھی بھی اپنی اصلی حالت میں بعد میں آنے والوں کے لیے محفوظ نہیں رہتی۔ بل کہ یہ فکشن کی طرح، حقیقت کی موجودگی کے باوجود، تخیل کی امکانی صورتوں کی طرح پائی جاتی ہے۔اسی طرح تاریخ، تخیل اور حقیقت کا آمیزہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ تاریخ بھی کسی بیان کرنے والے کے بیانیہ کا نتیجہ ہے۔ حتیٰ کہ ملفوظی شکل میں بھی یہ تخیل سے مربوط ہے،اس لیے کہ بذاتِ خود ملفوظی ساخت تاریخ کو تخیل آشنا کرنے میں معاون ہے۔ مضمون نگارنے " ہیڈن وی وائٹ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ: تاریخ کو ایک ملفوظی نثری ساخت کے ساتھ ساتھ تاریخ کے مواد کو بھی تخیلی بتاتا ہے۔ تاریخ دان تاریخی بیانیوں کی تشکیل میں معلوم حقائق کے ساتھ تخیلی کلیوں کو بھی لازمی گردانتے ہیں۔ لہٰذا تاریخ حقیقت کی ایک متنائی ہوئی صورت ہے، جسے ہم تاریخ کہتے ہیں وہ فوق التاریخ ہے۔ہیڈن وی وائٹ کے نزدیک تاریخ نگاری کرونیکل (زمانی ترتیب) کے عنصر کی حامل ہے۔اس میں کہانی(افسانویت) کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس کہانی کو باقاعدہ پلاٹ کاری کے عمل سے گزارا جاتا ہے۔ تاریخ دان اس کہانی(تاریخ) کو علت و معلول کے رشتوں کے ذریعے مکمل کرتا ہے۔ یہ چاروں عناصر مل کر تاریخ کی تشکیل

کی تخیلی بنیادیں وضع کرتے ہیں۔یہی نہیں ہر تاریخ دان کی اپنی ایک آئیڈیالوجی ہوتی ہے، جس کی بنیاد پر تاریخ کے خاص واقعات کو بیانیے میں نمایاں کیا جاتا ہے۔یہاں ہیڈن وائٹ نے بہت اہم نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے۔کہ تاریخ کیوں کہ زبان میں لکھی جاتی ہے،اور زبان میں استعارہ کا عمل دخل واضح ہے،لہذا استعارہ تاریخی متن میں حقیقت کے متبادلات کے امکان کو بڑھادیتا ہے۔باالفاظ دیگر حقیقت کثرت کا شکار ہو جاتی ہے۔زبان اور تاریخ کے مناسبت سے مقالہ نگارنے "رچرڈ روٹری" کی رائے نقل کی ہے:

> "رچرڈ روٹری کے نزدیک وہ حقیقت یا صداقت جو تاریخ کی تاریخ واریت ہمیں دکھاتی ہے۔ضروری نہیں کہ واقعی حقیقت یا صداقت ہو۔ہمارے پاس زبان کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، جو ہمیں حقیقت کا علم مہیا کر سکے، لیکن روٹری مجازی کردار کے باعث زبان کو شفاف وسیلہ قرار نہیں دیتا۔۔۔گویا زبان سے اظہار ہی نہیں اخفا اور گریز کا بھی کام لیا جاتا ہے۔" (۵۲)

ان وضاحتوں کے بعد عتیق اللہ نے اپنا نو تاریخیت پر سابقہ مضمون پورا کا پورا نقل کیا ہے۔جس میں انہوں نے روایتی تاریخی طریقہ کار، مارکسی اور نو تاریخی طریقہ کار کی وضاحت کی تھی۔اُس مضمون کا جائزہ پہلے ہی لیا جا چکا ہے۔اس کے بعد وہ باقاعدہ نو تاریخیت کے تصور کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔نو تاریخیت سے قرأت کا ایسا طریقہ مراد لیتے ہیں جس کا اصرار متن کے نہایت غائرا اور مرکوز مطالعے پر ہے۔یہ اپنی اصل میں قرأت کا طریقہ کار ہے، جو بتاتا ہے کہ فن پارے کو کیسے پڑھیں اور دیگر متون جیسے اقتصادیات، طبی دستاویزات، قانونی کتابچے وغیرہ کے علاوہ متنی سیاقات کی روشنی میں اس کی تفہیم کیسے کی جاسکتی ہے۔پروفیسر عتیق اللہ نے لکھا ہے کہ اس طریقہ قرأت کی اولین مثال گرین بلاٹ اپنی معروف کتاب:-Renaissance Self-Fashioning:From More to Shakespeare" میں دستیاب کی۔(اور "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" کی اس کتاب کا نام بھی صاحبِ مقالہ نے غلط لکھا ہے۔)اس مطالعے کے ذریعے ماضی کی ایک نئی شکل وصورت ابھر

کر سامنے آئی۔ بلاٹ نے ۱۹۸۸ء میں نو تاریخیت کی اصطلاح کو واضح کر کے زور دیا کہ یہ ایک "متنی عمل" یا "متنی سرگرمی" ہے۔ اُس نے فن پارے کی تاریخی صورت حال اور منشائے مصنف کی اہمیت کے باوصف اس کی سماجی اور آئیڈیالوجیکل حیثیت دریافت کو "ثقافتی شعریات"(Cultural Poetics) کانام دیا۔ مقالہ نگار نے گرین بلاٹ سے دس سال قبل منظر عام پر آنے والے "جے ڈبلیو۔لیور"(Julius Walter Lever) کے ڈراما اور تھیٹر پر کام کا بھی حوالہ دیاہے، جس نے نو تاریخی میلان کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے نو تاریخیت کے ذیل میں سامنے آنے والے دو گروہوں کا ذکر بھی کیاہے۔ پہلے گروہ میں: "میرلن بٹلر، سرجوری لیونس، جیروم مگ گن اور ڈیوڈ سمپسن "شامل ہیں، جو رومانوی تناظر کے حامل ہیں۔ دوسرے، گروہ میں:" جوناتھن گولڈ برگ، گرین بلاٹ اور لوئی مونٹروس" کے اسماہیں، جنھوں نے نشاۃ الثانیہ کے مطالعات میں نو آبادیات اور سیاسی تناظر کو اپنایا۔ عتیق اللہ نے دوسرے گروہ کے نظریات کا تفصیلی جائزہ لیاہے۔

نو تاریخیت ایک دور کے ادبی و غیر ادبی متون کا مطالعہ ہم وقتیت کے تحت کرتی ہے۔ لوئی مونٹروس، نو تایخیت کو متن کی تاریخیت اور متنیت کی تاریخ کہتاہے۔ اس نکتے کی شرح کرتے ہوئے مقالہ نگار نے لکھاہے:

> "اس معنی میں فن کی جڑیں کسی واضح اور ٹھوس صورتِ حالات اور طاقت Power کے رشتوں میں جمی ہوتی ہیں۔ ادبی پیش منظر Fore Grounding اور تاریخی پس منظر Historical Back Ground کے بجائے نو تاریخیت ادبی اور غیر ادبی متون کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھتی ہے۔ کیوں کہ وہ ادبی اور غیر ادبی فن کے درمیان کوئی خطِ امتیاز نہیں کھینچتی۔۔۔۔۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے سوال بھی رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی آگاہی میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ تاریخ کی متنیت اور فنون کی تاریخیت میں ایک مشترک اور باہمی ترغیب

کی صورت بھی ہوتی ہے۔بقول گرین بلاٹ نو تاریخیت ہماری قرأت کو ماضی کے

تمام متنی آثار کی طرف پُر جوش طریقے سے مائل کرتی ہے۔" (۵۳)

ماضی پر نو تاریخیت کا اصرار بجا ہے۔ اس لیے کہ متن میں انفرادی سیاق کی گوناگوں صورتوں کے علاوہ، سماجی سیاقات کی متنوع حالتیں ایک نوع کے جبر کو قائم کرتی ہیں۔ یہ جبر جس جدلیات کو وقوع پذیر کرتا ہے، وہ طاقت کے رشتے کو وجود میں لانے کا سبب ہیں۔ نو تاریخی ناقدین ادب اور تاریخ کی باہمی استمداد سے طاقت اور جبر کے بیانیوں کو زائل کرنے کے درپے ہیں۔ گرین بلاٹ نے نشاۃ الثانیہ کے ڈراموں کا مطالعہ اس عہد کی ان دہشت زدہ نوآبادیاتی پالیسیوں کے توسط سے کیا، جنہیں مرکزیت نے اپنے وسیع مفادات کے لیے استعمال کیا۔ اس نے دیگر کئی محرکات کے علاوہ پریس کی آمد کو بھی "طاقت کے اوزار" کی صورت قرار دیا ہے، جس نے خاص نہج پر مذہب، عقیدے اور بادشاہ کے تئیں وفاداری کے ضمن میں، لوگوں کی ذہنی تربیت کی۔ نو تاریخی تناظر، تاریخ میں چھپے ہوئے ان محفوظ و غیر محفوظ محرکات کے باوصف، دراصل طاقت کے کھیل کی، رد تشکیل کرتا ہے۔ طاقت کے مظاہر مختلف ہو سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ مخصوص اور بندھی ٹکی حالتوں میں اظہار وجود کریں۔ نو تاریخیت رد تشکیل(Deconstruction) سے استفادہ کر کے ان طاقت اساس مظاہر کی نو بہ نو صورتوں کو سامنے لاتی اور زائل کر کے حقیقت کا انکشاف کرتی ہے۔ یہی دیکھ لیں کہ شیکسپیئر کے مطالعے میں نو تاریخیت نے، کیتھولک رسوم پر، پیورٹینوں (صاحبِ مقالہ کی مراد: "Puritans" سے ہے۔) کے متشدد رویوں، غلامی، پدر سری نظام کے جبر ، قید خانوں اور جرم و سزا کے قوانین اور معاشرتی و سماجی جبر کے علاوہ شخصی نوعیت کے حامل معاملات کو رد تشکیل کے عمل سے گزرا ہے۔ یعنی نو تاریخیت وسیع یا محیطی اور ذیلی ہر دو سطحوں کو نظر میں رکھتی ہے۔ محیطی تناظر میں تمام ثقافتی ادارے حکومتیں اور مقتدرہ شامل ہیں۔ جب کہ ذیلی تناظر میں طاقت کے مختلف شخصی مظاہر۔۔۔۔ پروفیسر عتیق اللہ نے نو تاریخیت اور تہذیبی مادیت کے فرق کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ گرین بلاٹ کے الفاظ میں وہ اس فرق کو یوں رقم کرتے ہیں:

"تہذیبی مادیت کا عصری تہذیبی سرگرمی سے زیادہ تعلق ہے جب کہ نو تاریخیت کی ساری توجہ کا مرکز ماضی ہوتا ہے۔ تہذیبی مادیت اس کے سیاسی مضمرات کے تعلق سے صریحاً بل کہ کرختگی کے ساتھ مجادلے کی سطح تک آسکتی ہے۔ جب کہ نو تاریخیت کا جھکاؤ انھیں محور کرنے کی طرف ہوتا ہے"۔(۵۴)

مقالہ نگار نے گرین بلاٹ کی اس وضاحت کے ذریعے تہذیبی مادیت کے تصور کو عصری سیاسی صورت حال سے، اور اس کی کارگردگی کو سیاست سے جوڑا ہے لہذا ان کے بقول، تہذیبی مادیت متن کے تجزیے کے اس طریقہ کار پر زور دیتی ہے۔ جو سیاسی وابستگیوں کے انکشاف میں معاون ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نو تاریخیوں کے مقابلے میں تہذیبی مادیت کے حامی زیادہ رجائیت پسند واقع ہوئے ہیں۔

پروفیسر عتیق اللہ کا مذکورہ مضمون دیگر لکھاریوں کے مضامین کی بہ نسبت نو تاریخیت کے تصور اور علمیات کی بہتر وضاحت کرتا ہے۔ اردو میں نو تاریخیت کی نظری مباحث میں اس تناظر کے دیگر مکاتب فکر سے افتراق واشتراک پر زیادہ توجہ صرف کی گئی، تاہم عتیق اللہ نے نو تاریخیت کی علمیاتی بنیادوں کی وضاحت کے ذریعے اس خلا کو پر کرنے کی سعی کی ہے۔ یوں نو تاریخیت کا نظریہ واضح ہو کر سامنے آیا ہے۔ عتیق للہ نے اصلی مصادر سے استفادہ کے ساتھ ساتھ جس ترتیب اور تجزیاتی و تنقیدی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی داد دینا پڑتی ہے۔

"ڈان ای۔ وین" کا: **" نئی تاریخیت "** کے عنوان سے بہت اہم مضمون **" فرحت احساس "** نے ۲۰۰۶ء میں " نئی تاریخیت " کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے۔ پہلی دفعہ یہ مضمون " قاضی افضال حسین " کی ادارت میں شائع ہونے والے نئے تنقیدی مکاتب و مباحث کے ترجمان رسالے :" تنقید " میں چھپ کر سامنے آیا۔ ڈان ای۔ وین، نے اس مضمون میں تاریخیت، نو تاریخیت اور اس کے دیگر جدید تنقیدی تناظرات مثلاً تانیت، رد تشکیل سے افتراقات واشتراکات، امریکی تنقید میں نو تاریخیت کی مباحث، نئے ثقافتی مطالعات کی جانب منتقلی، علم بطور طاقت اور تاریخی تناظر کے علاوہ نو تاریخیت پر وارد ہونے والے اعتراضات کی تفاصیل اور نویت کو واضح کیا ہے۔ آغاز

میں مضمون نگار نے عصری مباحث میں ثقافت اور تہذیبی مطالعے کے ضمن میں پرانے مفروضوں کے تہ و بالا ہونے اور نو تاریخی تناظر کے نئے سیاق میں ظہور پر "مارس مینڈل بوم" کے حوالے سے لکھا ہے:

> "موجودہ تاریخی سیاق میں جب تجربے اور تھیوری کی متحدہ قوت نے ثقافت اور تہذیب سے متعلق بہت سے پرانے معروضوں کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔ مجھے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف تاریخیت تصورات بل کہ ان دنوں رائج دیگر تنقیدی سرگرمیوں کی نسبت سے بھی تاریخی تنقید کے اس تازہ ترین رجحان کی اہمیت واضح کر دوں۔"(۵۵)

اس وضاحت کے بعد مضمون نگار نے، تاریخ و ثقافت سے منسلک نئے تنقیدی رجحانات کی تفصیل میں امریکی نو تاریخیت اور برطانوی ثقافتی مادیت کی جانب اشارہ کیا۔ تاہم انہوں نے زیادہ اہمیت امریکی نو تاریخیت پر دی ہے۔ تاریخ کو تاریخیانے کے ضمن میں انہوں نے مابعد جدید تھیوری کے تحت نو تاریخیت کے رد تشکیل اور تانیثیت سے روابط پر غور کیا ہے۔ دیگر تنقیدی روایتوں کے برعکس امریکہ میں نو تاریخیت اور رد تشکیل کے مابین متخالف رشتہ قائم ہونے کی وجوہات کے ضمن میں انہوں نے امور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلی وجہ سماجیاتی تو-جیہات ہیں۔ جو امریکی معاشرے اور بالخصوص سرکاری سرپرستی اور سیاست کے مضمرات کی حامل ہیں۔ دوسرا یہ کہ امریکہ میں ایک عرصے سے جس ہستی رجحان کا غلبہ ہے۔ اب اسے معتبر خیال نہیں کیا جاتا۔ تاہم رد تشکیل اور نو تاریخیت کی ہم کاری میں بہت سے ناقدین کا ماننا ہے کہ رد تشکیل اور نو تاریخیت، ہیئتی تنقید کے لیے، جوابی ڈسکورس، بننے کی صلاحیت کی حامل ہیں۔

مضمون نگار نے گرین بلاٹ کے تتبع میں نو تاریخیت کو تھیوری کی بجائے "علمی سرگرمی" قرار دیا ہے۔ تنقید میں نئی ثقافتی شفٹ نے نو تاریخیت کو متاثر کیا اور اس کے ظہور پذیر ہونے کے عوامل میں شامل ہے۔ اس

ضمن میں، صاحب مقالہ نے خاص طور پر "کلیفرڈ گیر ٹنر" کے کام کی جانب اشارہ کیا ہے۔ ثقافتی بشریات، کے میدان میں گیر ٹنر کے کام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ان علمی سر گرمیوں کے دائرے میں ادبی تنقید کی وہ صورت بھی شامل ہے، جو بنیادی طور پر ادبی متون کی تفہیم میں مقامی، سیاسی، سماجی سیاقوں کی اہمیت پر زور دیتی ہے؛ ثقافتی تاریخ کی وہ قسم بھی جو علامتی علم الانسان (Symbolic Arthmopology) کے ماہرین، بہ طور خاص کلیفرڈ گریٹز (Clifford Geertz) کے کام سے متاثر ہے اسی سے متعلق ثقافتی مطالعات کی ایک شاخ بھی جو سماجی تاریخ دانوں کے اینالیز (Annales) مکتب کے طرز پر نیچے سے آنے والی تاریخ پر زور دیتی ہے: اور ثقافتی تنقید کی ایسی صورتیں بھی جو اکثر غیر واضح طور پر مارکسی اور تانیثیت پسند نظر آتی ہیں، مگر جو عموماً اداروں کی تاریخ جنسیت کی تاریخ اور فاعل (Subjectivity) کی تاریخ سے متعلق مشل فوکو کے کام سے ماخوذ ہیں۔" (۵۶)

اس اقتباس میں "ڈان ای۔ وین" نے نو تاریخیت پر اثر انداز ہوتے تقریباً تمام عناصر و عوامل کی نشان دہی کی ہے اور بادی النظر میں اپنے پورے مقالے کا خلاصہ پیش کیا۔ آگے مضمون اپنی عوامل کی شرح پر مشتمل ہے۔

روایتی تاریخیت پر بات کرتے ہوئے، صاحب مضمون نے "ویزلے مارس" (Wasley Marris) کی کتاب: "Towards a New Historicism" کے حوالے سے روایتی تاریخیت کی چار اقسام کا ذکر کیا ہے۔ پہلی قسم؛ مابعد الطبیعاتی تاریخیت ہے جو دراصل ہیگل کے فلسفۂ ماورائیت سے اخذ شدہ ہے۔ اس کے تحت ادبی فن پارے کو تاریخ کے منکشف ہوتے ہوئے بیانیے کے ایک لمحے کا شعری اظہار تصور کیا جاتا تھا جو حقیقت مطلقہ کی

خود یافتگی کا عمل بھی ہے۔ دوسری قسم؛ ب فطرت پسندانہ یا اثباتیاتی تناظر کی حامل ہے۔ یہ سائنسی مشاہدے پر یقین رکھتی ہے اور یقین سے استفادہ کر کے تاریخ کے مخصوص ادوار کا تصور کرتی ہے ۔ تیسری قسم؛ قوم پرستانہ نوعیت کی حامل ہے۔ مارس کے بقول یہ مابعد الطبیاتی تاریخیت کی ہی ذیلی شاخ ہے۔ اس کے ماننے والے ادبی فن پارے کو ایک مخصوص نسل یا ثقافت کا اظہار گردانتے ہیں۔ چوتھی قسم؛ جمالیاتی تاریخیت کی ہے ۔ یہ ادبی فن پارے کو ثقافتی معانی خیزی، اس کی تشکیل اور اقدار سازی کا ذریعہ بتاتی ہے۔ ویزلے مارس، کی بیان کردہ تاریخیت کی ان چاروں اقسام پر "ڈان ای۔ وین" تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تاریخیت کی یہ چاروں روایتی اقسام کسی ایک یا دوسرے بیانیے کی پابند تھیں۔ جو کسی تاریخی نقاد کی مخصوص بیانیے یا شعری عمل کی تعبیرات پر حاوی ہو۔ صاحب مضمون نے نو تاریخیت کے پس منظر میں کارفرما روایتی تاریخیت کے اثرات کو مانا ہے۔ تاہم وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نو تاریخی نقاد ،تاریخ کی اصطلاح کے معادیاتی (Eschatological)اور کو نیاتی (Teleological)مفاہیم کو ترک کرنے پر زور دیتے ہیں۔

مضمون نگار نے امریکہ کی ادبی روایت میں ردِ تشکیل کو ادارہ جاتی اختصاص کا حامل قرار دیا ہے۔ اس طرزِ فکر نے "سبالٹرن کلاس" (Subaltern Class) یا حاشیے پر دھکیلے گئے طبقات کو جدوجہد کرنے کا عرصہ فراہم کیا اور یہ عمل جاری رہا۔ ڈان ای۔ وین، نو تاریخیت اور رد تشکیل ہر دو کو تنقید کے میدان میں راسخ العقید گی کی مثال قرار دیتے ہیں۔ یوں ان دونوں کو لیوتار کے فکری نظام کے تطابق سے تفہیم کرنے کی سعی کی جانی چاہیے۔ لیوتار نے مابعد جدید ڈسکورس کی وضاحت میں مہابیانیہ(Meta Narrative) اور علم و طاقت کی تشکیل کا نظریہ پیش کیا۔ مضمون نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ نو تاریخی تناظر، حالاں کہ ماضی کے متعلق طاقت کے لفظ کو استعمال کرتا ہے، جب کہ اسے خود اپنی طاقت کے دائرے کار کا علم نہیں۔ یعنی جب علم طاقت کے حصول کا ذریعہ بن جائے تو نظریہ و عمل میں پیراڈوکس یا متناقضہ کی صورت حال جنم لیتی ہے۔ تاہم مضمون نگار نے اس سب کے باوجود نو تاریخیت کو رد تشکیل کی ہی طرح مابعد جدیدت کا مظہر مانا ہے۔ اس متعلق لکھتے ہیں:

"ان تحفظات کے باوجود، میرا خیال ہے کہ ردِ تشکیل اور نو تاریخیت دونوں ہی لیوتار کی بیان کردہ علم کی استحقاق کاری کی مابعد جدید صورت سے مطابقت رکھتی ہیں۔ دونوں تحریکوں میں سے ہر ایک، اپنے اپنے انداز سے ایک نوع کی پیرالاجیائی سرگرمی کے طور پر وجود میں آئی ہیں (یہی وجہ ہے کہ دونوں ہی زیادہ تر روایتی تنقیدی رویوں کے حملوں کا شکار ہوئیں۔) ، مگر دونوں میں سے ہر ایک کو کارکردگیت کے پیمانے پر پورا اترنے کی صلاحیت کے سبب بدنامی بھی ہاتھ آئی"۔(۵۷)

مضمون نگار نے اقتباس بالا میں بیان کردہ اپنے مؤقف کی تفصیلی وضاحت کے بعد اس امر کی تصریح کی ہے کہ نو تاریخیت اور رد تشکیل دونوں نے تنقیدی طرز کی موجودہ صورت حال پر نا مستحکم کرنے والے اثرات مرتب کیے اور اس لحاظ سے وہ مابعد جدید تنقیدی سرگرمی کی ایک شکل ہے۔ جسے "لیوتار" نے "پیرالاجیائی" (Paralogy) کا نام دیا گیا ہے۔ ہر دو قرأت کے مختلف طریقے ہیں:

"نئی تاریخیت جس لحاظ سے تاریخی تنقید کی سابقہ قسموں سے گریز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ نو تاریخیت داں فاعل کی پارہ پارہ حیثیت (Fragmentation) کا مندرج کرتے ہیں، اس وجہ سے ہی سہی کہ ان کی تحریروں میں خود تاریخ نگاری کا موضوع بھی پارہ پارہ ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس تحریک کے عاملین پر من مانی ربط کاری کے الزمات لگائے جاتے ہیں۔۔۔ تاریخ دان کی اپنی داخلیت کا جائے وقوع معلوم کرنے سے یہ انکار یا اس معاملے میں لاچاری کا احساس، نشاۃ الثانیہ سے متعلق مطالعات کے شعبے میں، نو تاریخیت کو تانیثیت کی علمی سرگرمی سے ممیز کرنے کی ایک بڑی بنیاد رہا ہے۔ یہی بات نئی تاریخیت کو تانیثیت کی علمی سرگرمی سے ممیز کرنے کی ایک بڑی بنیاد رہا ہے۔ یہی بات نو تاریخیت کو ایک

اخلاقی اور سیاسی تنقید کے وسیلے کے طور پر محدود بھی کرتی ہے۔ نو تاریخیت کے کئی غالب تصورات برسوں سے دیگر تنقیدی سرگرمیوں کو اثر انداز کرتے ہیں۔"(۵۸)

مضمون نگار نے آخر میں اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ نو تاریخیت کی سیاست اور اخلاقیات اب بھی حد درجہ تجریدی اور خالصتاً متنی معاملہ بنی ہوئی ہے۔"ڈان ای۔وین" کا مذکورہ مضمون خاصہ سنگین اور حاوی اکادمیاتی اُسلوب میں لکھا گیا ہے۔اُردو دان طبقہ، چوں کہ اس زبان سے اور طرزِ اظہار سے زیادہ مانوس نہیں، تو اسے قرأت اور مطالب کی تفہیم میں آسانی نہیں ہوتی۔ مزید یہ کہ جس تنقید محاورے کو مضمون نگار نے برتا ہے وہ ترجمے کے قالب میں لانا، ایک نہایت کٹھن ذمہ داری تھی۔ جسے فرحت احساس نے ایک حد تک کامیابی سے نبھایا ہے۔ مضمون میں نو تاریخیت کے تصور اور امریکی دبستانِ تنقید میں اس کی موجودہ صورت حال کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ نو تاریخیت کس طرح دوسرے تنقیدی تناظر سے اثر انداز ہوئی اور اس نے دوسری تناظرات کو کس طرح اثر انداز کیا، اس پر بھی مضمون نگار نے عالمانہ تفاصیل پیش کی ہیں۔ اس امر کی جانب توجہ دلانا ضروری ہے کہ مضمون نگار نے نو تاریخیت کے ادبی عمل سے زیادہ، سیاسی تفاعل پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ مضمون کی قرأت سے نو تاریخیت کی ادبی جہات کم کم ہی واضح ہوتی ہیں۔

"نئی تاریخیت" کے عنوان سے **"ڈاکٹر الطاف انجم"** کا مقالہ اُن کی تھیوری اور مابعد جدید تنقید کے مَباحث پر مشتمل کتاب: "اُردو میں مابعد جدید تنقید" کا ایک باب ہے۔ یہ کتاب ۲۰۱۳ء میں سامنے آئی۔ مضمون کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: پہلا حصہ؛ نو تاریخیت کے تاریخی اور ادبی سیاق پر مشتمل ہے، جس نے آئندہ مباحث کے لیے بنیاد (Ground) فراہم کی ہے۔ دوسرا حصہ؛ تاریخیت کے تصور سے بحث کرتا ہے۔ تیسرے حصے؛ میں نو تاریخیت کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور اس نظریے کی مختلف جہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے حصے سے منسلک چوتھے حصے؛ میں ثقافتی مادیت اور اردو میں نو تاریخی مباحث کے ارتقائی رجحانات پر تبصرہ شاملِ متن ہے۔

مقالہ نگار نے نو تاریخیت کو مابعد جدید تنقید تناظرات میں ایک منفرد تنقیدی زاویے کے عنوان سے شناخت کیا ہے اور اس نظریے کے دو جانبہ رُخ کی وضاحت کی ہے۔ اس کا دو جانبہ رُخ یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کے تحت سامنے آنے والے زیادہ (تقریباً سارے) تناظرات متن اساس مطالعے کے حامی ہیں، جب کہ یہ تناظر متن کی خود مختاری کو مان کر محدود کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ یہ مطالعے کے ضمن میں تاریخ سے باقاعدہ انسلاک پر یقین رکھتا ہے۔ الطاف انجم، نے نو تاریخیت کے متن مرکزیت سے انحراف کی وجوہ میں نئی تنقید اور روسی ہیئت پسندی پر ردعمل کے نکتے کو اٹھایا ہے۔ گرین بلاٹ کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ وہ نو تاریخیت کو تھیوری کی بجائے قرأت کا ایک نیا طریقہ کار مانتے ہیں۔ اس مقام پر صاحبِ مضمون نے کافی تفصیل سے اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ نو تاریخیت نئی تنقید اور نئے تناظر کے ردعمل میں سامنے آئی، تاہم اسے کُلی طور پر ساختیات کا مخالف قرار دینا، درست نہیں۔ اس ذیل میں انہوں نے سوسیئر کی یک زمانی اور دو زمانی مطالعے کی منطق پر بات کرتے ہوئے انہوں نے اس کی تصریح کی ہے کہ تاریخیت کا آغاز تاریخ سے ضرور ہے تاہم نوعیت اور تناظر کا فرق ہے۔ یہ سادہ اور سپاٹ تاریخ نہیں۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "تاریخیت اپنی فطرت میں تاریخ نہیں ہے اور نہ ہی تاریخی واقعات کا بیان۔ بلکہ یہ تاریخ پڑھنے پڑھانے او سمجھانے کے اصول و قواعد کی محتوی ہے۔ اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تاریخ کی مطالعاتی حکمت عملیوں پر دال ہے۔ غرض تاریخیت تاریخ کی تفہیم اور اس تعبیر کا ایک Paradigm ہے جو مخصوص زمانی اور مکانی تناظر میں واقعات کو پیش کرتی ہے۔۔۔ تاریخیت نے ایک اہم نکتہ ابھارا ہے کہ تاریخی واقعات اپنے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی قوتوں کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ یہ طاقت کسی سیاسی یا مذہبی، معاشرتی یا اقتصادی آئیڈیالوجی کی مدد سے کسی شعبۂ علم پر حاوی ہو جاتی ہے جو آگے چل کر دیگر علوم وفنون کے اصول

وضوابط اور اقدار وماہیئت کے متعین کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔"(۵۹)

اہم نکتہ یہ ہے کہ اس تاریخی سفر میں تاریخیت کبھی مارکس کے تصورات سے متاثر ہوئی، کبھی ہیگل اور گوئٹے کی ہم جولی بنی اور کبھی جدلیاتی تاریخیت کے نئے نویلے روپ میں ڈھل کر سامنے آئی۔ مقالہ نگار نے اس ضمن میں جرمن مفکرین کی علمی کاوش کو فراموش نہ کرنے کا اعادہ کیا ہے، جو تاریخیت کو صرف تاریخ میں ہی محصور نہیں گردانتے بل کہ اسے مجموعی ثقافتی اور سماجی علم کے مطالعاتی مناہج میں شریک مانتے ہیں۔ صاحب مضمون کے بقول تاریخیت کا یہ تناظر علوم کے تازہ ترین پھیلاؤ کے باعث ممکن ہوا اور اس پر "ویلہیلم ڈلتھے "(تمام روایتی ادبا کی طرح الطاف انجم نے بھی "ولہیلم" کو" ویلیم" لکھا ہے۔) اور "ہنرخ رکرٹ" کے فکری آثار نمایاں ہیں۔ انہوں نے سائنسی اصولوں کے مطابق سے سائنس اور تاریخ (بطور انسانی علم) میں مشابہت سے زیادہ مغائرت کی نشان دہی کی۔ اس مقام پر مقالہ نگار نے خصوصی طور پر "عتیق اللہ، گوپی چند نارنگ اور ناصر عباس نیّر" کے تاریخیت پر اختلاف نظر کو ابھارا ہے:

> "عتیق اللہ نے تاریخیت کو ادبی مطالعہ کا ایک طور مقرر کرلیا ہے، جب کہ گوپی چند نارنگ نے ادب کی تخلیق میں تاریخ کے کردار کو مسترد کردیا ہے اور اسے تخلیق کار کی انفرادی قوت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے ادب کے Intrinsic نظریہ کی بنیاد پر مطالعہ کو اہم گردانا ہے جب کہ عتیق اللہ نے تاریخیت کے Extrinsic زاویے کو اپنانے پر زور دیا ہے۔ اس کے نزدیک ادب تاریخی قوتوں اور سماجی کرداروں کی تخلیق ہے۔ ناصر عباس نیّر نے تاریخیت کو تاریخ کی فلسفیانہ بصیرت کا نام دیا ہے۔ اس کے لفظوں میں تاریخیت، تاریخ، نہیں ہے لیکن تاریخ سے باہر نہیں ہے۔" (۶۰)

"نو تاریخیت " کے ضمن میں مقالہ نگار نے جو رویہ اپنایا ہے، وہ تنقید سے زیادہ نقد الانتقادی معنویتوں کا حامل ہے۔ اس لیے کہ الطاف انجم نے نو تاریخیت کے ضمن میں کسی نئی بات کا اضافہ نہیں کیا، بل کہ گوپی چند نارنگ، عتیق اللہ، ناصر عباس نیرّ اور ڈان ای۔وین کی مباحث کو ترتیب دیا ہے۔ مضمون کے آخر میں انہوں نے نو تاریخیت کے تصورِ تاریخ پر اہم نکتے کی وضاحت کی ہے، راقم اسے یہاں نکال کر پیش کر رہا ہے۔ اس لیے کہ اس سے آشنائی شروع میں ہی ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "نو تاریخیت کا تعلق تاریخ سے ہے لیکن یہ تعلق ترقی پسند تحریک یا مارکسزم کی نوعیت کا نہیں ہے۔ نو تاریخیت کے لیے تاریخ کا کوئی بھی واقعہ قابلِ توجہ ہو سکتا ہے، جب کہ ترقی پسند تحریک تاریخ کے صرف اُس پہلو کو زیر بحث لاتی ہے جس میں معاشی کش مکش کے زائیدہ پرولتاریوں اور بورژوا کے مابین تضاد وتضادم کی کوئی جھلک ملتی ہو۔ ہر چند کہ ان دونوں کی مراجعت اپنے فکری نظام کے تحت تاریخ کی طرف ہی ہوتی ہے۔" (٦١)

یہی وہ نکتہ ہے جو تاریخیت اور نو تاریخیت میں حدِ امتیاز قائم کرتا ہے۔ نو تاریخیت کی تفصیلی وضاحت میں الطاف انجم نے پہلے "عتیق اللہ"، پھر "گوپی چند نارنگ" پھر "ناصر عباس نیرّ" اور بعد ازاں "ڈان ای۔وین" کے مباحث کو دوہرایا ہے۔ اس لیے انہیں یہاں دہرانا مناسب نہیں، وہ پہلے ہی سابقہ مباحث کے تحت آچکے ہیں۔ الطاف انجم نے جابجا مذکورہ ناقدین کی آرا پر تبصرے بھی کیے ہیں۔ مضمون نگار نے نو تاریخیت کے مرکز گریز رجحان پر خصوصی توجہ دی ہے۔ مزید بر آں، خاص تاریخی عہد کی ثقافت سے اس انسلاک کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "نئی تاریخیت اپنے دائرہ کار میں ادبی متن اور اُس عہد کے ثقافتی اور تہذیبی Matrix کے باہمی روابط کو نشان زد کرتی ہے جس عہد میں وہ ادبی متن

تخلیق ہوا ہے۔ اس ضمن میں سماجی، جمالیاتی، سیاسی اور مذہبی اقدار وروایات کا
تذکرہ ضروری ہے جو اپنے اجبار سے اپنے عہد کے متن کی آئیڈیالوجی پر حاوی
ہوتے ہیں۔ اس طرح کے متن لوئی مونٹروس کے مطابق Enduring Texts
کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔" (۶۲)

مضمون نگار نے ثقافتی مادیت کے تصور کے تحت اور گرین بلاٹ کے اطلاقی طرزِ عمل کی مناسبت سے نو تاریخیت کے مقتدرہ کی مخالفت کے رجحان پر روشنی ڈالی ہے۔ نشاۃ الثانیہ کے ادبی و ثقافتی متون، مقتدرہ، حاکموں، مذہبی پیروکاروں، عدلیہ، انجیل کے ہدایت ناموں اور خاندانی واخلاقی رسمیات میں مکمل طور پر ڈھلے ہوئے تھے۔ لہذا گرین بلاٹ اور اس کے ہم کاروں نے ان متون کو ثقافتی مادیت کی نئی حکمت عملی کے تحت رد تشکیل کے مراحل سے گزارا۔ لہذا اُن کا کہنا ہے کہ یہاں ثقافتی مادیت مارکسزم کے طریقہ کار کی حامل ہو جاتی ہے، جو ادبی وثقافتی متون کو سماجی، تاریخی اور اقتصادی بدلاؤ سے متاثر ہونے کو لازمی گردانتی ہے۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ تہذیبی مادیت کے سرکردہ علم بردار ناقدین ادبی متن کی تفہیم میں سیاست اور سیاسی اداروں کے عمل دخل پر بہت توجہ دیتے ہیں۔ "گراہم ہولڈرینس" نے تہذیبی مادیت کو، تاریخ کی سیاسیاتی شکل (Political Form of Historiography) سے معنون کیا ہے۔ لہذا، مقتدرہ کا جبر متن کی تشکیلی حالتوں کے بطن میں پنہاں ہوتا ہے:

"نئی تاریخیت ایک نئی فکری اساس کے ساتھ ادبی اور ثقافتی منظر نامے پر ابھری۔
جو تاریخی واقعات میں قوتوں کے اجبار کو بے نقاب کر کے ادبی متون اور تاریخی
متون کی ہم بستگی پر مُصر ہے۔۔۔ غرض نئی تاریخیت ادب پاروں کی تفہیم و تعبیر
میں ایک نئے Paradigm کو دریافت کرتی ہے۔"(۶۳)

مضمون کے آخر میں نو تاریخیت پر عملی مباحث کے حوالے گوپی چند نارنگ، عتیق اللہ اور ناصر عباس نیّر کی کاوشوں کو سراہا ہے اور اس المیے پر تاسف کا اظہار کیا ہے کہ اُردو میں مابعد جدیدیت کی دیگر مباحث کی طرح

نو تاریخیت بھی عمومی سرد مہری کا شکار رہی ہے۔ الطاف انجم کا یہ مضمون اختراعی سے زیادہ تقلیدی نوعیت کا ہے، جس میں اردو میں پہلے سے اٹھائی گئی مباحث کو حُسن ترتیب کے مرحلے سے گزار کر، پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے کہیں کہیں اپنے تبصرے بھی دیے ہیں۔ مزید براں، اصلی مصادر سے استفادہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مضمون میں کوئی نئی بات بمشکل ہی سامنے آتی ہے۔

"تاریخ اور نو تاریخیت" ، کے سرنامے کے ساتھ **"قاسم یعقوب"** کا مضمون اُن کی کتاب: "لفظ اور تنقیدِ معنی" میں شامل ہے، جو ۲۰۱۷ء میں سامنے آئی۔ مباحث کا عمومی دائرہ: "تصورِ تاریخ، تاریخ، مورخ اور واقعات کے انتخاب کے باہمی تعاملات، مورخ کے تعصبات، تاریخ پر طاقت کا جبر، تاریخ کے دائروی اور مستقیمی تناظرات، فوکو کا روحِ عصر اور اے پس ٹیم کا نظریہ، الیتھوسے کے نظریات، نومارکسی تعقلات اور مختلف ادوار میں، پائے جانے والے غالب رجحانات کی دوسرے ادوار میں منتقلی"، پر ہے۔ آغاز میں تصورِ تاریخ کے ذیل میں قاسم یعقوب کا کہنا ہے کہ عمومی تصور کے تحت، ماضی کے واقعات کو، تاریخ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تاہم ایسا نہیں ہے۔ پوری تاریخ سامنے آ ہی نہیں سکتی، کچھ واقعات منتخب ہو کر سامنے آتے اور کچھ کبھی سامنے نہیں آسکتے۔ جو واقعات سامنے آتے ہیں، اُن کے سیاق میں تہذیبی، سیاسی اور معاشی، مذہبی طاقتوں کے رد و انتخاب کا قرینہ چھپا ہوتا ہے۔ صاحبِ مضمون نے ا"یڈورڈ ہیلٹ کار"(Edward Hallett Carr) کے حوالے سے لکھا ہے:

> "ایڈورڈ ہیلٹ کار(Edward Hallett Carr) نے اپنی کتاب "تاریخ کیا ہے ؟" میں تاریخ کو صرف مورخ کا انتخاب قرار دیا ہے۔ ہیلٹ کار، اسے مغالطہ قرار دیتا ہے کہ تاریخ کا کوئی واقعہ حقیقت(Fact) ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ مجموعی طور پر مورخ حقائق کی وہ قسم حاصل کرے گا جو وہ چاہتا ہے۔ تاریخ کا مطلب ہی توضیح و ترجمانی کرنا۔"(۶۴)

تاہم مقالہ نگار نے ہیلٹ کار کے نظریے سے اختلاف کر کے اس امر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ معاملہ صرف مورخ تک محدود نہیں بل کہ وقت کا بہاؤ بھی بہت کچھ منتخب اور رد کرتا ہے۔ کچھ واقعات میں اتنی طاقت ہی نہیں ہوتی کہ تاریخ کے بہاو کا حصہ بن سکیں۔ اس کے علاوہ طاقت و مقتدرہ بھی واقعات کو منتخب کرنے والے سر کردہ عوامل میں سے ایک اہم ترین عنصر کا درجہ رکھتی ہے۔

صاحبِ مقالہ نے تاریخ کے دو تصورات پر خصوصی روشنی ڈالی ہے: ایک تاریخ کا سیدھا اور مستقیمی (Linear) تصور اور دوسرا تاریخ کی دائروی حرکت۔ اول الذکر: تاریخ کی حرکت کو دریا کے سپاٹ بہاؤ کی مثل قرار دیا ہے۔ ثانی الذکر: دائروی حرکت کے تصور میں تاریخ خود کو دائرہ کی صورت میں دہراتی ہے۔

مضمون نگار کا ماننا ہے کہ تاریخ کی مکمل شناخت تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔ اس کی وجوہات دو ہیں: تاریخ کو گرفت میں لینے والی یا مؤرخ اس کے کلی مزاج یا کسی عہد میں رونما ہونے والے تمام اعمال سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ دوسرا یہ کہ مؤرخ یا قاری تاریخ کا ادراک اپنے زمانے کے معیارات کی رُو سے کرتا ہے۔ لہٰذا مکمل گرفت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہر زمانے کے اصول و ضوابط ہوتے ہیں۔ اور اسے اُس کی روح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس تصور کے ضمن میں قاسم یعقوب نے کچھ سوالات قائم کیے ہیں:

- یہ زمانے کی روح کیا ہے؟
- اگر تاریخ مستقیمی ہے تو کیا پوری تاریخ کی ایک روح ہوتی ہے؟
- اگر ہر زمانہ دوسرے زمانے سے مختلف ہے، تو کیا ہر زمانے کی روح بھی مختلف ہو گی؟
- کیا ہر زمانے کی الگ تاریخ ہوتی ہے اور یوں تاریخ میں بہت سی روحیں موجود ہوتی ہے؟ (۶۵)

مضمون کا اگلا حصہ ان سوالات کے جواب کے لیے مختص ہے۔ مابعد جدیدیت نے حتمیت کی نفی کی ہے اور فوکو نے تاریخ کو "Discursive Practice" قرار دیا ہے۔ یہ وصف، فوکو کے مطابق، تاریخ میں جگہ جگہ وقفوں کے تصور سے کشید شدہ ہے۔ تاریخ میں خالی جگہیں، شگاف، وقفے اور خلائیں ہیں، بالکل ایک متن کی طرح

ہی تاریخ میں بھی خلاؤں اور شگافوں (Raptures) کا تصور ہے۔ صاحبِ مضمون کے بقول، فوکو نے "بیشلا" (Bechelard) کے "علمیاتی وقفہ" (Epistermogical Break) کے تصور سے اخذ کیا ہے۔ بیشلا کے مطابق، سائنس کی تاریخ بہت سے وقفوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس تصور کے بیسویں صدی پر اثرات کے ضمن میں مقالہ نگار نے لکھا ہے:

> "بیشلا (Gaston Becheland) نے اپنے معاصرین پہ خاصے اثرات مرتب کیے۔ بیشلا سے متاثر ہو کے سائنس میں تھامس کوہن نے پیراڈائم شفٹ کا نظریہ دیا۔ بیسویں صدی کے ربع آخر میں بیشلا کے علمیاتی وقفے یا شگاف نے بیک وقت فوکو اور آلیتھوسے کو بھی متاثر کیا۔ فوکو نے کثیر عصری بیانیوں پر اس کا اطلاق کیا، جب کہ آلیتھوسے نے ان قوفوں کا مارکس کے مجموعی کام (Works) پر اطلاق کیا۔ فوکو اور آلیتھوسے نے علمیاتی وقفوں کو دو مختلف معنوں میں لیا۔ فوکو ان شگافوں کو تاریخ کی مستقیمی حالت میں دیکھتا ہے، جب کہ آلیتھوسے نے بیشلا کی علمیاتی رکاوٹ (Obstables) کا اطلاق مارکس کی شخصیت اور اس کے کام پر کیا۔"(٦٦)

مضمون نگار نے، آلیتھوسے، کے کام کی اطلاقی جہات کی وضاحت میں کافی بحث کی ہے اور مارکس کی ادوار بندی پر آلیتھوسے کے نظریے کو وضاحت سے رقم کیا ہے۔ فوکو کے روحِ عصر (Epistemes) کے تصور پر بھی کھل کر بات کی گئی ہے۔ فوکو کا یہ تصور مارکس اور ہیگل کے مستقیمی تصورِ تاریخ کی نفی کرتا ہے۔ مزید یہ کہ فوکو تاریخ کو بے ربط کلامیوں کا مجموعہ مانتا ہے۔ اے پس ٹیم اور زاکسٹ (Zeitgeist) جیسے فوکوئی تصورات کو موضوع بنا کر مقالہ نگار نے سوال اٹھایا ہے کہ کیا تاریخ کے مختلف دھارے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں؟ خلا اور شگاف کیا ہیں؟ جس وقت یہ شگاف آتا ہے۔ اُس وقت روحِ عصر فعال ہوتی ہے یا نہیں؟ ان سوالوں کے جواب

مقالہ نگار نے گراف (Graphs) بنا کر دیے ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ ایک روح عصر جب دوسری روح عصر میں منتقل ہوتی ہے تو ان دونوں کے درمیان ایک "سرمئی عرصہ" (Grey Area) وجود میں آتا ہے، جس میں دونوں کی صفات موجود ہوتی ہیں، کیوں کہ وقت کا دھارا کبھی بھی روحِ عصر سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس خاص عرصے میں دونوں روحِ عصر بیک وقت موجود ہوتی ہیں، چاہے یہ حالت مدھم یا کم زور ہی کیوں نہ ہو۔

قاسم یعقوب کا مذکورہ مضمون تاریخ، تصوراتِ تاریخ، اس کی حرکت اور روحِ عصر کی تفہیم میں بے حد معاون ہے۔ ظاہر ہے یہ تمام تصورات نو تاریخیت کے تصور کی تفہیم میں معاون بھی ہیں اور اس کی تشکیل کا جواز بھی۔ تاہم مضمون نگار نے ان کی نو تاریخیت سے مطابقت اور تشکیلی حیثیت پر بالکل کوئی روشنی نہیں ڈالی، ماسوائے اس مضمون کو عنوان دینے کے۔ نہ ہی ادبیات اور ثقافتی متون میں ان کے لائحہ عمل اور اطلاقی طریقہ کار کے حوالے سے کوئی بیان سامنے آیا ہے۔ اتنا ہے کہ مذکورہ بالا تصورات کی تفہیم کے لیے یہ مقالہ اہمیت کا حامل ہے۔ہاں نو تاریخیت کی نظری جہات سے متعلق اس مضمون کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ تاریخ اور نو تاریخیت، کا عنوان رکھ کر مقالہ نگار شاید نو تاریخیت کو نہیں بل کہ تاریخ کو نو تاریخیت کے قواعد سے واضح کرنے کی ایک گنجلک سی سعی کر رہے ہیں۔ جب کہ عنوان سے گمان یہ پڑتا ہے کہ یہ نو تاریخیت سے متعلق بحث پر مشمول ہے۔ جہاں تک راقم کا خیال ہے مذکورہ مضمون عنوان کی عکاسی تو سرے سے ہی نہیں کرتا۔ علاوہ بریں اپنا نفس مضمون بھی سامنے لانے سے قاصر ہے۔بس مضمون کی ہیئتی بنت میں ایک نیا پن ضرور ہے۔ جب کہ مضمون نگار کو اس بنت پر توجہ دینے کی بجائے، فکری اساس پر توجہ دینی چاہیے تھی۔

"ڈاکٹر حنا جمشید" اور **"ڈاکٹر شازیہ عنبرین"** کا مشترکہ مضمون بعنوان: **"ادب اور ثقافت اور نو تاریخیت: ایک مطالعہ"** ، ۲۰۲۰ء میں تحقیقی جرنل "الماس" میں شائع ہوا۔ جیسا کہ نام سے واضح ہے کہ اس مضمون میں ادب، ثقافت اور نو تاریخیت کے باہمی روابط کو نشان زد کیا گیا ہے۔ ادب اور ثقافت کے باہمی رشتے پر زور دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ادبی متن اپنی بُنت میں ایک نامیاتی کُل ہونے کے باوجود بنیادی طور پر تاریخ اور ثقافت و

تہذیب کے اُن تمام عناصر کا مجموعہ ہوتا ہے، جو تاریخ اور ادب کے روابط کو استوار کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ ان رشتوں کی رد تشکیل کرنا اور مرکوز مطالعات کے ذریعے متن سے سماجی، ثقافتی اور تہذیبی و سیاسی تناظرات کو بحال کرنا، ادبی نقاد کی اساسی ترین ذمہ داری ہے۔ مضمون میں ادب اور تاریخ کے پیچیدہ رشتے کی مناسبت سے تاریخیت کے تصور کی فلسفیانہ اور مارکسی جہات پر روشنی ڈالنے کے بعد ہیئتی دبستانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ امریکی تنقید کے ضمن میں زبان اساس نظریات ساختیات اور پسِ ساختیات کے باوصف زبان و ثقافت کے روابط کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ مضمون میں تاریخ اور اس کی تشکیل کو مقتدر بیانیوں کے کردار کے تحت کہا گیا ہے، کہ تاریخ کے بیانات مخصوص مقتدرہ کے زیرِ اثر متشکل ہوتے ہیں اور یہ تعصبات تاریخی حقائق کو دھندلانے کا باعث بنتے ہیں۔ مزید یہ کہ ان بیانیوں اور طبقات کو حاشیے میں دھکیل دینے کا باعث بھی ہیں، جو مقتدرہ کے موردِ نظر نہیں ہوتے یا مقتدرہ کے مخالف ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس مقام پر نو تاریخیت کا دائرہ عمل شروع ہوتا ہے اور تاریخ کے معروضی مطالعے کی راہوں کو واضح کرتا ہے۔ مضمون میں: "گرین بلاٹ" اور "فوکو" کے نظریات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ برطانوی ثقافتی مادیت کے ضمن میں ادب اور ثقافت کے باہمی انسلاک پر توجہ مضمون کے سرنامے کی مناسبت سے اہمیت حاصل کر گیا ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں نو تاریخیت اور اس کے زیرِ اثر ثقافتی شعریات کی دریافت کے حوالے سے لکھا گیا ہے:

> "نئی تاریخیت کے مضمرات میں اہم بات، اس کا ادب کو ثقافتی ظہور کے تحت وضع کرنے کا نظریہ ہی نہیں ہے، بل کہ اس کے نزدیک خود بھی ثقافتی تفاعلات کو وضع کرتا ہے۔ نو تاریخیت کسی بھی ادیب یا تخلیق کار کو اس کی ثقافتی شعریات کا پروردہ قرار دیتی ہے۔ وہ اس کے تمام افکار و نظریات نیز تخلیقی عمل کو بھی اسی ثقافت سے مربوط قرار دیتی ہے۔ نو تاریخیت مابعد جدیدیت کے زیرِ اثر رواج پانے والے ان تنقیدی رجحانات میں سب سے زیادہ اہم ہے، جو فن، ثقافت اور

ادب سے وابستہ سیاسی، سماجی و تہذیبی تصورات کو غیر جانب دارانہ طریقے سے پرکھتے ہوئے انہیں تاریخ کے مقتدر بیانیوں کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ نوتاریخیت ادبی متون کی تفہیم کے دوران اس عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی تصورات کا مطالعہ کرتے وقت یہ دیکھتی ہے کہ کسی بھی مخصوص عہد کے یہ مقتدر عناصر جنھیں اس عہد کے بااختیار قوتیں متشکل کرتی ہیں، وہ ادب کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں، یا ان عناصر کے سبب ادبی متون میں کسی قسم کی مزاحمت جنم لیتی ہے؛ نیز یہ بھی کہ ادبی متون میں ان رجحانات کی واضح یا مستور و ملفوف عکاسی پر ان قوتوں کی جانب سے آنے والے جبر کا ردعمل بھی نوتاریخیت کا اہم موضوع ہے۔۔۔ نوتاریخیت تاریخ کو محض ایک متن قرار دیتے ہوئے اس میں بیان کیے گئے واقعات کے "بیانات "کو اپنے تجزیے کا مرکز بناتی ہے۔"(٦٧)

اس بیان سے مضمون نگار نے نوتاریخیت کو ثقافتی شعریات کے اخذ و اکتساب کے ضمن میں جانچا ہے۔ ثقافتی مطالعات نے خصوصی طور پر مقتدر بیانیوں کو ہدفِ مطالعہ بنایا اور ان کی ردتشکیل کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے فوکو کے تاریخ پروار ہونے والے طاقت اور استعماریت کے جبر کی خاص طور پر نشا ن دہی کی گئی ہے۔ فوکو تاریخ کا مطالعہ ثقافت کو ان ظواہر کے تحت کرنے پر زور دیتا ہے، جو ثقافتی و ادبی متون میں ایک شگاف کی طرح باقی رہ گئے ہیں۔ اسی وجہ سے نوتاریخیت تاریخ کے موضوعی مطالعے پر توجہ مرکوز رکھتی ہے۔

اس مقالے کی خاص اور نئی بات یہ ہے کہ اس میں نوتاریخیت کے تحت پاکستانی اُردو ادب کو سمجھنے اور پاکستانی عصری تاریخ کے حقیقی استناد کے حصول کی سعی کی گئی ہے۔ پاکستان کی عصری تاریخ کو کیوں کر مرتب کیا جائے اور حقائق کا انکشاف کن بنیادوں اور متون کی مدد سے کیا جائے؟ اس حوالے سے مضمون نگار نے ادبی متون کو تاریخ کے پہلو بہ پہلو رکھ کر سمجھنے کی کاوش کی جائے تو بہتر نتائج کا حصول ممکن ہو سکے گا۔ لکھتے ہیں:

"پاکستان کی عصری تاریخ کے مقتدر بیانیوں کو سمجھنے میں وہ ادباء اور تخلیق کار زیادہ اہمیت کے حامل ہیں، جن کے تخلیقی متون میں اپنے عہد کی تاریخ کا حقیقی عکس ملفوف و مستور کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً: قیام پاکستان کے پس منظر اور بعد از قیام کے سیاسی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی حالات کی تفہیم کے لیے سعادت حسن منٹو کے کئی افسانوی متون، عبد اللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں"، قرۃ العین کا "آگ کا دریا" کا نصف آخر، انتظار کے ہجرت کے تخلیقی تجربات پر مشتمل ناول، شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی" اور "جانگلوس" اور غلام عباس کے وہ افسانے جو پاکستان کی ابتدائی سیاسی و سماجی صورت حال کا احاطہ کرتے ہیں، نہایت اہم ہیں۔ اسی طرح فیض احمد فیض قیام کی پاکستان کے تناظر میں لکھی گئی شاعری، خواجہ معین الدین اور کمال احمد رضوی کے ڈرامے یہ سب ادبی و تخلیقی متون پاکستان کی ابتدائی عصری صورت حال کا مکمل احوال اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ بعد ازاں عبد اللہ حسین کا "نادار لوگ"، مستنصر حسین تارڑ کا ناول "راکھ"، قرۃ العین حیدر کا "آخر شب کے ہم سفر"، مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے عکاس ہیں"۔(۶۸)

واضح رہے کہ، اس مقالے میں نو تاریخیت کے تصور کو بنیاد بنا کر پاکستان کی عصری تاریخ کی موشگافیوں کے انکشاف کے ضمن میں کارآمد ثابت کیا ہے۔ یوں نو تاریخیت کا ادب اور ثقافت کے باہمی روابط کو تاریخِ قریب اور تاریخ بعید کے تناظر کے ساتھ ساتھ مقامی سیاسی تاریخ میں حقائق کی کھوج کے حوالے سے انطباق کیا گیا ہے۔ مضمون کے مندرجات نہایت اہم اور ترتیب مثالی ہے۔ مزید یہ کہ مباحث کو نہایت سادہ زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس مقالے کی اہم خاصیت یہ ہے کہ اس میں نو تاریخیت سے اخذ شدہ بنیادی تصور کو پاکستان کی عصری تاریخ کے استناد کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کرنے کا اعادہ ظاہر کیا گیا ہے اور اس کے تفصیلی اشارے تخلیقی ادب کی

مثالوں سے واضح کیے گئے ہیں۔ ان تمام خصوصیات کی بنیاد پر یہ نو تاریخیت پر ایک اہم مضمون کی حیثیت حاصل کرتا ہے۔

"سید ازور عباس " اور **"ڈاکٹر مطاہر شاہ"** کا مضمون: **" تاریخ، تاریخیت اور نو تاریخیت: بنیادی تعقلات "**، تحقیقی مجلے : **"اردو"** کی جلد ۹۷ کے شمارہ نمبر ۲ میں چھپ کر ۲۰۲۲ء میں سامنے آیا۔(جو کہ اصل "جولائی تا دسمبر ۲۰۲۱ء "کا شش ماہی شمارہ نمبر تھا اور شائع: ۱۰ جنوری ۲۰۲۲ء کو ہوا۔) مضمون کے مندرجات: تاریخ کے مختلف تصورات، تاریخیت، تنقید کا ارتقائی سفر اور تاریخیت کے ظہور و آغاز، تاریخیت پر فنی و فکری اعتراضات اور اس کی محدودیت ،نو تاریخیت ،تاریخی لسانیات ،فوکو کے تصورات اور اور ثقافتی مادیت کی مباحث ، پر مشتمل ہیں۔ آغاز میں تاریخ نگاری کے وسعت کے پیشِ نظر تاریخ کے عمرانی، نفسیاتی، مذہبی اور بشریاتی و ادبی تناظرات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مزید براں، تاریخ اور بیانِ تاریخ میں فرق رکھنے پر اصرار ہے۔ تاریخ ہر گزرتا ہوا لمحہ ہے جو ماضی کا حصہ بن جائے ،جب کہ بیانِ تاریخ سے مراد اُس زمانے کا یاداشتی اور انتخابی اظہار ہے۔ مقالہ نگار "ولہیلم ڈلتھے" کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے مانتے ہیں کہ ؛ تاریخ کے اصول اور اسالیب سائنسی علوم کی طرح موضوعی نہیں ہوتے۔ اسی طرح ابتدا میں تاریخیت کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "تاریخیت سے مراد کسی فن پارے کو اُس کے زمانۂ تخلیق اور تاریخی تناظر میں جانچنا ہے۔ جس سے واضح طور پر یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ادب کی تفہیم تاریخ کے بغیر ادھوری ہے کیوں کہ تاریخیت میں تاریخ مرکز آشنا ہونے کے ساتھ ادب اور تاریخ کے سیدھے سادھے تعلق کی داعی ہے۔ تبھی تاریخیت کے تحت ادب کا مطالعہ خارجی واقعہ کے ساتھ کسی منطقی ربط کی تلاش میں کیا جاتا ہے۔ تاریخیت کا حاوی تناظر مارکسی ناقدین کے باعث زیادہ تر معاشی رہا ہے۔ تاریخیت کے مرکز جو رجحان اور معاشی تناظر کی وجہ جدیدیت کے مظہر روسی ہئیت پسندی کے خلاف

روایتی طرز فکر پر چلتا ہے۔ جس کی کلی معرفت تاریخیت کے پس منظری مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔"(۶۹)

اس پس منظر کی وضاحت میں رومانیت کو تاریخی پس منظر کے عدم کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔"چارلس سینٹ بیو"(Charles Sainte-Beuve)اور"ہیپولائٹ طین"(Hippolyte Taine) کے تاریخی تصورات کو رومانویت کا رد عمل بتایا گیا ہے۔ مزید بر آں ،ہیئتی تنقید سے وابستہ سر گردہ تنقیدی دبستانوں کے رد عمل کے طور پر تاریخیت کا ظہور تاریخ انتقاد ادب کا حصہ ہے ۔مقالہ نگاروں نے تاریخیت کی جہات کو کھولتے ہوئے ،اس کے ڈانڈے تاریخی لسانیات سے ملانے کی بھی سعی کی ہے۔یہی نہیں انہوں نے تاریخیت کی فکری اور فنی محدودیتوں پر سوال بھی قائم کیا ہے اور لکھا ہے کہ تاریخیت متن کو محض تاریخ میں محصور کر کے تقسیم کرنے کی سعی کرتی ہے۔اس ضمن میں وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اس وقت جب تاریخیت ماضی قریب کے ادب کو ماضی بعید کی علامتوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرے گی تو یہ ادب پارے کی درست قرأت کیسے ہو گی؟ مزید یہ کہ تاریخیت کے یک رخے پن کو موردِ سوال لا کر اس طرز مطالعہ کی منہاجیاتی محدودیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس امر کی بھی تصریح کی گئی ہے کہ تاریخیت فن پارے کی تعین قدر کا فریضہ سر انجام دیتی ہے اور اس امر کے لیے وہ اسے فن پارے کے زمانۂ تخلیق سے جوڑ کر دیکھنے کی عادی ہے۔اردو ادب کے متنوع اصناف مثلاً:"مرثیہ، شہر آشوب، قصیدہ" وغیرہ، کے تاریخی مزاج کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔نو تاریخیت کو ایک دورُخا اور غیر راست تصور بتایا گیا ہے:

"نئی تاریخیت ادب اور تاریخ کے غیر راست تعلق کی ترجمان ہے لیکن تاریخیت میں تاریخ کا غالب تناظر مارکسی ناقدین کے باعث زیادہ تر معاشی رہا ہے جب کہ نو تاریخیت تک آتے ہوئے یہ مقصد وجوہات کی بنا پر ثقافتی ہو گیا۔نو تاریخیت میں تاریخیت کی طرح تاریخ کا نہ اکہرا رخ ملتا ہے اور نہ ہی یہ فن پارے کی تناریخی

تناظر میں تفہیم کرتے ہوئے کوئی منطقی رشتہ تلاش کرتی ہے۔مذکورہ تبدیلیوں کی مرکزی وجہ نو تاریخیت کا مابعد جدیدیت کے زیر سایہ پروان چڑھنا ہے: جسے منطقی طور پر جانچنے کے لیے مابعد جدیدیت کی آمد اور اہم محرکات کو ترتیب کے ساتھ سمجھنا ضروری ہے۔وگرنہ نو تاریخیت کی درست تفہیم کھل کر سامنے نہ آسکے گی۔"(۷۰)

مذکورہ کے تصورات اور ثقافتی مادیت کے ضمن میں خاصی تفصیلات مندرج ہیں،جو اردو مصادر سے استفادہ کی بدولت سابقہ مباحث میں زیر بحث لائی جا چکی ہیں۔مضمون کے آخر میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے فکری اور منہاجیاتی افتراق کو واضح کیا گیا ہے:

"تاریخیت ادب کی تفہیم کے لیے اسے تاریخ کے زیر سایہ رکھتی ہے:اس کے برعکس نو تاریخیت ادب اور تاریخ کو مساوی بنیادوں پر ساتھ لے کر چلتی ہے۔تاریخیت صرف اجتماعی،مرکزی تاریخ سے سروکار رکھتی ہے جب کہ نو تاریخیت،کلچر،سیاست کے علاوہ تاریخ کی تمام مبہم تہوں میں سلسلہ در سلسلہ اترتی ہے۔تاریخیت ایک واحد تھیوری کو اتھارٹی مانتی ہے اور نو تاریخیت واحد بیانیے کی مخالفت کرنے کے ساتھ کئی تناظرات اور بیانیوں سے ادب کو دیکھنے کی داعی ہے۔تاریخیت مارکس اور نو تاریخیت فوکو،دریدا کے فکری اشارات کے زیر اثر چلتی ہے۔۔۔۔۔۔علاوہ ازیں تاریخیت مرکز جو،نو تاریخیت مرکز گریز ،تاریخیت ربط و تسلسل،علت و معلول،حقیقت کے واحد تصور کی امین نو تاریخیت اس کے متضاد حقیقت کے کئی چہروں،خلاؤں اور الجھاؤ کی کتھا ہے۔یہ سب افتراق دائرہ کار کے لحاظ سے ہیں لیکن مرکزی سطح پر نو تاریخیت،تاریخیت کا رد عمل نہیں بل کہ نقشِ ثانی ہے۔"(۷۱)

اس اقتباس اور پورے مضمون کی قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگاروں نے تاریخ، تاریخیت اور نو تاریخیت کے محیطی اور ذیلی تصورات کو اچھی طرح تفہیم کر کے لکھت کا حصہ بنایا ہے۔ اردو میں دستیاب مواد کی بنا پر نو تاریخیت کی مباحث کو جمع کرنے کی یہ ایک اچھی مثال ہے۔

"نو تاریخیت"، کے عنوان سے **"ڈاکٹر عبدالعزیز ملک"** کا مضمون اُن کی کتاب: "معاصر تنقیدی رجحانات "میں شائع ہوا۔ یہ کتاب ۲۰۲۲ء میں شائع ہوئی۔ مجموعی طور پر یہ مضمون بھی اُردو میں پہلے نو تاریخیت پر اٹھائی گئے مَباحث کو جمع کرتا ہے۔ مضمون نگار نے تاریخیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: "تاریخیت دراصل تاریخ کو معرضِ تفہیم میں لانے اور اسے استعمال کرنے کے طریقے ہے۔ تاریخ کا علم رشتوں اور رابطوں کا علم ہے اور ان رشتوں اور رابطوں کو تاریخ کے مطالعے میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تمام سماجی اور ثقافتی رشتوں اور مظاہر کا تعین تاریخیت کے ذریعے ہوتا ہے۔ چوں کہ ادب ثقافتی مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اس لیے اس کے تعین اور قدر کے لیے تاریخیت کی تفہیم بھی لازمی قرار پاتی ہے۔"[۷۲] تاریخیت اور ادب کے باہمی روابط کی وضاحت سے انہوں نے نو تاریخیت کے تصور کو اخذ کیا ہے اور اس کی وضاحت یوں کی ہے:

> "نو تاریخیت ایک ادبی تھیوری ہے۔ جس کا مقصد دانش ورانہ تاریخ کو ادب کے ذریعے جانچنا اور ادب کو ثقافتی تناظر میں پرکھنا ہے۔ آسان لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادب اور ثقافت کی ہم آہنگی کا دوسرا نام نو تاریخیت۔ اس میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ادب نہ صرف اپنے عہد کے حالات و واقعات سے اثر پذیر ہوتا ہے بل کہ ادب کو معرض تفہیم میں لانے والا قاری (نقاد) بھی عصری اور تاریخی صورت حال سے اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نو تاریخیت کی ادبی تھیور ی میں ادب کو وسیع تر تناظر میں رکھ کر مصنف اور نقاد کے عہد کو جانچا جاتا ہے کہ "کیسے" اور کس طرح "مصنف کے عہد سے ادب متاثر ہوا یا مصنف کے دور

کی عصری صورت حال کیسے اور کس طرح ادب میں منعکس ہوئی۔ یہ سب ثقافتی تاریخ کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔ ادب کے سلسلے میں اپنے تصورات نو تاریخیت سے قبل ہیڈن وائٹ، گولڈ مان، ریمنڈ ولیمز، فریڈرک جیمی سن اور کلی فورڈ کے ہاں بھی موجود ہیں۔"(۷۳)

مضمون نگار نے مختصراً گرین بلاٹ کی سوانح اور تصورات کے علاوہ فوکو اور بیلسی کے تصورات کی جانب بھی اشارے کیے ہیں۔(تعجب ہے کہ صاحبِ مضمون نے "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" کو بار بار **"بالٹ"** لکھا ہے۔ جو کسی تناظر میں بھی "Blatt" کی اردو املا نہیں بنتی۔ اور نظریۂ نو تاریخیت کے تناظر میں انتہائی اساسی اہمیت ہونے کی بنا پر "گرین بلاٹ" کا اُردو میں بھی اس قدر ذکر ہے کہ شاید غلطی کی گنجائش باقی نہیں۔ ہاں **"بلیٹ"** کی پھر بھی شوقیہ گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ مگر "بالٹ" تو کسی صورت درست نہ ہے۔)مزید براں، تاریخیت، نو تاریخیت اور مارکیست کی ذیلی اور بالائی روابط کو سمجھانے کی بھی سعی کی ہے۔ صاحب مضمون نے نو تاریخیت اور نو آبادیاتی نکتہ نظر کی مماثلتوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے آلیتھوسے، گرامچی، ایڈورڈ ودلیع سعید اور گائتری کے تصورات کو دیکھنے کی دعوت بھی دی ہے۔ یوں نو تاریخیت اور سبالٹرن(Subaltern) کلاس اور عورتوں کے حقوق کے ذیل میں ہونے والے ادبی مطالعات کے ڈانڈے بھی ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ عبد العزیز ملک کا مذکورہ مضمون تاثراتی اور تربیتی نوعیت کا ہے۔ جس میں مصنف کے اپنے تنقیدی تجزیے کی کمی ہے اور زیادہ تر اقتباسات سے بات کو ایک رخ سے دوسرے رخ کی طرف منتقل کیا گیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ مضمون نے اس کے تصورات اور اساسی اراکین سے متعلق خود جانچ پڑتال کی سعی ہی نہیں کی۔ بس ایک دھندلا سا عکس ذہن میں ترتیب دے کر اور مواد اکٹھا کر کے ایک اساسی سا مضمون لکھ دیا ہے۔

اُردو تنقید میں نو تاریخیت کے نظری مَباحث کے مضامین کے حوالے سے، عصرِ رواں(دسمبر، ۲۰۲۲ء) تک آخری تازہ کاوش: **"اورنگ زیب قاسمی"** کی ہے۔ اورنگ زیب قاسمی، کی حال ہی میں شائع شدہ تصنیف

بعنوان: "ادبی تھیوری: بنیادی تصورات اور مباحث" ہے، جو ستمبر ۲۰۲۲ء کے اواخر میں شائع ہوئی۔ جس میں اورنگ زیب قاسمی نے ایک انتہائی مختصر مضمون: **"نو تاریخیت"** کے عنوان سے رقم کیا ہے۔ اورنگ زیب قاسمی نے اس مضمون کو "پانچ "(۵) ذیلی عنوانات میں منقسم کیا ہے۔ جو کہ: ۱۔ تعارف، ۲۔ نو تاریخیت کا ظہور، ۳۔ نو تاریخیت کا نظریاتی تناظر، ۴۔ نتیجہ، ۵۔ خلاصہ "ہیں۔ (اورنگ زیب قاسمی، نے اپنی اس کتاب کے دیگر مضامین کو بھی اُن کے موضوعات کے لحاظ اسی انداز میں بیان کیا ہے۔ یعنی تعارف، نتیجہ اور خلاصہ وغیرہ کا انداز قریباً ایسے ہی رکھا ہے۔ اور مضامین کا ڈھانچہ اسی نوع کے ضمنی عنوانات پر ہی استوار کیا ہے۔) جہاں تک اس مضمون کے لب لباب اور نتائج کا تعلق ہے تو اورنگ زیب قاسمی نے کوئی خاص نیا نتیجہ بیان نہیں کیا، بل کہ روایتی انداز میں وہ نو تاریخیت کی پوری بحث کے خلاصے کو اس طرف مرکوز کرتے ہیں کہ نو تاریخیت ہمیں ادبی متن کی اہمیت سے شناسا کرتی ہے اور ہمیں باور کراتی ہے کہ نو تاریخیت کے تحت ادبی متن دوسرے متون سے کم اہمیت کا حامل نہیں ہے ۔ بل کہ تاریخی اور ثقافتی تناظر میں ادبی متن کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی دیگر تاریخی، ثقافتی اور سماجی متون کی ۔ یعنی اس پہلو کو اورنگ زیب قاسمی نو تاریخیت کے مباحث کا حاصل گردانتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ بل کہ وہ تمام تحریروں کو بھی نو تاریخیت کی رو سے ایک جیسا سمجھتے ہیں۔ "کسی ایک مصنف کی تحریریں دوسرے مصنفین کی تحریروں سے بہتر نہیں، کسی خاص تحریر کو دوسری تحریروں پر فوقیت حاصل نہیں۔۔۔ بل کہ تمام تحریریں، ادبی اور دیگر (بشمول "مقبول "تحریریں جیسے کہ ٹیلی وژن شوز، اشتہارات اور رومانس) مطالعہ کے لائق ہیں ۔"[۷۴] (اور اس حصۂ تحریر کو ہو بہو اپنے انتہائی مختصر مضمون میں دوبار دہراتے ہیں۔) ساتھ ہی وہ نتیجے کے ضمن میں ایک دھندلا سا دعویٰ لکھتے ہیں: "ایک نظری نقطۂ نظر کے طور پر تاریخیت کا دعوی ہے کہ قارئین اپنی ثقافت سے متاثر ہوتے ہیں، اس لیے کسی کام کا کوئی معروضی مطالعہ ممکن نہیں ہے۔"[۷۵] یہاں صاحبِ مضمون یہ نکتہ واضح کرنا بھول گئے ہیں کہ چوں کہ ماضی ایسی ٹھوس شے (مادی یا جسمانی) نہیں کہ جسے ہم پا سکیں لہذا ہم اسے استوار اپنی تاریخ اور تاریخی متون (اس وقت کے براہ راست اور موجودہ تاریخی دستیاب متون) پر کرتے ہیں۔

اس لیے عام طور پر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ماضی کا معروضی مطالعہ ممکن نہیں ہے، مگر یہ بھی نہیں کہ نو تاریخیت اس پر سراسر اصرار کرتی ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بل کہ نو تاریخیت کا ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ از حد معروضیت کو مد نظر رکھتے ہوئے مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ اپنے مضمون کے قریباً آغاز میں ہی امریکہ کی ادیبہ اور نقاد: "لوئس ٹائسن (Lois Tyson)" کا حوالے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے مطابق نو تاریخیت کا آغاز ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخر سے ہوا اور اس کے مباحث کا آغاز "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" نے کیا ہے۔ اسٹفین جے گرین کا حوالہ تو درست ہے، مگر مباحث کے آغاز اور نو تاریخیت کی اصطلاح کے استعمال کے حوالے سے "اسٹفین جے گرین بلاٹ" خود کہتے ہیں کہ انہوں نے ۱۹۷۲ء میں اس لفظ کو پہلی بار استعمال کیا اور دیگر تحقیقات بھی یہی ثابت کرتی ہیں۔ جب کہ صاحبِ مضمون کے مطابق "لوئس ٹائسن" کا حوالہ دیتے ہوئے اِن مباحث کا آغاز ۱۹۷۰ء کی آخری دہائی میں ہوا ۔ اورنگ زیب قاسمی، نے اپنی اس کتاب میں ابواب یا مضامین کے آخر پر بھی حوالہ جات نہیں دیئے۔ اور نہ ہی یہ بتانا چاہا کہ یہ کون سی "لوئس ٹائسن" ہیں۔ کیوں کہ وہ اردو طبقے میں اس قدر معروف تو ہیں نہیں کہ عام قاری انہیں جانتا ہو ۔ لہذا راقم کی تحقیق سے اُن کا یہ بیان ان کی کتاب: "Critical Theory today: A User Frindly Guide" سے اخذ کیا گیا ہے۔ جو کہ دوسری بار ۲۰۰۶ء میں "راوٹ لیج، نیویارک" (Routledge , New York) سے شائع ہوئی۔ جس میں لوئس ٹائسن "صرف اتنا لکھتی ہیں: "New Historcism,which emerged in the late 1970."[76]، جس سے مراد یہ ہے کہ نو تاریخیت پہلی بار ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخر میں ابھری۔ لیکن صاحبِ قلم کو اس کا علم نہ تھا اور تو اور مضمون نگار نے نو تاریخیت کے بنیاد گزار "اسٹیفن گرین بلاٹ کا نام بھی "بلاٹ" کی جگہ "بلیٹ" استعمال کیا ہے۔ (یعنی انہوں نے بھی "ڈاکٹر عبد العزیز جیسی غلطی کو دہرایا ہے۔) ساتھ ہی "لوئس ٹائس" کی جنس تبدیل کرتے ہوئے، اسے "عورت" سے "مرد" بھی قرار دے دیا ہے۔ "لوئس ٹائس لکھتا ہے کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخر میں نو تاریخیت کا ظہور ہوا۔ روایتی تاریخیت نے ادب کو محدود کیا، جب کہ نئی تنقید نے ادبی متن کو تاریخ سے پرے اور زماں سے ماورا ایک جہت میں مقید کر دیا۔"[۷۷] یہاں یہ

نشان دہی کرنی شاید اتنی اہم نہ ہو مگر ایک وقیع نقاد سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔(جہاں مضمون نگار نے مضامین کے آخر پر حوالہ جات کا اہتمام نہیں کیا، وہیں کتاب کے آخر پر کوئی خاص کتابیات بھی نہیں دی گئی۔ صرف "بارہ" (۱۲) انگریزی کتب کے نام، اُن کے مصنفین کے ناموں کے بغیر لکھ دیئے ہیں۔ تاکہ جیسے مضمون نگار نے بنیادی مآخذ سے استفادہ نہ ہونے کے برابر کیا ہے، ویسے ہی کوئی اور بھی نہ کر سکے۔)نو تاریخیت کے نظری تناظر میں اس مضمون میں جو نکات سامنے لائے گئے ہیں وہ یہ ہیں:"صاحبِ مضمون کے نزدیک (جیسا کہ پہلا بھی بارہا ذکر کیا جا چکا ہے کہ)نو تاریخیت کا بنیادی سروکار واقعہ کیا ہوا ہے؟ سے نہیں، بل کہ نو تاریخیت کا سروکار، وہ طرائق ہیں جس سے ان واقعات کی تفہیم و تشریح کی جاتی ہے۔وہ متون ہیں جو حقائق کو سامنے لاتے ہیں۔ اسی طرح یہ توضیح بھی پیش کی گئی ہے کہ ادبی مطالعات کے لیے نئے مورخ کا نقطہ ہائے نظر تین چیزوں پر مبنی ہوتا ہے اور وہ تین چیزیں؛ "ادب، مصنف اور قاری"ہیں۔ نیز یہ کہ نو تاریخی نقاد خالی ادبی متون پر ہی اکتفا نہیں کرتا بل کہ وہ ادبی کے ساتھ "غیر ادبی" اور "پاپولر فکشن" کے متون سے بھی استفادہ کرتا ہے۔یہاں پاپولر فکشن سے متعلق رائے قابل غور ہے۔(جس کا تعقل تو جواز مہیا نہیں کرتا۔)اسی طرح نو تاریخیت کی نظری جہات کی وضاحت کرتے ہوئے "خودی" کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں۔"اس متعلق لکھتے ہیں:

> "نو تاریخیت متعدد تصورات جیسے ثقافت، متن، گفتگو، نظریہ، **خودی** اور تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے اور اس عمل میں ہم نو تاریخیت کے بنیادی مفروضات کا سراغ لگا سکتے ہیں۔"(۷۸)

خودی کا لفظ بلاشبہ معنی کے لحاظ سے وسعت کا حامل ہے۔ مگر وسعت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔اور متعدد مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ اورنگ زیب قاسمی، کے اس مضمون:"نو تاریخیت"کا ماحصل کچھ یوں ہے:اس ضمن میں سب سے پہلا پہلو جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس مضمون کا ڈھانچہ تو ضمنی عنوانات کی ذیل میں استوار کیا گیا ہے مگر نہ ہی وہ واضح ہیں اور نہ ہی وہ اپنی حیثیت پر پورا اترتے ہیں یعنی کہ "نو تاریخیت کے ظہور" جیسے عنوان

کے تحت نظریات کو بحث کا حصہ بنایا جارہا ہے تو وہیں دوسری طرف نظری مبحث کے عنوان کے تحت عمومی بحث کو شامل کیا جارہا ہے۔ اس سارے مضمون کا تاثر یہ ملتا ہے کہ یہ کوئی تحقیقی یا تنقیدی مضمون نہ ہے، بل کہ یہ اُردُو میں موجود پرانے مضامین کے تحت ایک تدوین کا نمونہ ہے کہ جس میں اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے سے موجود مواد کو ہو بہو انتہائی عجلت میں بیان کر دیا ہے۔ کوئی بھی نیا قاری جب نو تاریخیت کے تعارف کی غرض سے اس مضمون کا مطالعہ کرے گا تو وہ خَرخَشہ کا شکار تو ہو گا ہی سہی، وہیں نو تاریخیت جیسا وقیع موضوع (نظریہ) اُس کے نزدیک کوئی زیادہ اہمیت کا حامل بھی نہیں رہے گا۔ مضمون ہٰذا، آخر الذکر مضمون (نو تاریخیت از ڈاکٹر عبد العزیز ملک) سے بھی تحقیقی و تنقیدی تناظر میں انتہائی کم زور نوعیت کا حامل ہے۔ تا آں کہ اُس کا شمار بھی انتہائی کم زور مضامین میں ہوتا ہے۔

نو تاریخیت کے نظری مباحث سے متعلق اردو تنقید کی دنیا میں بالا بیان کئے گئے "چودہ"(۱۴) مضامین کے علاوہ ایک "ایم۔فل:اُردُو" کی سطح کا تاحال غیر مطبوعہ تحقیقی سندی مقالہ بھی ہے۔ جس کا عنوان:"**اُردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مَباحث**" ہے اور اسے: "**سید ازور عباس**" نے اپنے نگران:"پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران" کی نگرانی میں ۲۰۱۸ء میں:"شعبۂ اُردُو، اوری اینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور" میں اپنی" ایم۔فل" کی ڈگری کی تکمیل کی غرض سے رقم کیا۔ یہ مقالہ کل "چار"(۴) ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول کا عنوان:"اردو تنقید کی روایت (آغاز تا نو تاریخیت)"، باب دوم:"اردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے نظری مباحث"، باب سوم:"اردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کی اطلاقی جہات" اور باب چہارم:"محاکمہ" کے عنوان سے ہے۔ جسے تین حصوں؛"الف۔ محاکمہ، ب۔ کتابیات اور ج۔ ضمیمہ (تاریخیت اور نو تاریخیت کے انگریزی سے اُردُو میں ترجمہ شدہ مضامین کا جائزہ)"، میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اگر ابواب کا ایک سطری جائزہ لیا جائے تو مجموعی طور پر مقالہ نگار نے نقد الانتقادی طریقہ کار اپناتے ہوئے اُردو میں میسر تاریخیت اور نو تاریخیت کے مواد کا تجزیہ کیا ہے۔ جب کہ اس کے آغاز میں پہلے باب میں اُردُو تنقید کی روایت کا مفصل احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور

اجمالی نظر ڈالتے ہوئے اس روایت کی کڑیاں نو تاریخیت سے ملانے کی سعی کی ہے۔اس روایت کو بیان کرتے ہوئے مقالہ نگار نے اس ضمن میں اُردُو کے اہم ناقدین ،اُردُو تنقید کی تنقیدی تحریکات ، نظریات ،رُجحانات اور میلانات، کو متراکب طرز میں تسلسل کے ساتھ پیش کرتے ہوئے'فارسی ،عربی اور انگریزی تنقید کے اُردُو پر اثرات کا الگ الگ جائزہ لے کر باب کو ترقیم سے آراستہ کیا ہے۔چوں کہ ہمارا موضوع کامل تنقیدی روایت سے متعلق نہ ہے۔اس لیے مزید بحث میں الجھے بغیر ہم مختصراً مقالہ نگار کی نظر سے اُردُو تنقید کی روایت میں؛ تاریخی تنقید، تاریخیت اور نو تاریخیت کے آغاز کو دیکھتے ہیں۔اس ضمن میں "سید ازور عباس" پہلے باب میں یوں لکھتے ہیں:

> "انیسویں صدی کی سوانحی اور تاریخی تنقید ادب پر تاریخ کو ترجیح دیتی تھی۔وہ ادب کو اس زمانہ تخلیق کے عصری منظر نامے کے تحت دیکھ کر ادب اور خارجی واقعے میں علت اور معلول کا رشتہ تلاش کرتی۔یوں فن پارے سے زیادہ تاریخ اور مصنف کو مرکزی حیثیت مل جاتی۔تاریخیت کا یہ رجحان مارکسی نقادوں نے اپنایا۔۔۔۔۔نو تاریخیت سے ایک بار پھر ادب ،تاریخ سے منسلک ہوا۔اب ادب پر تاریخ کو برتری حاصل نہیں تھی۔تاریخ کا کوئی من مانا،اکہرا روپ نہیں رہا تھا۔ادب اور تاریخ کو مساوی مقام دیا گیا۔"(۷۹)

اُردُو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے نظری مباحث ،اس مقالہ کا دوسرا باب ہے۔اس باب میں تصورِ تاریخ اور تاریخیت کا بیان کرتے ہوئے،اور تاریخیت کے اردو میں موجود متون کا جائزہ لیتے ہوئے بحث کا رخ نو تاریخیت کی جانب بڑھایا ہے۔اور اردو تنقید میں نو تاریخیت کے نظری مباحث سے متعلق مضامین کا تجزیہ کیا ہے۔اس تجزیہ میں کل "دس"(۱۰)مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔جن تمام کا بیان و جائزہ مقالہ ہذا کے اسی باب (سوم)میں پیچھے لیا جا چکا ہے۔مقالہ نگار نے انداز کچھ یوں اپنایا ہے کہ تاریخی تنقید،تاریخیت اور نو تاریخیت تک ادبی تنقید کے ارتقائی سفر کے ضمن میں مختلف رجحانات کے رد و قبول کی وضاحت کرنے کے بعد مقالہ نگار نے

تاریخیت کی ماہیت ،ادبی طریق کار اور اس کی حدود کو بہ طور خاص موضوع بنایا ہے۔بعد ازاں ،نو تاریخیت کو تاریخیت کا رد عمل نہیں بل کہ نقش ثانی قرار دے کر نو تاریخی تنقید کے ثقافتی ،متنی اور ادبی تصور کی تفصیلی وضاحت پیش کی ہے۔اس کے بعد صاحب مقالہ نے اردو میں سامنے آنے والی نو تاریخی مباحث کا احاطہ کیا اور جا بجا مختلف ناقدین کی آرا پر تبصرے بھی کئے ہیں۔صاحب مقالہ جا بجا سوالات اٹھائے نظر آتے ہیں۔بعض مقامات پر سوال اٹھا کر جواب ڈھونڈ کر دینے کی سعی کرتے ہیں اور بعض مقامات پر سوال چھوڑ کر گزر جاتے ہیں۔اردو تنقید میں نو تاریخیت کے نظری مباحث کے حوالے سے سامنے آنے والے مختلف ناقدین کے مضامین کو صاحِب مقالہ نے تلخیص کے عمل سے گزارا ہے۔اس تلخیص میں مضامین کے اہم نکات کو اجاگر کیا گیا ہے۔یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ،صاحبِ مقالہ نے مختلف مضامین میں بار بار دہرائی جانے والے مباحث کو بھی بارہا رقم کرنے کی سعی کی ہے۔یوں تمام مضامین کے نقدالانتقادی جائزوں میں کئی چیزیں دہرائی کا شکار ہوئی ہیں۔مختلف مضامین کے تجزیے کرنے کے بعد صاحب مقالہ ان پر ایک عمومی رائے کا اظہار بھی کرتے ہیں اور مقالے کے حسن و قبح یا تعین قدر کا فیصلہ کرتے ہیں۔ایک مثال یہاں رقم کی جاتی ہے۔گوپی چند نارنگ،کے مضمون پر ان کی رائے ہے:

> "مجموعی طور پر گوپی چند نارنگ کا مضمون "تاریخیت او رنئی تاریخیت (ادبی تھیوری کا ایک اہم مسئلہ) " نہایت مدلل، مبسوط اور منطقی انداز میں تاریخ،تاریخیت ،نو تاریخیت ،نو تاریخیت کے ناقدین، تہذیبی مادیت اور نو تاریخیت کے دیگر تنقیدی رویوں سے تعلق کو واضح کرتا ہے۔انہوں نے تاریخیت اور نو تاریخیت کے مغربی تناظر کو پیشِ نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مشرقی (اُردو) تناظر اور اس کے پس منظری لوازمات پر بھی بات کی ہے۔ مضمون میں فطری ربط کی وجہ سے کسی قسم کی موضوعاتی کمی یا بے ربطگی ظاہر نہیں ہوتی۔ مضمون نگار نے جس طرح بالترتیب نکات بیان کر کے نو تاریخیت کے نتائج بر آمد کیے ہیں اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع پر کامل

دسترس رکھتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے تحقیق، تنقید اور استفہامی فضا سے ایک شاہ کار مضمون قلم بند کیا ہے۔ اگر وہ ہیئت پسندی اور ترقی پسندی کے مباحث میں جذباتی ہو کے زیادہ ترقی پسندوں کی طرف جھکاؤ نہ کرتے تو یہ زیادہ بہتر ہوتا۔"(۸۰)

تنقید کی مناسب اور سادہ سلیس زبان اور بے دھڑک اظہار اس مقالے کی خصوصیت ہے۔ جس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ صاحب مقالہ نے نظری مباحث کے نقد الانتقادی جائزے میں نو تاریخی تنقید کے سرکردہ ناقدین کے اصلی متون کے ساتھ مباحث کا تقابلی جائزہ نہ ہونے کے برابر کیا ہے۔ اور نہ ہی ان سے خاص استفادہ کیا ہے۔ سید ازور عباس، کے مقالہ کے باب دو میں نو تاریخیت کے تناظر میں زیر بحث لائے گئے تمام مضامین کا تجزیہ مقالہ ہذا کے اسی باب میں پہلے کیا جا چکا ہے۔ لہذا اس واسطے انہیں یہاں تفصیلی دوبارہ زیر بحث نہیں لایا جارہا۔ اس مقالے کا تیسرا باب اطلاقی مطالعات سے متعلق ہے۔ جس کا جائزہ مقالہ ہذا کے باب چہارم میں پیش کیا جائے گا۔ مقالہ کے آخر پر حسب روایت "محاکمہ" دیا گیا ہے۔ علاوہ بریں ضمیمہ کے طور پر نو تاریخیت کے تناظر میں دو انگریزی مضامین کے اردو تراجم کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں ایک مضمون "ڈان ای۔ وین" کا جس کے مترجم :"فرحت احساس" ہیں اور دوسرا مضمون "پیٹر بیری" کا ہے۔ جس کے مترجم "الیاس بابر اعوان" ہیں۔ پیٹر بیری کا ترجمہ شدہ مضمون ہمیں نو تاریخیت اور ثقافتی مادیت سے متعلق اساسی معلومات مہیا کرتا ہے۔ جب کہ: "ڈان ای ۔وین" کا مضمون ہمیں " تاریخ، تاریخیت، نو تاریخیت، ثقافتی مادیت اور مابعد جدید منظر" کا احوال اور ان ظواہر کے داخلی اور خارجی تعلقات کے اشتراکات و افتراقات کو بیان کرتا ہے۔ (ڈان ای۔ وین، کے مضمون کے ترجمے کا جائزہ مقالہ ہذا کے اسی باب میں اوپر لیا جا چکا ہے۔)

اُردُو میں نو تاریخیت کی مباحث کا عمومی دائرہ کار چند ایک اساسی مضامین کا مرہون ہے۔ یہ مضامین ریاض صدیقی، ناصر عباس نیّر، عتیق اللہ اور گوپی چند نارنگ کے توسط سے سامنے آئے ہیں۔ ان مضامین میں محتویات کے

تھوڑے بہت اختلاف کے باوجود ایک ہی ڈھنگ اور طرز پر مباحث کو آگے بڑھانے کا رویہ پایا جاتا ہے۔ عمومی طور پر نو تاریخیت کی مبحث میں وارد ہونے سے پہلے تاریخ، تاریخی تنقید، تاریخیت کے تصورات کو بل وضاحت درج کر کے نو تاریخیت تک رسائی کا فکری سیاق میسر کیا گیا ہے۔ یہاں دو طرح کے رویے سامنے آتے ہیں۔ ایک: رویہ ادبی تنقید کی فطری جست اور ادبی معیارات کے معلامات میں رد و قبول کے تسلسل کی بنیاد پر نو تاریخی تناظر کو منظر نامے پر اجاگر کرتا ہے۔ اس ضمن میں عتیق اللہ، ناصر عباس نیّر اور گوپی چند نارنگ کے مضامین کی مثال دی جا سکتی ہے۔ دوسرا: رویہ حکومتوں اور مقتدرہ کے طاقت اساس نظام انتظام کو ادبی تھیوریوں کے نفاذ میں کلیدی اہمیت سے ہم کنار کرتے ہیں۔ اس ذیل میں ریاض صدیقی کے دونوں مضامین کی مثال دی جا سکتی ہے۔ ریاض صدیقی بادی النظر میں ادبی تھیوری کو نئے عہد کی سیاست سے ملا کر دیکھتے ہیں اور تھیوری ادبی حیثیت کو دھندلا دیتے ہیں۔ اردو میں نو تاریخیت کی نظری مباحث میں "گرین بلاٹ، آلیتھوسے، فوکو اور دیگر مابعد جدید اور پسِ ساختیاتی مفکرین" کی آرا سے استفادہ کا رجحان بھی عام ہے۔ اصل یہ ہے کہ ان مفکرین کے تصورات نے نو تاریخیت کی علمیات کی وضاحت میں اساسی نوعیت کی ہم کاری کی ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ادبی و ثقافتی مطالعات(New Culturel Shift) میں نئی شفٹ ایجاد کرنے میں سبقت حاصل کی۔ اس شفٹ نے مطالعات کی فکری اور فنی حکمت عملیوں اور حربوں میں تبدیلی ایجاد کی اور ناقدین نے ادب کے نئے مطالعات کی طرف توجہ مرکوز کی۔ روایتی اور قلعہ بند اکہرے اور واحد قائم شناختوں پر مصر تنقیدی نظریات کی جگہ کثرت آمیز اور جدید تناظرات نے لے لی۔ مرکزیت کے تصورات نہ صرف شکست و ریخت سے دوچار ہوئے بل کہ اپنے اعتبار بھی کھوتے چلے گئے۔ مابعد جدیدیت نے مقتدرہ کو چیلنج کیا تو اس کے اثرات بھی تقریباً تمام نئے تناظرات سے دیکھنے کو ملے۔ ان تناظرات سے اردو ادیبوں کی آشنائی، یقینی طور پر نو تاریخیت کے نظریے تک رسائی کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اردو میں نو تاریخیت کو صرف ان ناقدین نے موضوع بحث بنایا جنہوں نے ادبی و ثقافتی تھیوری کی مباحث اور مابعد جدید تناظرات کو اپنی فکری تشکیل کا حصہ بنایا۔ اردو میں نو تاریخیت کی نظری تنقید

عمومی طور پر دیگر مابعد جدید تنقیدی تناظرات کی طرح فراموشی کا شکار نظر آتی ہے۔ اگر ساختیات، پسِ ساختیات ،تانیثیت ،ماحولیاتی تنقید اور پس نو آبادیاتی تنقید جیسے مابعد جدید تناظرات سے نو تاریخیت کے اردو میں ہونے والے مُطالعات کا تقابل کیا جائے، تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ مذکورہ تناظرات کے مقابلے میں نو تاریخیت پر سب سے کم لکھا گیا اور بہت کم تنقیدی ڈسکورس کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اسی تناظر میں اطلاقی مطالعات کا جائزہ اگلے باب میں لیا جائے گا۔

حوالہ جات

۱. ناصر عباس نیرّ، ڈاکٹر، لسانیات اور تنقید، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۳

2. M.H Abrams,A glossary of literary terms ,Hol.Rinehart& winstom London ,1988 A.D,P: 35,36

۳. ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر، نظریاتی تنقید (مسائل ومباحث)، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص:۱۲

۴. حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تنقید اور تحقیقی جائزے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۲۳۰

۵. عبادت بریلوی س، ڈاکٹر، اردو تنقید کا ارتقاء، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص:۸۶،۸۵

۶. قاضی افضال حسین، ڈاکٹر، تحریر اساس تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء، ص:۱۰۳

۷. فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۷۱، ۷۰

۸. عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر، اردو تنقید۔ چند منزلیں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶

۹. کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، سرفراز قومی پریس، لکھنو، ۱۹۶۴ء، ص:۸۷

۱۰. شبلی نعمانی، شعر العجم (جلد چہارم) معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۲۳ء، ص:۷۹

۱۱. وہاب اشرفی، ڈاکٹر، کاشف الحقائق: ایک مطالعہ، ایجوکیشنل پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص:۲۰

۱۲. میراجی، مشرق ومغرب کے نغمے، آج، کراچی ۱۹۹۹ء، ص: ۴۷۳

13. Gupte Shwer Prasad , I.A Richards and Indian Theory of Rasa ,Sarap &sons ,New Dehli ,2007 ,P:255

۱۴. ریاض احمد، ڈاکٹر، اردو تنقید کا نفسیاتی دبستان (مضمون) مشمولہ: تنقیدی نظریات، مرتبہ: ڈاکٹر احتشام حسین، جلد اول، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، ۲۰۰۹ء، ص ۲۹۴۔۲۹۵

۱۵. قاسم یعقوب، ڈاکٹر، تنقیدی سیاق اور نئے سوال، کتابی دنیا، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۹۱

16. Roland barthers, Images, music, Text, selected and Trans:Stephen Heath, London, Macmillian,1977, P: 146

۱۷. سجاد باقر رضوی،ڈاکٹر، طین اور ساں بو(مضمون)مشمولہ: تنقید کی جمالیات، مرتبہ: پروفیسر عتیق اللہ، جلد: دوم، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۸ء ص ۲۵۵

۱۸. محمد حسن، ڈاکٹر، مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء، ص ۲۰۷

۱۹. گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، جدیدیت کے بعد، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص: ۱۲۰

۲۰. عتیق اللہ، پروفیسر، تاریخیت اور نو تاریخیت، مشمولہ: ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، مرتبہ: داختر ندیم احمد، نئی دہلی، جامعہ نگر، ۲۰۰۲ء، ص ۴۸۷

۲۱. وزیر آغا، ڈاکٹر، دستک اس دروازے پر، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۹۳ء ص: ۱۶۶

۲۲. قاضی افضال حسین، ڈاکٹر، تحریر اساس تنقید، ایضاً، ص: ۱۳

۲۳. ریاض صدیقی، نو تاریخیت (مضمون)، مشمولہ: نو تاریخیت، مرتبہ: ڈاکٹر نسیم عباس احمر، مثال پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۱۸ء، ص: ۳۶، ۳۵

۲۴. ریاض صدیقی، نو تاریخیت (مضمون)، مشمولہ: نو تاریخیت، مرتبہ: نسیم عباس احمر، ڈاکٹر، ص: ۳۶

۲۵. ریاض صدیقی، اردو تنقید کا مسئلہ اور نو تاریخیت (مضمون) مشمولہ: نو تاریخیت، مرتبہ: نسیم عباس احمر، ڈاکٹر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص: ۴۱

۲۶. ریاض صدیقی، اردو تنقید کا مسئلہ اور نو تاریخیت، (مضمون) مشمولہ: نو تاریخیت، مرتبہ: نسیم عباس احمر، ڈاکٹر، ایضاً، ص: ۴۳، ۴۲

۲۷. ایضاً، ص ۴۷

۲۸. ایضاً، ص: ۴۷

۲۹. ایضاً، ص: ۵۰،۴۹

۳۰. ایضاً، ص:۴۹

۳۱. ایضاً، ص:۴۵

۳۲. عتیق اللہ، پروفیسر، تاریخیت و نو تاریخیت (مضمون)، مشمولہ :ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، مرتبہ: ندیم احمد، ڈاکٹر، بھارت آفسیٹ، دہلی، ص:۴۵۲

۳۳. عتیق اللہ، پروفیسر، تاریخیت و نو تاریخیت (مضمون)، مشمولہ :ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، مرتبہ: ندیم احمد، ڈاکٹر، ص:۴۵۳

۳۴. ایڈور سعید، شرق شناسی، مترجمہ محمد عباس، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص:۲۹

۳۵. عتیق اللہ، پروفیسر، تاریخیت و نو تاریخیت (مضمون) مشمولہ :ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، مرتبہ: ندیم احمد، ڈاکٹر، ص:۴۵۶

۳۶. ایضاً، ص:۴۵۶

۳۷. خرم شہزاد، ڈاکٹر، ژاک دریدا کا تحریر اساس فلسفہ، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۲۲ء، ص:۵۹،۵۸

۳۸. عتیق اللہ، پروفیسر، تاریخیت و نو تاریخیت (مضمون)، مشمولہ :ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، مرتبہ: ندیم احمد، ڈاکٹر، ص:۴۶۱

۳۹. ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، جدید اور مابعد جدید تنقید، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۲۱ء، ص:۲۴۵

۴۰. ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، جدید اور مابعد جدید تنقید، ص:۲۴۷

۴۱. ایضاً، ص:۲۴۶

۴۲. ایضاً، ص ۲۶۳

۴۳. وہاب اشرفی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص:۱۳۲

۴۴. وہاب اشرفی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات، ص:۱۳۵

۴۵. ایضاً، ص:۱۳۵

۴۶. نسیم عباس احمر، ڈاکٹر، نو تاریخیت (مرتبہ)، ص:۱۰

۴۷. گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، جدیدیت کے بعد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۳۵

۴۸. گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، جدیدیت کے بعد، ص:۱۲۴

۴۹. ایضاً، ص ۱۲۸،۱۲۷

۵۰. ایضاً، ص ۱۳۶

۵۱. عتیق اللہ، پروفیسر، تعصبات، ایم۔ آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص:۹۱

۵۲. عتیق اللہ، پروفیسر، تعصبات، ص:۹۳

۵۳. ایضاً، ص:۱۰۰

۵۴. ایضاً، ص:۱۰۸

۵۵. ڈان ای۔ وین، نو تاریخیت، مترجمہ فرحت احساس، مشمولہ: نو تاریخیت، مرتبہ: نسیم عباس احمر، ڈاکٹر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۴۹

۵۶. ڈان ای۔ وین، نو تاریخیت، مترجمہ فرحت احساس، مشمولہ: نو تاریخیت، مرتبہ: نسیم عباس احمر، ڈاکٹر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۵۲

۵۷. ایضاً، ص:۱۶۱

۵۸. ایضاً، ص:۱۶۵

۵۹. الطاف انجم، ڈاکٹر، اردو میں مابعد جدید تنقید (اطلاقی مثالیں، مسائل و ممکنات)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء، ص:۲۵۷

۶۰. الطاف انجم،ڈاکٹر، اردو میں مابعد جدید تنقید (اطلاقی مثالیں، مسائل و ممکنات)، ص:۲۵۷

۶۱. ایضاً، ص: ۲۷۲،۲۷۳

۶۲. ایضاً، ص:۲۶۳

۶۳. ایضاً، ص:۲۷۱

۶۴. قاسم یعقوب، ڈاکٹر، لفظ اور تنقیدِ معنی، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص: ۱۲۴،۱۲۳

۶۵. قاسم یعقوب، ڈاکٹر، لفظ اور تنقیدِ معنی، ص:۱۲۸

۶۶. ایضاً، ص:۱۲۹،۱۲۸

۶۷. حنا جمشید، شازیہ عنبرین، ادب اور ثقافت اور نو تاریخیت: ایک مطالعہ، (مضمون) مطبوعہ: الماس، شمارہ: ۲۳، ۲۰۲۰، شعبہ اُردو، شاہ عبد الطیف یونیورسٹی، خیر پور، ص:۱۶۹،۱۶۸

۶۸. حنا جمشید، شازیہ عنبرین، ادب اور ثقافت اور نو تاریخیت: ایک مطالعہ، (مضمون) مطبوعہ: الماس، شمارہ: ۲۳، ۲۰۲۰، شعبہ اُردو، شاہ عبد الطیف یونیورسٹی، خیر پور، ص:۱۷۴

۶۹. سید ازور عباس، مظاہر شاہ: ڈاکٹر، تاریخ، تاریخیت اور نو تاریخیت: بنیادی تعقلات، (مضمون) مطبوعہ: اردو، شمارہ: ۲، جلد ۹۷، ۲۰۲۲ء، انجمن ترقیِ اُردو، پاکستان، کراچی، ص:۱۴۷

۷۰. ایضاً، ص:۱۵۵

۷۱. ایضاً، ص:۱۵۸

۷۲. عبد العزیز ملک، ڈاکٹر، معاصر تنقیدی رجحانات، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۲ء، ص:۱۵۳

۷۳. عبد العزیز ملک، ڈاکٹر، معاصر تنقیدی رجحانات، ص:۱۵۱

۷۴. اورنگ زیب قاسمی، ادبی تھیوری: بنیادی تصورات اور مباحث ورلڈ ویو پبلشرز، لاہور، ص:۱۲۶

۷۵. اورنگ زیب قاسمی، ادبی تھیوری: بنیادی تصورات اور مباحث، ص:۱۲۵

76. Lois Tyson ,critical theory today :A user friendly Guide ,Routledge ,New York,2006 A.D,P:291

۷۷. اورنگ زیب قاسمی، ادبی تھیوری: بنیادی تصورات اور مباحث، ص:۱۲۱

۷۸. ایضاً، ص۱۲۳

۷۹. سید ازور عباس ،اُردُو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث ،مقالہ برائے ایم ۔فل اردو (غیر مطبوعہ)، مملوکہ، شعبۂ اُردُو، اوری اینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص:۴۰

۸۰. سید ازور عباس ،اُردُو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث ،مقالہ برائے ایم ۔فل اردو (غیر مطبوعہ)، مملوکہ، شعبۂ اُردُو، اوری اینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص:۸۷،۸۸

باب چہارم:

اُردو تنقید اور نو تاریخیت: اطلاقی مباحث

الف: اُردُو تنقید میں نو تاریخیت کے اطلاقی مباحث کا آغاز اور روایت

تنقید، فلسفۂ ادب ہے، جس طرح جمالیات، فلسفۂ حُسن ہے۔ تنقید، بطور ایک فن کے، علم کی باضابطہ اور منظم صورت سے عبارت ہے۔ تنظیم اور انضباط سے داخلی اور اساسی معانی مراد ہیں، اسے علمی زبان میں تنقید کی وجودیات (Ontology) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے، جو تنقید کو، تاثر سے الگ کرتا ہے۔ تاثر کا براہِ راست تعلق جذبے سے ہے، اسی لیے تاثر میں ایک نوع کا فوری پن پایا جاتا ہے۔ جب ایک قاری کسی تخلیق یا فن پارے کا مُطالعہ کرتا ہے تو سب سے پہلے اس فن پارے کے متعلق جو بکھان سامنے آتا ہے، وہ تاثر ہے۔ تاثر کو ہم ابتدائی حسی یا اعصابی جواب بھی کہہ سکتے ہیں، جو فوری، لمحاتی اور ذاتی پسند یا ناپسند کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ تنقید اس سے مختلف متنوع کارگزاری ہے، جس کا میلان جذبے کے برعکس، تعقل کی سمت زیادہ ہے۔ یہی عنصر تنقید کو ایک علم کا درجہ عطا کرتا ہے اور اسے فلسفیانہ کارگزاری میں بدل دیتا ہے۔ فلسفہ، کیوں کہ وجوہ کی تلاش کرتا ہے۔ اس طرح تنقید بھی تخلیق یا فن پارے میں اُن وجوہات اور علتوں کی تلاش کے درپے ہے، جو راستے تخلیق بناتی ہے۔ یوں ایک خالص تنقیدی مُطالعہ، تعقل اور انہماک کا متقاضی ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ تنقید کی ترقی یافتہ مباحث کا غالب میلان ان اصولوں کی کھوج پر مرکوز ہے، جو خالص علمی اور تجزیاتی بنیادوں کے حامل ہوں۔ تنقید ان اصولوں کو دریافت کرتی اور اسے فن پاروں پر اطلاق کرتی ہے۔

تنقیدی عمل، اصولوں کی دریافت اور اُن اصولوں کے فن پارے پر اطلاق کے باوصف، "دو" مستقل شعبوں میں منقسم ہے۔ ایک تنقیدی کا" نرم مرکزہ" (Soft-Core) ہے، اسے نظریاتی یا نظری تنقید سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب کہ دوسرا" ثابت مرکزہ" (Hard-Core) ، جسے" عملی یا اطلاقی تنقید" (Applied

(Criticism) کہا جاتا ہے۔ تنقید کا نظری پہلو بلاواسطہ فلسفہ سے منسلک ہے۔ اس شعبے کا تعلق ان نظریات، اصولوں اور رسمیات سے ہے، جو ادب کی افہام و تفہیم میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہاں اس نکتے کی طرف متوجہ کرنا ضروری ہے کہ تنقید کی نظری جہت کا غالب رجحان کسب و اکتساب کی جانب رہا ہے۔ نظری تنقید: فلسفے، سماجیات، معاشیات، نفسیات، جیسے علوم سے استفادہ کر کے اصول وضع کرتی رہی ہے، جنہیں ادب پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ تاہم تنقید کے نظری رُخ کا ایک اور اہم تفاعل قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ نظری تنقید بذاتِ خود نظریہ ساز بھی ہے۔ یہ ادب کی تفہیم کی بابت ایسے نظریات اور طریقہ ہائے کار اخذ کرتی ہے، جو تفہیم و تعبیر میں بہتری اور سہولت فراہم کریں۔ یوں بھی کوئی عملی مطالعہ اس وقت تک کارگر ثابت نہیں ہو سکتا، جب تک وہ کسی مضبوط نظری اساس پر قائم نہ ہو۔

تنقید کا دوسرا شعبہ، "اطلاقی یا عملی تنقید" کہلاتا ہے۔ نظری تنقید جو نظریات، اصول اور طریقہ ہائے کار وضع کرتی ہے، اُن کے تناظر میں فن پارے کا مطالعہ یا اُن اصولوں کا فن پارے پر اطلاق عملی تنقید کے ذیل میں آتا ہے۔ عملی تنقید، نظری تنقید کے بغیر بے اساس ہے، اسی طرح نظری تنقید عملی تنقید کے بغیر محض تصوراتی کھیل شمار کی جائے گی۔ تنقید کا وہی مکتب کام یاب شمار کیا جائے گا، جو نظری اور عملی ہر دو پہلوؤں میں فعال ہو۔ بعض روایت پسند ناقدین نظری اور عملی تنقید میں فرق کے قائل نہیں۔ اُن کے لیے عرض ہے کہ اِن میں فرق ہے، لیکن یہ باہم مرتبط اور جڑے ہوئے شعبے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ بالکل ایک دوجے سے کٹے ہوئے اور غیر مربوط ہیں۔ کہ گویا خلا میں معلق ہیں۔ بل کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں شعبوں میں فرق کرنا ضروری بھی ہے اور کارآمد بھی، جیسا کہ "ڈیوڈ ڈائچس" (David Daiches) نے لکھا ہے: "تنقیدی نظریات اور عملی تنقید میں امتیاز ہے تو بڑی حد تک مصنوعی، لیکن اس میں تفریق بالعموم کارآمد ثابت ہوتی ہے۔"[1] نظری اور عملی تنقید میں امتیاز کو مصنوعی کہنے کی وجہ سے ان دونوں کے مابین داخلی ربط اور انسلاک کی اہمیت و ضرورت کو اجاگر کرنا ہے۔ اگر ان دونوں میں باہمی ربط کی کمی ہو گی، یا نظری تنقید میں تشکیل دیے

گئے۔ اصولوں کو عملی تنقید کے ذریعے متن سے دریافت نہیں کیا جاسکے گا، تو یہ تنقید کے اُس دبستان اور نقاد ، ہر دو کی کم زوری سمجھی جائے گی۔ اس ذیل میں ڈاکٹر سید محمد عقیل رقم طراز ہیں:

"تنقید کا عملی پہلو تو ہی ہے کہ کہنے والے کے سلسلہ خیال اور فکر و نظر کی بازگشت خواہ کسی بھی مکتب خیال سے وابستہ ہو کر وجود میں آئی ہو، پڑھنے اور سننے والے ہر گزر رہی ہو۔ اس سے سننے والا کماحقہ واقف ہو جائے۔ پھر کہنے والے کے انداز سے اس متعارف ہو سکے کہ اس کے تمام فنی اور ادبی گھماؤ، ایچ پیچ تک اس کی نظر اس طرح پہنچتی جائے کہ وہ اس مخصوص رنگ و آہنگ کی تفہیم میں کوئی دقت محسوس نہ کرے، لیکن عام طور پر شاعر یا ادیب کے فکر و فن کے مختلف انداز اور پیکروں سے بحث کرنے کے بجائے اُردو میں عملی طور پر زیادہ تر مطلب نگاری ہی کو عملی تنقید کا درجہ دیا گیا ہے۔" (۲)

اصلاً عملی تنقید کے ساتھ دقت یہی رہی ہے کہ ناقدین کی طرف سے نظری تنقید میں تشکیل دیے گئے اصولوں کو عملی طور پر یا تو اطلاق نہیں کیا جا سکا یا جزوی طور پر اطلاق کیا گیا۔ اس کی کئی وجوہات میں سے ایک معاصر نقاد کی ناپختگی اور ترقی یافتہ تنقیدی مباحث سے لاعلمی ہے۔ مغرب میں تھیوری اور ادبی تھیوری کی مباحث کا خاص چلن ہے۔ تاہم ہمارے ہاں ہر علمی امر کو "درآمد شدہ" (Imported) کا طعنہ دے کر رد کر دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی تنقیدی نظریہ مکمل طور پر اپنا اظہار وجود کرے، نقد کے اصولوں کی وضاحت کرے، اسے ارتداد اور انکار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ معاصر تنقید ایک باضابطہ علمی کارگزاری ہونے کے باوصف تھیوری کی منظم اور مربوط مباحث سے اور اس کے اکادمیاتی افادات سے ہرگز انکار نہیں کر سکتی۔ اُردو میں جدید ادبی تھیوری کے تحت جتنے اچھے، معتبر اور مربوط مُطالعات سامنے آئے ہیں، وہ اس سے پہلے کی تنقیدی روایت میں نظر نہیں آتے۔ تھیوری مخالف ناقدین خصوصاً "ساختیات" (Structuralism) کے متعلق اکثر یہ بیان دیتے ہوئے نظر آتے

ہیں کہ اگر ساختیات واقعتاً ادبی مطالعہ کرنے کی سکت رکھتی تو اُردُو میں اس کے عملی مطالعات کی قلت کیوں ہے؟ اس کے جواب میں عرض ہے:" ساختیات کے نظریے، عمل اور اس کے افادات میں کوئی شک نہیں۔ اُردو میں جن ناقدین نے اس ذیل میں سعی کی ہے، وہ معتبر نام ہیں اور انہوں نے اس حوالے سے بہت کارآمد مطالعات پیش کیے ہیں۔ اب ہر نقاد میں اتنی علمی سکت نہیں کہ وہ اس طرز کے جدید اور باقاعدہ معروضی اور سائنسی مطالعات پیش کر سکے۔ ساختیاتی مطالعات کی ایک پوری وقیع روایت، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کی ادبی میراث کا حصہ ہے۔ اب یہ اردو نقاد کی اَجانی ہے کہ وہ اس طرز کے کثیر مطالعات کرنے سے قاصر ہے۔"یوں سوال تھیوری کے طرزِ مطالعہ پر نہیں، بل کہ خود ہماری کم علمی پر اٹھتا ہے۔ مزید یہ کہ تھیوری مخالف زیادہ تر ناقدین خود اپنی تحریروں میں کسی نا کسی طرح "جدید تھیوری" یا "قدیم تھیوری" سے ہی استفادہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ، لکھتے ہیں:

"جو لوگ تھیوری کو ناپسند کرتے ہیں یا اس کے بغیر بہتر طور پر کام چلا لینے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ کسی پرانی تھیوری کی جکڑ میں رہتے ہیں۔۔۔ کسی قسم کی تھیوری کے بغیر خواہ وہ مبہم اور مضمر ہی کیوں نہ ہو۔ ہم یہ جان نہیں سکتے کہ ایک ادب پارہ ہوتا کیا ہے اور اسے ہم کیسے پڑھیں۔ تھیوری کی عداوت کا عام طور پر مطلب دوسرے لوگوں کی تھیوریوں کی مخالفت اور اپنی تھیوریوں کی فراموش گاری ہوتا ہے۔ اُردو میں تھیوری کی مخالفت اُن لوگوں نے خاص طور پر کی، جنہیں اپنی تھیوری پر شدت سے اصرار ہے، مگر اُسے وہ تھیوری کا نام نہیں دینا چاہتے"۔(۳)

تاثر اور تنقید میں فرق کر کے دیکھیں تو ناصر عباس نیرّ کے اس بیان میں خاصی حقیقت ہے۔ تھیوری مخالف ناقدین جس بھی طرزِ مطالعہ کا سہارا لیں، کیا اس کی بنیاد کسی علم یا کلامیے (Discourse) پر استوار نہیں

ہوتی؟ اگر ایسا ہے تو تھیوری مخالفت کی ساری عمارت ہی گر جاتی ہے۔ اور انکار کا جواز خود دم توڑ جاتا ہے۔ اب یہ علم قدیم یا جدید ہو سکتا ہے، تاہم وہ تنقیدی مطالعہ تھیوری ہی کی ذیل میں آتا ہے۔ لہٰذا "نفسیاتی، تاریخی، ہیئتی، سماجی، عمرانی" طرز ہائے مطالعہ، تھیوری کی ہی قدیم اشکال ہیں، جب کہ "ساختیات، پسِ ساختیات، تانیثیت، مابعد نو آبادیات، ماحولیات اور نو تاریخیت" کا تعلق، جدید تھیوری کی مباحث سے ہے۔

اس مقام پر یہ دیکھ لینا سود مند ہو گا کہ تھیوری یا ادبی تھیوری کام کیسے کرتی ہے؟ وہ متن کے مطالعے میں کس چیز کی خواہش مند ہے؟ اِن سوالوں کی وضاحت سے ہمارے لیے اس باب میں نو تاریخی تھیوری کے تحت سامنے آنے والے اطلاقی مطالعات کی تعینِ قدر میں آسانی ہو گی۔ کیوں کہ نو تاریخیت کی مباحث جدید ادبی تھیوری کے ضمن میں آتی ہیں۔ لہٰذا اگر ہم پر تھیوری کا تصور واضح ہو جائے تو اطلاقی مطالعات کی نوعیت بھی واضح ہو جائے گی۔ (مزید یہ کہ نو تاریخیت کے تصور کی وضاحت ہم سابقہ ابواب میں کر چکے ہیں۔) تھیوری کیا ہے؟ اس ضمن میں ناقدین نے کئی تعریفیں کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اس موضوع کی تکثیریت کے سبب اسے ایک تعریف میں مقید کرنا آسان نہیں۔ قاضی افضال حسین، نے اس کی سب سے جامع تعریف پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "تھیوری تصورات کا وہ نظامِ کلام ہے، جو اپنے موضوع کی ماہیت / طرزِ وجود سے بحث کرتا ہے۔"[۴] اس تعریف کے تناظر میں تھیوری کا بنیادی سوال متن ہے۔ ایک ادبی متن کا تشکیلی نظام کیا ہے؟ اس بنیادی سوال سے ادبی تھیوری کا سروکار رہتا ہے۔ لہٰذا اس بنیادی تصور کے تحت ادبی تھیوری ایک ثقافتی یا ادبی متن سے متعلق چند سوال اٹھاتی ہے:

- ایک ادبی متن میں معنی کیسے تشکیل پاتا ہے؟
- ادبی متن کی اصل واصول کیا ہے؟
- متن، قاری اور مصنف کی مثلث میں کیا رشتہ ہے؟
- متن کے تشکیلی عناصر کون سے ہیں؟

- متن جس مواد (تاریخ، کلچر، زبان) سے تشکیل پایا ہے۔ اس کی کیا حقیقت ہے، ان میں آپسی ربط کی کیا نوعیت ہے اور یہ متن میں معنی کے اظہار پر کن کن طریقوں سے اثر انداز ہوتے ہیں؟

لہٰذا تھیوری ان سوالوں اور ان جیسے دیگر سوالوں کے تناظر میں ادبی اور ثقافتی متون کی بالائی اور زیریں تہوں کا مطالعہ کرتی ہے اور تشکیلِ معنی کی وضاحت کرتی ہے۔ تھیوری کا یہی وصف اور عمل اسے دیگر عمومی نوعیت کے مطالعات سے الگ کرتا ہے۔ ناصر عباس نیّر، تھیوری کے اسی انحراف پسند وصف کی وضاحت کرتے ہوئے، جو تھیوری کے طرزِ وجود پر بھی روشنی ڈالتا ہے، لکھتے ہیں:

> "تھیوری کو آزاد اور انحراف پسند مطالعاتی اور یہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے، جو کسی ثقافتی مظہر یا متن کی تفہیم و تعبیر کے لیے کسی بھی علم (Discipline) سے اس کا حربہ یا استدلال مستعار لے سکتا ہے یا خود ایک نیا حربہ وضع کر سکتا ہے۔ اس لیے تھیوری (Inter-Disciplinary) ہے۔ چناں چہ تھیوری کے زیرِ اثر علوم، متون، ثقافتی مظاہر، سماجی طبقات وغیرہ کی ہم رشتگی پر زور دیا گیا ہے اور ان کو الگ تھلگ وحدت سمجھے جانے کے خیال پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ بنا بریں تھیوری کے زیرِ اثر مختلف عناصر ایک دوسرے کے قریب آئے اور ان کی فوقیتی ترتیب (Hierarchy) تہ و بالا ہو جاتی ہے، بندہ و آقا، برہمن و اچھوت، مرد و عورت، اعلیٰ و ادنیٰ کی روایتی ثنویت باقی نہیں رہتی۔ رشتوں کا ایک نیا نظام قائم ہوتا ہے۔ جو اپنے قطعی اور مطلق ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔ تھیوری حصار قائم نہیں کرتی۔ راہوں کو کھلا رکھتی ہے۔ یوں تکثیریت کے لیے چشم براہ رہتی ہے۔" (۵)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ تھیوری کا طرزِ عمل تکثیریت پسند رویوں سے تشکیل پاتا ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں اور خاص کر اکیسویں صدی میں ادبی انتقاد میں پیراڈائم شفٹ دیکھنے میں آئی ہے۔

تنقید نے کسی ایک مظہر کی وضاحت کے لیے متنوع علوم کی حکمت عملیوں سے استفادہ کرنے کی طرح ڈالی ہے۔ اسے علمی زبان میں " بین العلومی" (Inter Disciplinary) اور" کثیر علومی" (Trans-Disciplinary) طریقہ کار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایک علم کے مشمولات، مباحث اور طریقہ سے استفادہ کر کے دوسرے علوم کے معاملات کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس طرز نے سائنسی اور انسانی علوم کو ایک دوسرے کے قریب کیا ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس میں تھیوری کے جس فوقیتی ترتیب کو تہ و بالا (Subvert) کرنے کا ذکر ہوا، وہ خاصے کی چیز ہے۔ نو تاریخی مطالعہ بھی اس طرزِ سے خصوصی طور پر استفادہ کرتا ہے۔ لہٰذا ہم آئندہ آنے والی اطلاقی مباحث میں دیکھیں گے کہ مختلف ناقدین مثلاً: "شمس الرحمان فاروقی، قاضی عابد" وغیرہ کس طرح مروجہ حقائق کو اور تاریخی و مستند سمجھی جانی والی تعبیرات کو نو تاریخی منہاج کے ذریعے تہ و بالا کرتے ہیں اور عمومی تنقید سے ہٹ کر نتائج اخذ کرتے ہیں۔ نو تاریخی مطالعہ بھی کیوں کہ تھیوری کے ذیل میں ہونے والی مباحث سے ہم رشتہ ہے، اس لیے وہ تاریخ اور ادبی متن کو باہم منسلک سمجھتا ہے۔ یہ انسلاک بھی، تاریخیت کے یک رخے انسلاک سے مختلف ہے اور دوہرا بھی۔ نو تاریخیت کا ماننا ہے کہ جس طرح تاریخ ایک ادبی متن کی تشکیل پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے، اسی طرح ادب بھی تاریخ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لہٰذا نو تاریخی مطالعہ، تاریخیت کے یک زمانی منہاج کے برعکس دوزمانی ہے۔

جدید رجحانات اور تاریخی مطالعات کے تناظر میں ،نو تاریخی اطلاقی تنقید کو، کچھ اس طرح دیکھا جاسکتا ہے۔ کہ انیسویں صدی کے اوائل میں: "رومانوی رجحانات" کے تحت یورپ میں آزادی اور بغاوت کا علم بلند کیا گیا تو اُس دور میں تاریخی مطالعے کا رجحان باقاعدہ طور پر تنقیدی ڈسکورس کا حصہ بنا۔ جب "چارلس سینٹ بیو" (Charles Sainte-Beuve) اور "ہیپولائٹ طین"(Hippolyte Taine) نے فن پاروں کی پرکھ میں تاریخ اور تاریخی تفاعل کے کردار پر زور دیا۔ اس کے بعد سیاسی اور ادبی حلقوں میں مارکسی رجحان نے زور پکڑا۔ مارکسیت کے حوالے سے ہم جانتے ہیں کہ وہ معاشی تناظر میں ادب کو تاریخی اور مادی تناظرات کے ذیل میں رکھ

کر دیکھنے کی قائل کی۔ لہٰذا مارکسیت نے تاریخ کی مادی تعبیر پیش کی اور ادب کو بھی اپنا ہم نوا بنایا۔ بعد ازاں، تاریخی تنقید نے بھی مارکسی تناظر کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔ جدیدیت، کی تحریک کے تحت فن پارے کے داخلی اور ہیئتی نظام پر توجہ مرکوز کی گئی تو کئی ناقدین، تاریخی مطالعے کے سامنے آئے۔ بعد ازاں، "گرین بلاٹ" اور دیگر مابعد جدید مفکرین نے نو تاریخی تناظر کو جلا بخشی اور اس تناظر کا رواج ہوا۔ اُردو میں نو تاریخیت کا ظہور انگریز کے تسلط کے سبب سے وقوع پذیر ہوا۔

نو تاریخی مطالعے نے عملی طور پر، تھیوری کے دیگر تناظرات کی طرح، ردِ تشکیل (Deconstruction) کے تنقیدی حربے سے استفادہ کیا۔ ردِ تشکیل کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ متن کے اندر معانی سیال اور متحرک ہوتا ہے، نہ کہ جامد اور ٹھہرا ہوا۔ مزید یہ کہ معنی نا صرف متحرک ہوتا ہے، بل کہ انحراف پسند طبع کا مالک بھی ہوتا ہے۔ اس لیے ایک خاص تاریخی دور میں لکھے گئے متن کی دوسرے زمانے میں متعدد اور نو بہ نو تعبیرات ممکن ہوتی ہیں۔ روایتی تنقیدی تناظر کا ماننا ہے کہ متن میں متعدد معانی ہو سکتے ہیں، جیسے ہم اُردو ادب کی تاریخ میں ایہام گوئی کی ایک عام سی مثال کے ذریعے واضح کر سکتے ہیں کہ شعر کے اندر ایک قریب کا معانی جب کہ دوسرا معانی بعید ہے، جو تعمق اور غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ تاہم روایتی تنقید میں ان تمام معنوں کی موجودگی میں اعتبار اس مطالب کو حاصل ہے، جو منشائے مصنف کے سبب سے زیادہ قریب ہو اور اسی معنی کو اصل اور حتمی مانا جاتا ہے۔ ردِ تشکیلی طریقہ کار اس سے منحرف ہے۔ نو تاریخی مطالعے میں مصنف کے ذہن کے قریب تر معنی کے تاریخی جائزے کے بعد تہ و بالا کیا جاتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا مصنف نے جس مطلب کی ترسیل کی ہے، وہ اس زمانے کے مقتدر طبقات کے مطابق ہے یا مصنف سے اس سے انحراف برتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر، نے مصنف اور قاری کے معنی خیزی کے الگ الگ نظام کی وضاحت سیاق (Context) اور تناظر (Perspectivity) کے حوالے سے کی ہے۔ ان دونوں میں فرق کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"پہلا (سیاق) تحریری ہوتا ہے جب کہ دوسرا (تناظر) غیر تحریری ہوتا اور متن سے باہر ہوتا ہے، یعنی معنی کا وہ جاری عمل ہوتا ہے، جس سے ثقافت، تاریخ، شعریات، روایت وغیرہ وبارت ہوتی ہے اور جس کی طرف متن میں اشارے اور کوڈ موجود ہوتے ہیں۔" (۶)

لہٰذا اسیاق کا تعلق عام طور پر مصنف سے ہوتا ہے، جب کہ تناظر قاری سے متعلق ہے۔ قاری اپنی نظری اور عملی حکمت عملی کے ذریعے مصنف کے سیاق کو نئے تناظر سے آشنا کر سکتا ہے۔ تاہم نوتاریخی مطالعے میں، قاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ متن کی زمانی وضعیت کا خیال رکھے۔ یہ زمانی حالت کئی طریقوں سے وجود میں آتی ہے۔ ایک یہ کہ یہ زمانی حالت مصنف متن میں پیش کیے گئے کرداروں یا صورت حال کی مخصوص وضع کے ذریعے دکھانے کی سعی کرتا ہے۔ اس تمام تر عمل میں نقاد یا قاری کے پاس عملی طور پر تنقید کے اطلاقی آلات (Tools) یعنی: "تجزیہ، تشریح اور تعبیر" موجود رہتے ہیں اور وہ ان کی مدد سے ایک متن کا نوتاریخی مطالعہ کرتا اور رد تشکیل کرتا ہے۔

اطلاقی تنقید کی روایت کی جانب رخ کیا جائے تو اُردُو میں، اطلاقی تنقید کی روایت کا جائزہ، ایک مختصر سے باب کے، ذیلی جُز کے، ضمنی موضوع کے طور پر، مفصل احاطہ کی صورت میں ممکن نہیں۔ (مفصل چھوڑ، مختصر احاطہ بھی ممکن نہیں۔) ہاں یہ ضرور ہے کہ اُردُو میں اِس کا رواج اُس وقت سے ہے، جب ۱۹۱۰ء میں "مہدی افادی" نے اس لفظ "تنقید" کو اُردُو میں پہلی بار استعمال کیا تھا۔ یا اُس قبل بھی مختلف صورتوں میں تنقید کے عملی نمونے ملتے ہیں۔ دوسرا اس کی روایت کچھ اس طرح بھی تشکیل پاتی ہے کہ جس جس طرح نظری مَباحث اُردُو میں وراد ہوتے رہے، تو اُن کے تناظر میں، ناقدین نثر و نظم کی تمام اصناف کے اطلاقی مطالعات بھی کرنے لگے۔ (نظری روایت کا انتہائی مختصر خاکہ، مقالہ ہٰذا کے پچھلے باب (سوم) کے تمہیدی حصے میں پیش کیا جاچکا ہے۔) جب سے تنقیدی تھیوری کی مباحث اور اس کے تناظر میں عملی مطالعات کا آغاز ہوا ہے، تو "ساختیات، پسِ ساختیات،

تانیثیت، مابعد نو آبادیات، ماحولیات، نومارکسی اور نو تاریخی" مطالعوں کا رواج دیکھنے میں آیا ہے۔ تنقیدی تھیوری کے عملی مطالعات میں سب سے زیادہ مثالیں" مابعد نو آبادتی " (Post Colonialism)اور "تانیثیت"(Feminism) کے تناظر میں اُردُو میں میسر ہیں۔ عصرِ رواں یا کہہ لیں کہ تھیوری کے وُرُود کے بعد سے، اس ضمن میں جن بڑے ناقدین کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اُن میں: " شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر عتیق اللہ، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر قاضی عابد اور ڈاکٹر محمد نعیم ورک " ، کے نام انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔

اس ضمن میں اُردُو میں نو تاریخی طریق رسائی کے تحت، اطلاقی مُطالعات کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں۔ نو تاریخیت کے تحت کیے جانے والے مطالعات کی مثالیں انگلی پر گنی جا سکتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نو تاریخیت کے عملی مطالعات کی قابلِ اعتنا مثالوں کی تعداد تقریباً آدھے درجن سے زیادہ نہیں۔ (ہاں، نظری مضامین کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ مگر وہ بھی بہت زیادہ نہیں کہ جتنی ہونی چاہیے تھی۔) ادبی تنقیدی تھیوری کی مَباحث کا نظری پہلو اُردو تنقید میں مجموعی طور پر بھی حاوی رہا ہے خاص طور پر معتمد ناقدین کے ہاں۔ تاریخی مطالعات کے ضمن میں، سب سے پہلے ہم "نو تاریخیت" کی بجائے "تاریخیت" کے تناظر میں، عملی مطالعات کے آغاز کا جائزہ لیں تو، اس حوالے سے "ڈاکٹر اسلم سراج الدین" اور "ڈاکٹر ناہید قمر" نے پہلے پہل باقاعدہ کُتب تحریر کیں۔ ڈاکٹر اسلم سراج الدین، کی کتاب: "تنقید اور تاریخیت"، ۲۰۱۳ء میں چھپ کر سامنے آئی۔ یہ کتاب "مثال پبلشرز، فیصل آباد" کی جانب سے شائع کی گئی اور مجموعی طور پر "چودہ" (۱۴) مضامین پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر ناہید قمر، کی اہم کتاب: "اُردو ادب میں تاریخیت"، "پورب اکادمی، اسلام آباد" سے ۲۰۱۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ایک تفصیلی ابتدائیے اور "گیارہ "(۱۱) مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں اُردو کی متعدد اصناف کو تاریخی حوالوں سے سمجھنے اور جانچنے کی سعی کی گئی ہے۔ اور یہ کتب اُردو میں نو تاریخی مطالعات کی ارتقائی تاریخ کو سمجھنے میں معاون ہے۔

جب کہ **"نویانئی تاریخیت"** کے تناظر میں جو چند "مضامین، کُتب اور مقالات" ملتے ہیں، اُن کی روایت کی اُردُو میں نیو رکھنے کا سہرا: "شمس الرحمٰن فاروقی" کے سر ہے۔ اُردُو میں سب سے پہلا مختصر نوعیت کا مضمون: "شمس الرحمٰن فاروقی" نے رقم کیا، جو کہ اُنہیں کے ایک طویل مضمون کا آخری سے پہلا حصے کا ضمنی حصہ ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کا طویل مضمون بعنوان: "قرأت، تعبیر، تنقید"، ۲۵و۲۶ نومبر ۲۰۰۶ء کو منعقدہ قومی سیمی نار بَنام: "متن کی قرات"، "شعبۂ اُردُو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ"، میں پڑھا گیا۔ اس کا اہتمام بھی: "شعبۂ اُردُو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ" (ہندوستان) نے کیا، جو کہ "آرٹس فیکلٹی لاؤنج" میں منعقد ہوا۔ اس طویل مضمون کا آخری سے پہلا حصہ: "علمیاتی قرأت کی مجبوریاں" کے ذیلی عنوان سے ہے، جس میں ضمنی عنوان: **"بڑے گھر کی بیٹی --- چھوٹا کردار"** سے ہے۔ اس ضمنی عنوان میں "پریم چند" کے افسانے: "بڑے گھر کی بیٹی" کی نو تاریخی پڑھت کی گئی ہے۔ منعقدہ سیمی نار کے بعد اس میں پڑھے گئے تمام مقالات کو: "صغیر افراہیم" نے اِسے "قاضی افضال حسین" کی نگرانی میں "متن کی قرات" کے عنوان سے کتابی صورت میں "شعبۂ اُردُو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ"، سے ۲۰۰۷ء میں شائع کروایا۔ جس کا اہتمام: "پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ" (ہندوستان) نے کیا۔ جسے بعد ازاں "ڈاکٹر نسیم عباس احمر" نے بھی اپنی کتاب: "نو تاریخیت (منتخب اردو مقالات)" میں ۲۰۱۸ء میں شامل کیا۔ یوں اُردو میں نو تاریخیت کا پہلا اطلاقی نمونہ شائع ہوا۔ اس کے بعد اردو میں دوسرا مضمون اس حوالے سے **"پروفیسر بیگ احساس"** کا **"گردشِ رنگِ چمن - نئی تاریخیت کی ایک روشن مثال"** ہے۔ جو ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون بھی مذکورہ بالا "قومی سیمی نار: متن کی قرات" میں پڑھا گیا۔ اور اِسے بھی "صغیر افراہیم" نے ہی ۲۰۰۷ء میں "متن کی قرات" میں "شعبہ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ" (ہندوستان) سے ہی شائع کیا۔ اس مضمون میں اُردُو کی معتمد ناول نگار: "قرۃ العین حیدر" کے ناول "گردشِ رنگِ چمن" کی نو تاریخی پڑھت کی گئی ہے۔ جو کہ ایک لحاظ سے باقاعدہ ایک مضمون (قدرے طویل) کی صورت میں اردو میں پہلی نو تاریخی اطلاقی کاوش کی حیثیت سے بھی ہے۔ اسی تناظر میں تیسرا مضمون: "

ڈاکٹر قاضی عابد"کا"**قصصِ ہند: تاریخیت اور نو تاریخیت**"، کے نام سے ہے۔ جو ۲۰۱۵ء میں " شعبۂ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور" کے شمارہ: "۱۷"، ایشو: ۱، میں اجولائی ۲۰۱۵ء کے شمارے میں ۲۲ جولائی ۲۰۱۵ء کو شائع ہوا۔ مضمون اپنے موضوع، اپنی فکری نہج و اسلوب کے حوالے سے انتہائی اہم ہے۔ اور اس کی اہمیت اس طور بھی ہے کہ یہ ایک ادیب یعنی: " مولانا محمد حسین آزاد" کی لکھی ہوئی، مخصوص عہد و اہم شخصیات کی تاریخ، جس کا نام :"قصصِ ہند" ہے، کا نو تاریخی مطالعہ ہے۔ اس طرح یہ ادب سے ہٹ کر کسی تاریخی دستاویز کے نو تاریخی پہلے مضمون کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ مضمون کے مطالعہ سے یہ افشا ہوتا ہے کہ صاحبِ مقالہ کو نو تاریخیت کی نظری جہات کا واضح ادراک ہے۔ اُردو تنقید میں نو تاریخیت کے اطلاقی مطالعات کے تناظر میں چوتھا مضمون:"**ڈاکٹر نسیم عباس احمر**" کا "**خس وخاشاک زمانے '---نو تاریخی پڑھت**" ہے۔ یہ مضمون انہیں کی ترتیب شدہ کتاب:"نو تاریخیت [منتخب اُردُو مقالات]" میں ہی پہلی بار ۲۰۱۸ء میں "مثال پبلشرز، فیصل آباد" سے شائع ہوا۔ اس کتاب کا خاصہ یہ بھی ہے کہ یہ کتاب اُردُو میں آج تلک نظری و اطلاقی مَباحث پر اکلوتی کتاب ہے۔ مذکورہ مضمون نو تاریخی مطالعہ کی ایک اچھی کاوش ہے۔ جس میں اُردُو کے خواص وعام میں معروف ناول نگار:" مستنصر حسین تارڑ" کے انتہائی اہم ناول :"خس وخاشاک زمانے" کا نو تاریخی مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ مطالعہ ایک اچھی پڑھت کا نمونہ ہے، مگر "ڈاکٹر نسیم عباس احمر" جیسے نقاد کے رتبے کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ (ویسے تو مقالہ ہٰذا کو رقم کرنے کا عمل قریباً ۳۰ جنوری ۲۰۲۳ء کو مکمل ہوا۔ مگر اس میں زیرِ تحقیق مواد کو شامل کرنے کی تلاش کا عمل "خاکہ"(Synopsis) کی صورت میں ۲۰۲۰ء کے اواخر میں کیا جا چکا تھا۔ جس کے "خاکہ"(Synopsis) کی منظوری جامعہ ہٰذا (نمل، اسلام آباد) کے "دی بورڈ آف ہائیر اسٹڈیز اینڈ ریسرچ " (BASR) کی مجلس میں ۲ جون ۲۰۲۱ء کو دی گئی، جس کا اطلاع و اجازت نامہ ۷ جولائی ۲۰۲۱ء کو جاری ہوا۔ یوں اس تحقیق میں بیش تر زیر تحقیق مواد ۲۰۲۰ء یا اس سے قبل کا ہے۔ البتہ چند ایک تحاریر کو مقالہ رقم کرنے کے عرصے کے دوران نگرانِ مقالہ ہٰذا (ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ) کی پابستہ اجازت سے شامل کیا گیا۔ اُس کی ایک مثال اس روایت کا اگلا مضمون

ہے۔)اگلا مضمون جو کہ نو تاریخیت کے اطلاقی تناظر میں پانچواں مضمون ہے،وہ "ڈاکٹر حنا جمشید "کا ہے۔**"ڈاکٹر حنا جمشید"** کا یہ مضمون بعنوان:**"عبد اللہ حسین کا نو تاریخی شعور: تخصیصی مطالعہ نادار لوگ"** ہے،جو "۲۰۲۲ءمیں " اورینٹل کالج میگزین، جلد:۹۷،شمارہ: ۴، مسلسل شمارہ:۳۶۶"میں شائع ہوا۔ عبد اللہ حسین ،کے ناول :"نادار لوگ " کے تناظر میں حنا جمشید کا یہ نو تاریخی مطالعہ اہمیت کا حامل ہے۔

مضامین،کے علاوہ اُردُو تنقید میں،نو تاریخیت کی اطلاقی روایت میں،چند ایک " تحقیقی سندی مقالات " بھی شامل ہیں۔ جن کی تعداد تا حال " تین "(۳) ہیں۔(چوتھا ایک تو اس دورانیے ،یعنی مقالہ ہٰذا کے خاکہ کی منظوری کے بعد کا ہے۔ دوسرا اُس تک ہر ممکن کوشش کے باوجود بھی رسائی نہ ہو سکی۔اس کا تفصیلی ذکر باب اول میں **"مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق** " میں ہے۔)اِس تناظر میں پہلا مقالہ **"سید ازور عباس"**کا ہے۔ جس کا عنوان **"اُردُو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مَباحث "**ہے۔ یہ مقالہ " پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران " کی نگرانی میں ۲۰۱۸ء میں "ایم۔فل:اُردُو" کی سند کے حصول کی غرض "شعبۂ اُردُو،اوری اینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور" سے رقم کیا گیا۔ اردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے تناظر میں یہ اولین مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔(اس مقالہ کا مفصل تعارف پچھلے باب میں کرایا جا چکا ہے۔)دوسرا مقالہ **"سمعیہ شکور"**کا **"زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت ("تتلیاں ڈھونڈنے والی "اور "رقص بسمل ہے "کے حوالے سے)"**،کے عنوان سے ہے۔یہ مقالہ بھی سندی تحقیقی کاوش ہے،جو ۲۰۱۹ء میں "ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان" کی نگرانی اور "ڈاکٹر نازیہ یونس "کی شریک نگرانی میں "شعبۂ اُردُو زبان و ادب ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد"سے رقم کیا گیا۔ نو تاریخیت کے تناظر میں مقالہ خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ تیسرا مقالہ **"عائشہ واجد "** کا **"اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت"**،کے عنوان سے ہے۔یہ مقالہ بھی سندی تحقیقی کاوش ہے،جو ۲۰۲۰ءمیں "پروفیسر ڈاکٹر رخشندہ مراد "کی نگرانی میں "شعبۂ اُردُو زبان و ادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد"سے رقم کیا گیا۔یہ مقالہ کسی حد تک نو تاریخیت کے تناظر میں اہمیت کا حامل ہے۔ اِن مضامین اور مقالہ جات کے علاوہ اردو تنقید میں

نو تاریخیت کی اس روایت میں اکلوتی "مرتبہ کتاب" بھی نظر آتی ہے۔ یہ کتاب: **"ڈاکٹر نسیم عباس احمر" کی "نو تاریخیت [منتخب اردو مقالات]"** کے نام سے ترتیب دی ہوئی ہے۔ جو ۲۰۱۸ء میں "مثال پبلشرز، فیصل آباد" سے شائع ہوئی۔ یہ مرتبہ کتاب نو تاریخیت کے "دس"(۱۰) نظری اور "چار"(۴) اطلاقی یعنی کل "چودہ"(۱۴) مضامین پر مشتمل ہے۔ (جب کہ کتاب کی فہرست میں مضامین کے نمبر شمار غلط درج ہیں۔ جس کے مطابق مضامین کی تعداد "تیرہ"(۱۳) بنتی ہے۔) اس کتاب میں شامل تمام مضامین، مقالہ ہذا میں زیرِ تحقیق لائے جا چکے ہیں یا مزید اطلاقی، باب ہٰذا میں لائے جائیں گے۔ اس لیے اس کتاب کا الگ سے تجزیہ پیش نہیں کیا جائے گا۔ ہاں ایک مضمون جو صرف اسی کتاب میں موجود ہے جس کا عنوان "خس و خاشاک زمانے'---نو تاریخی پڑھت" ہے۔ وہ ظاہر ہے کہ اس باب کا حصہ بنایا جائے گا۔ اُردو میں نو تاریخیت کے عملی مطالعات کے ذیل میں :"شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر بیگ احساس، ڈاکٹر قاضی عابد اور ڈاکٹر نسیم عباس احمر" کے نام اہم ہیں۔ ذیل میں ہم اُردُو میں نو تاریخی تناظر کے تحت سامنے آنے والے ان مضامین کا اور مقالہ جات کا جائزہ لیں گے۔ جس میں ہمارے مطالعے کی نوعیت نقد الانتقادی ہو گی۔ (نظریاتی تنقید کے تحت اطلاق کئے گئے تنقیدی اصولوں کا محاکمہ نقد الانتقادی تنقید کے ذیل میں آتا ہے۔)

ب۔ اُردو تنقید میں نو تاریخیت کے اطلاقی مباحث:

ذیل میں اُردو تنقید میں نو تاریخیت کے اطلاقی مُطالعات کے جن مضامین و مقالات کے مشمولات کا نقد الانتقادی جائزہ لیا جائے گا، اُن کی فہرست یہ ہے:

مضامین:

۱۔ **بڑے گھر کی بیٹی---چھوٹا کردار،** شمس الرحمٰن فاروقی، ۲۰۰۷ء

۲۔ **گردشِ رنگِ چمن---نئی تاریخیت کی ایک روشن مثال،** پروفیسر بیگ احساس، ۲۰۰۷ء

۳۔ **قصصِ ہند': تاریخیت اور نو تاریخیت**،ڈاکٹر قاضی عابد،۲۰۱۵ء

۴۔ **"خس و خاشاک زمانے"---نو تاریخی پڑھت**،ڈاکٹر نسیم عباس احمر،۲۰۱۸ء

۵۔ **عبد اللہ حسین کا نو تاریخی شعور: تخصیصی مطالعہ نادار لوگ**،ڈاکٹر حنا جمشید،۲۰۲۲ء

مقالہ جات:

ا۔ **اُردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مَباحث**،سید ازور عباس،۲۰۱۸ء

۲۔ **زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت ("تتلیاں ڈھونڈنے والی" اور "رقصِ بسمل ہے" کے حوالے سے)**، سمعیہ شکور،۲۰۱۹ء

۳۔ **اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت**،عائشہ واجد،۲۰۲۰ء

اُردو تنقید میں **"نو تاریخیت"** کا پہلا انتہائی مختصر اطلاقی مضمون: **"شمس الرحمن فاروقی"** نے ۲۰۰۷ء میں لکھا ہے۔ انہوں نے اپنے طویل مضمون: **"قرات، تعبیر، تنقید"** کے آخری سے پہلے، ذیلی عنوان، کے ضمنی حصہ میں **"پریم چند"** کے افسانے **"بڑے گھر کی بیٹی"** کا نو تاریخی مطالعہ کیا ہے۔ جس کا عنوان انہوں نے **"بڑے گھر کی بیٹی ---چھوٹا کردار"** دیا ہے۔ اس مضمون کی بعثت کی وجہ "قومی سیمی نار برائے: **متن کی قرأت**" بنا۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کا طویل مضمون بعنوان:" قرأت، تعبیر، تنقید"،۲۵ و ۲۶ نومبر ۲۰۰۶ء کو منعقدہ قومی سیمی نار بَنام:" متن کی قرات"، "شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ"، میں پڑھا گیا۔ اس کا اہتمام بھی:"شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ "(ہندوستان) نے کیا، جو کہ " آرٹس فیکلٹی لاؤنج" میں منعقد ہوا۔ اس طویل مضمون کا آخری سے پہلا حصہ: "علمیاتی قرأت کی مجبوریاں" کے ذیلی عنوان سے ہے، جس میں ضمنی عنوان: **"بڑے گھر کی بیٹی--- چھوٹا کردار"** سے ہے۔اس ضمنی عنوان میں "پریم چند" کے افسانے:"بڑے گھر کی بیٹی" کی نو تاریخی پڑھت کی گئی ہے۔ منعقدہ سیمی نار کے بعد اس میں پڑھے گئے تمام مقالات کو: "صغیر افراہیم"

نے اِسے "قاضی افضال حسین" کی نگرانی میں "متن کی قرات" کے عنوان سے کتابی صورت میں "شعبۂ اُردُو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ "، سے ۲۰۰۷ء میں شائع کروایا۔ جس کا اہتمام: "پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ "(ہندوستان) نے کیا۔ جسے بعد ازاں "ڈاکٹر نسیم عباس احمر" نے بھی اپنی کتاب: "نو تاریخیت (منتخب اردو مقالات)" میں ۲۰۱۸ء میں شامل کیا۔ یوں اُردُو میں نو تاریخیت کا پہلا اطلاقی نمونہ شائع ہوا۔ شمس الرحمن فاروقی، کا مذکورہ مکمل مضمون خاصہ طویل اور جدید تنقیدی مباحث کا مرقع ہے۔ (کتاب میں شامل تقریباً تمام مضامین اُردُو میں عملی تنقید کی عمدہ مثالوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔ اس کتاب میں جدید تنقیدی تھیوری کے ذیل میں آنے والے قاری اساس مناہج کا اُردُو کے متنوع ادبی فن پاروں پر اطلاق کیا گیا ہے۔ مرتبین کا ماننا ہے کہ جدید ادبی تنقید کا تقریباً ہر دبستان کا قاری اساس ہے۔ لہذا ایک قاری یا نقاد قدیم و جدید ادبی متون کو قرأت کے مختلف طریقہ ھائے کار کی کسوٹی پر پرکھ کر مختلف نتائج بر آمد کر سکتا ہے۔) فاروقی کا مضمون کیونکہ طویل ہے، اس لیے مضمون کے سرسری جائزے کے بعد ہم اصل مدعا کی طرف آئیں گے۔ مضمون کے آخر میں صرف پانچ صفحات کے اندر فاروقی نے پریم چند کے افسانے "بڑے گھر کی بیٹی" کو نو تاریخی تناظر میں پرکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر نسیم عباس احمر کی مرتبہ کتاب "نو تاریخیت" کے اطلاقی حصے میں فاروقی کے مذکورہ مضمون کے یہی چار صفحات شاملِ متن ہیں۔

مضمون کے آغاز میں فاروقی نے ادبی متن میں معانی کی تکثیریت (Polarity) کی تصریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ فن پارے میں معانی صرف وہ نہیں جو پہلی قرأت میں ہماری سمجھ میں آئے ہیں۔ انہوں نے "رشید احمد صدیقی" اور "رومن اوسیپووچ یاکیبسن" (Roman Osipovich Jakobson) کی مثالوں سے اس امر کو ثابت بھی کیا ہے۔ قرأت، نظریۂ قرأت اور تنقیدی قرأت کے ذیل میں فاروقی نے خالص وجودیاتی (Ontological) نوعیت کے سوال اٹھائے ہیں۔ فن پارہ یا متن کسے کہتے ہیں؟ فن پارے کے اچھا یا بُرا ہونے کا معیار کیا ہے؟ قرأت سے کیا مراد ہے؟ قاری کون ہوتا ہے؟ خود معنی (Meaning) کیا ہے؟ اِن سوالوں کو قائم

کر کے انہوں نے تنقید اور تعبیر کی وجودیات اور علمیات کی طرف بحث کا رُخ موڑ دیا ہے۔ اصولی طور پر یہ تمام سوال تنقید و تعبیر کے وجودیاتی اور علمیاتی تفاعل کی ہی وضاحت کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:"ادبی / وجودیاتی اقوال کا سروکار فن پارے کے فنی پہلوؤں کی طرف ہوتا ہے اور ان اقوال سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ فن پارے کے ان معنی کا محیط ہوتا ہے۔ جن تک ہم فنی تجزیے کی روشنی میں پہنچ سکتے ہیں۔ اور علمیاتی اقوال کا سروکار فن پارے کے فلسفیانہ، سماجی اور عقلی پہلوؤں سے ہوتا ہے۔"(۷) فن پارے کے وجودیاتی اور علمیاتی تناظرات سے وہ قرأت کے مختلف طریقوں کے اثبات کے مسئلے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یوں انہوں نے قرات، تعبیر، تنقید کی حدود، مجبوریوں اور امکانات پر تفصیلی مباحث کی ہیں۔ مضمون کا اولین حصہ زیادہ تر نظری مباحث کا حامل ہے، آخری سے پہلے حصے میں پریم چند کے افسانے کا نو تاریخی مطالعہ کیا گیا ہے۔

پریم چند کے افسانے "بڑے گھر کی بیٹی" کا خلاصہ کچھ ایسے ہے۔ ٹھاکر، جو اس افسانے کا فعال کردار ہے، اس کی بیوی کا نام آنندی ہے۔ آنندی ہی مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ٹھاکر، آنندی کو ایک بڑے گھر سے بیاہ کر لایا ہے۔ آنندی اور اس کے دیور میں ناچاکی ہوتی ہے تو آنندی ٹھاکر سے دیور کے غیر مناسب رویے کی شکایت کرتی ہے۔ شوہر کئی مرتبہ اس معاملے کو نظر انداز کرتا ہے۔ بات بڑھتی جاتی ہے اور ایک دن بھابھی اور دیور میں سخت تلخ کلامی تک، جا پہنچتی ہے۔ اس پر ردعمل دیتے ہوئے ٹھاکر بیوی پر ہاتھ اٹھاتا ہے، جب کہ اپنے بھائی (آنندی کے دیور) کو کچھ نہیں کہتا۔ اس واقع کے بعد چھوٹا بھائی ٹھاکر کی ناراضی سے بچنے کی غرض سے گھر چھوڑنے کا ارادہ کرتا ہے تو آنندی دونوں میں ثالثی کا کردار ادا کر کے صلح کروا دیتی ہے۔ ٹھاکر کیوں کہ گاؤں کا طاقت ور اور صاحبِ اقتدار ہے، اس لیے لوگ ٹوہ میں ہوتے ہیں کہ بات کرنے کا کوئی موقع ہاتھ آئے۔ تاہم آنندی اپنی صلاحیت سے اس معاملے کو کالعدم کر دیتی ہے۔ یوں پورے گاؤں میں بڑے گھر کی بیٹی آنندی کے چرچے ہوتے ہیں کہ وہ بگڑے ہوئے امور کو سدھار لیتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، نے اس کہانی میں عورت کے تصور اور مقتدر طبقے پر سوال قایم کیے ہیں اور اس کی ردِ تشکیل کے لیے نو تاریخی تناظر سے استفادہ کیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی، کے بقول امریکی محاورے میں نو تاریخیت کے نام سے مشہور مکتبِ فکر کو برطانیہ میں "ثقافتی مادہ پرستی"(Cultural Materialism) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ نام اسے "ریمنڈ ہنری ولیمز" نے دیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، جسے "ثقافتی مادہ پرستی" کہتا ہے، جدید اُردو تنقید میں اسے "ثقافتی مادیت" کے عنوان سے بھی شناخت کیا جاتا ہے۔ مضمون نگار نے مشہور و معروف تنقیدی تناظر "تانیثیت" سے اعراض کرتے ہوئے عورت کے سماجی تصور کو ثقافتی مادی پرستی کے طریقہ کار سے اخذ کرنے کی سعی کی ہے۔ فاروقی، کا یہ عمل بجائے خود اس امر کی تصدیق ہے کہ ایک متن کئی طرح کی پڑھتوں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ افسانے کے متن اور مرکزی خیال سے واضح ہے کہ اس کی تانیثی قرأت باآسانی ہو سکتی ہے۔ تاہم فاروقی متن کی مناسبت سے نو تاریخی قرأت کو آزماتا ہے۔ نئی تاریخیت اُس کے نزدیک ایک فن پارے میں دو نکات پر توجہ مرکوز کرتی ہے:

> "نئی تاریخیت کے نکتے صرف دو ہیں: اول یہ کہ کسی فن پارے کا مصنف اپنے زمانے کے اقتدار طبقے کے خلاف کوئی مؤقف اختیار کرتا نظر آتا ہے کہ نہیں؟ یعنی کیا مصنف اپنے زمانے کی سرمایہ دار اور غیر انقلاب پسند طاقتوں کی رایوں کا محکوم تھا یا اپنی رائے بھی رکھتا تھا؟ اور دوسرا یہ کہ کیا مصنف نے یہ رویہ شعوری طور پر اختیار کیا ہے، یا مصنف کے ارادے بغیر یہ رویہ اس کے فن پارے میں جھلکتا ہے؟ لہذا نئی تاریخیت کسی فن پارے کو اپنے زمانے کا پابند لیکن جدید تصورات کا حامل قرار دینا چاہتی ہے۔"(۸)

ان دو نکات کو تاریخی تناظر کا حاصل الحصول سمجھتے ہوئے، شمس الرحمٰن فاروقی، نے پریم چند کے مذکورہ افسانے کی پڑھت کی ہے۔ بحث کا آغاز افسانے میں اقتداری رشتوں کے اثبات سے کرتے ہوئے اُن کا کہنا ہے کہ مرد اور عورت کے اقتداری رشتوں کے علاوہ بھی کئی اور طرح کے اقتداری رشتے متن میں موجود ہیں۔ عورت اور مرد میں فوقیتی ترجیح کا تصور واضح ہے۔ افسانوی متن میں عورت کی تشکیل اس طرز پر کی گئی ہے کہ وہ سسرال میں

دب کر رہے، محکوم بن کر رہے، طعن و تعریض سہتی رہے، دیور کی مار کھائے، بد سلوکی برداشت کرتی رہے اور اس پر مستزاد یہ ہے اُسے اِس ساری صورت حال پر آزردہ خاطر اور رنجیدہ ہونے کا حق بھی حاصل نہیں۔ مرد حاکم اور مقتدر دکھایا گیا ہے۔ یہ ہندوستانی مرد اور ہندوستانی عورت کا حقیقت پسندانہ تصور ہے، جو ہماری روزمرہ کی زندگیوں اور سماج کی عمومی روش کے عین مطابق ہے۔ عورت کے اس تحمل اور برداشت کے عوض افسانہ نگار اُسے بڑے گھر کی بیٹی کے اعزاز سے نوازتا ہے۔ بڑے گھر کی بیٹی، کہنے میں اعلیٰ سنسکاروں، اچھی تربیت اور ارفع اخلاقی فضیلت کا مفہوم پوشیدہ ہے اور عام طور پر ہمارے سماج میں یہی کچھ سمجھا جاتا ہے۔ فاروقی نے نو تاریخی مطالعے کے پہلے اصول کے تحت پریم چند کے آنندی کے متعلق اس بیانیے کو چیلنج کیا ہے کہ بڑے گھر کی بیٹی ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ ہمیشہ دبی رہے؟ مار کھاتی رہے اور سب کچھ جھیل کر چپ رہے؟ چناں چہ پریم چند مرد کی برتری کے مقتدر بیانیے کو چیلنج نہیں کرتے، بل کہ بین اسطور اُس کی تائید کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر پریم چند کا مقصد حقیقت پسندی کے تحت معاشرے کی صاف شفاف عکاسی ہو، تب بھی یہ افسانہ نو تاریخی تناظر کے پہلے اصول کی زد پر قرار پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شمس الرحمن فاروقی، آنندی جو کہ بڑے گھر کی بیٹی قرار دی گئی، کو چھوٹا کردار بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "چھوٹا کردار کہنے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ پریم چند نے اسے (آنندی) چھوٹی طبیعت یا قابلِ اعتراض طعینت کا حامل دکھایا ہے۔ "چھوٹا کردار" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ افسانہ نگار کی نظر میں گھر کے اندر عموماً اور سسرال میں یقیناً عورت کا مرتبہ یہی ہے کہ وہ چھوٹی بن کر رہے۔ بڑے گھر کی بیٹی کی برائی اس میں ہے کہ وہ دب کر رہے۔ افسانہ نگار، یا اس کا کوئی دوسرا کردا، ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی کہ بنیا ہوئیں، تو ایسا کیوں ہے؟ ممکن ہے کہ افسانہ نگار کی نظر میں یہ ایک کائناتی حقیقت ہو کر بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں یا انھیں ایسی ہی ہونا چاہیے، جیسی کہ وہ اس کے افسانے میں نظر آتی ہے۔

یا ممکن ہے افسانہ نگار کا خیال کچھ اور ہو۔ لیکن اُس نے بڑے گھر کی بیٹی کا متذ کرہ بالا روپ یہ سمجھ کر پیش کیا ہو کہ میرے قاری اسی روپ کو پسند کریں گے۔"(۹)

مذکورہ بالا اقتباس نے نو تاریخی مطالعے کے دوسرے اصول پر بھی روشنی ڈال دی ہے کہ یہ بات واضح کی ہے کہ، آیا مصنف نے شعوری طور پر عورت کا مذکورہ کردار افسانے میں پیش کیا ہے یا غیر شعوری طور پر! افسانوی متن اور تمام کردار اس حوالے سے چپ ہیں۔ تاہم عورت کے مذکورہ روپ پر کسی قسم کے بیان سے گریز افسانہ نگار کو اس اقتداری ڈھانچے کی تائید کرنے والوں کی صف میں ضرور شمار کراتا ہے۔ عرض، افسانے کو نو تاریخی تناظر میں دیکھنے کے بعد آخر میں فاروقی نے تین نتائج اخذ کیے ہیں۔ اولاً، اس افسانے کی قرأت سے یہ سمجھ آتا ہے کہ پیداواری رشتوں اور بالخصوص دولت کی بنیاد پر قائم سوسائٹی میں سب سے کم تر طبقہ اُسے شمار کیا جاتا ہے جو دولت اور اشیاء کی پیداواری میں باقاعدہ شریک نہیں ہوتا۔ آنندی، کیونکہ، باقاعدہ دولت کی پیداواری اور افزائش میں شامل نہیں، اس لیے اُس کے ساتھ ناانصافی اور بدسلوکی کا رویہ اپنایا گیا۔ دوسرا یہ کہ ایسا نظام جس میں وراثتی جائیداد، ذاتی مالکیت اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی بنیاد پر سماج کی تشکیل و تعمیر کی گئی ہو، اس میں عام طور پر ناانصافی اور غیر مساوات کا رویہ غالب رہتا ہے۔ آنندی اس افسانے کے تناظر میں اس کی ایک جزوی مثال ہے۔ اگر اس مطلب کو ہم اپنے سماج پر پھیلائیں تو ہمارے سماج کی یہی صورت نکھر کر سامنے آئے گی۔ تیسرا مطلب بھی آنندی اور جس طبقے سے اس کا تعلق ہے، سے منسلک ہے۔ فاروقی مقتدرہ طبقے کی اس روش کی وضاحت کرتے ہیں کہ وہ محکوم طبقے کو یہ باور کراتے ہیں کہ اُن کی بھلائی محکومیت اور دب کر رہنے میں ہے۔ لہٰذا آنندی داخلی طور پر یہ باور کر چکی ہے کہ وہ محکوم ہے اور دب کر رہنا ہی کارِ خیر ہے۔ یہ حکمت عملی نو آبادیاتی دور میں استعمار نے بھی استعمال کی ہے۔ استعمار، نے نو آبادی کو یہ باور کرایا کہ اُن کی ترقی محکوم رہنے میں ہی مضمر ہے۔ لہٰذا کئی لوگ آج بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ جتنی ترقی نو آبادیاتی دور میں ہوئی وہ آزادی کے بعد نہ ہو سکی۔ یہ طبقے آزادی کی قیمت پر ترقی قبولنے کو تیار ہے اور ان کی اس یقین کے سیاق میں استعماری حکمت عملی اور فعالیت پوشیدہ ہے۔

انہوں نے نو آبادی کے مقامی افراد کی باقاعدہ ذہنی تربیت کی اور اپنی حاکمیت کو باقاعدہ نفسیاتی، مذہبی اور ذہنی جواز فراہم کر کے قبول کروایا۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کا مذکورہ مضمون، اگرچہ مختصر ہے، لیکن نو تاریخی تناظر کے تحت پریم چند کے افسانے کا کامیاب مُطالعہ ہے۔ انہوں نے نو تاریخیت کے اطلاقی اصولوں سے استفادہ کر کے سادہ انداز میں پریم چند کے افسانے میں ابھرنے والے ثقافتی رشتوں کی وضاحت کی ہے۔ فاروقی کے اس طرزِ مطالعہ کی، بعد میں آنے والے ناقدین نے پیروی بھی کی۔

"پروفیسر بیگ احساس "کا مضمون:**"گردشِ رنگِ چمن--- نئی تاریخیت کی ایک روشن مثال"**، نو تاریخی تناظر میں کیے گئے عملی مطالعات کے ذیل میں دوسرا اہم مضمون ہے۔ یہ مضمون شمس الرحمٰن فاروقی، کے مضمون کے بعد تحریر کیا گیا اور بنیادی طور پر شمس الرحمٰن فاروقی کی ہی عملی طرز سے استفادہ کرتا ہے۔ پہلی دفعہ یہ مضمون بھی " قاضی افضال حسین " کی نگرانی میں " صغیر افراہیم " کی مرتبہ کتاب:" متن کی قرات "(۲۰۰۷ء) میں شائع ہوا۔ پروفیسر بیگ احساس کا یہ مضمون شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون سے قدرے طویل ہے اور انتہائی سادہ اور عام فہم زبان میں لکھا گیا ہے۔

مضمون کا آغاز مقالہ نگار نے شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے سے کیا ہے جس میں انہوں نے نو تاریخیت کے دو اہم نکات کا تذکرہ کیا ہے، جسے ہم پہلے تحریر کر چکے ہیں۔ فاروقی کی رائے کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ آیا مصنف یا تخلیق کار اپنے عہدے کے مقتدر اور اتھارٹی سمجھے جانے والے طبقے کے خلاف اپنی کوئی منفرد اور آزاد رائے رکھتا ہے یا نہیں۔ دوسرا یہ کہ آیا وہ یہ عمل شعوری طور پر سرانجام دے رہا ہے یا غیر شعوری طور پر۔ پروفیسر بیگ احساس، نے مذکورہ بیان کو رقم کرتے ہوئے؛ " گردشِ رنگِ چمن " میں پہلے نکتے کی تصدیق کی ہے۔ یعنی جس کے مطابق قرۃ العین حیدر اپنے اس ناول میں مقتدر طبقے کے خلاف اپنی آزاد رائے رکھتی ہیں۔ دوسرے نکتے کے حوالے سے وہ کسی تصدیق یا اثبات کی منزل تک نہیں پہنچتے۔ اِسے وہ خود بھی کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ:" گردشِ رنگِ چمن '، مندرجہ بالا نکات پر پورا اترتا ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ مصنفہ نے یہ رویہ شعوری طور پر اختیار کیا یا

غیر شعوری طور پر اپنایا۔"شاید دوسرے نکتے کی کھوج کسی حد تک دقیق عمل ہے۔ اور ہمارے ناقدین مشکل مراحل سے گزرنے سے کنارہ کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کا فکشن فن، "تاریخ اور علوم" کا ایک مایاجال ہے۔ وہ تاریخ سے استفادہ ضرور کرتی ہیں، مگر یہ تحقیقی تاریخ مکمل طور پر تخلیقی عمل میں ڈھل کر کے اُن کے فکشن کا حصہ بنتی ہے۔ اس لیے ہم کوشش کر کے بھی ناول اور تاریخ کو جدا جدا نہیں کر سکتے۔ اردو اور عالمی ادب میں (خاص کر ناول میں) تاریخ سے استفادے کا رواج عام ہے۔ تاریخی ناولوں کی پوری ایک بڑی صف ناول کی تاریخ کا حصہ ہے۔ تاہم قرۃ العین حیدر، تاریخ سے سادہ اور سپاٹ یا اکہرا استفادہ نہیں کرتیں، بل کہ اپنے موضوع اور فکریات کی مناسبت سے اِسے بدل دیتی ہیں۔ یہی عمل ان کے مذکورہ ناول 'گردشِ رنگِ چمن' میں بھی دیکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عمومی تاریخ کے مقابل ایک "متبادل تاریخی بیانیہ" (Historical Narrative Coonter) تشکیل دیتی ہیں۔ یہ تشکیل بجائے خود ناول نگار اور ناول کے فنی اور فکری امکانات کی ایک نئی جست سے موسوم ہے۔

اس ناول میں سب سے پہلے قرۃ العین حیدر نے جس تصور کی ردِ تشکیل کی ہے، وہ لکھنوی سوسائٹی کا تصور ہے۔ نو آبادیاتی دور میں لکھنوی معاشرے اور اس کے افراد کو کاہل اور سست رو ثابت کرنے پر زور دیا گیا۔ تاریخیں اور کتب لکھوا کر، اور مغرب سے مرعوب ایک طبقے کی تشکیل سے یہ کام باقاعدہ سرکاری سرپرستی میں ہوا۔ "ہومی خارشد جی بھابھا، المعروف بہ :ہومی کے بھابھا" (Homi Kharshedji Bhabha)،نے اپنے مشہور کتاب"The Location of Culture" میں نو آبادیاتی عہد میں پائے جانے والے تین طبقات کا ذکر کیاہے۔ ایک طبقہ مرعوبیت(Abundance) کا شکار ہے۔ یہ مغرب کی چکاچوند اور ظاہری ترقی دیکھ کر کے مرعوب ہو جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں سامنے آنے والے اردو کے تقریباً سارے ناول نگار اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے نو آباد کار کے نصابی اصولوں کے مطابق اُن کی خواہش کی تکمیل میں باقاعدہ ناول لکھے، اصلاح پسندی کی خود ساختہ تحریک ایجاد کی اور حاکمِ وقت سے انعام و کرام کے مستحق ٹھہرے۔ انہوں نے اپنے

معاشرے کی درست عکاسی کی بجائے استعماری عینک سے دیکھا اور یوں استعمار کے مددگار ٹھہرے۔ ڈاکٹر محمد نعیم ،نے اردو ناول اور ناول نگاروں کی اس نئی جست کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ناول نگاروں نے بدلتے حالات میں ایسے تمام رویوں کو جو ما قبل استعماری دور میں ایک اسلوب حیات کا درجہ اختیار کر چکے تھے، رگیدنا شروع کر دیا۔ شاعری اور حقہ ہندوستاتی زندگی کی پہچان ہونے کے باوصف ہاری ہوئی زندگی کا نقش ٹھہرے۔ شاعری کو کاہلوں کا مشغلہ قرار دیا گیا۔ سرستار نے "فسانہ آزاد" میں لکھنوی زندگی کو اپنے تمام پیار کے باوجود بے جا آرائش کا نمونہ قرار دیا ہے جس میں نزاکت کی بھرمار ہے۔ لکھنو کے خوش پوشاک بدنی سے زیادہ لباسی پاکیزگی کے قائل ہیں۔ اس کے علاوہ مردوں کی حالت عورتوں سے بدتر ہے: کانوں میں بالیاں، لباس خواتین والے، رنگین، ریشمی غرض کہیں سے مرد نہیں لگتے۔ اس پر ہر وقت بے کاری کے لیے تیار، کبھی گانا سننے بیٹھ گئے تو کبھی وہاں ناچ دیکھنے اور کچھ نہ ہوا تو ضلع جگت کی مشق سرِراہ بیٹھے بہم پہنچا رہے ہیں۔ جب کہ ان کے مقابلے میں یورپین اپنا تمام وقت مفید کاموں میں صرف کر رہے ہیں۔"(۱۰)

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں بھی کچھ اسی طرح کی کیفیت کا سامنا رہتا ہے۔ ان ناولوں کو پڑھنے سے تاریخ کا جو رُخ ہمارے سامنے آتا ہے، قرۃ العین حیدر متبادل تاریخی بیانیے کی تخلیقی عمل سے دربار اور لکھنوی زندگی کے سادہ واقعات میں ایک روشنی بھر دی ہے۔ لہذا پروفیسر بیگ احساس نے ناول کے اس پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے: "وہ کہتی ہیں ایسی ثقہ، پُر تکلف، آزاد خیال سوسائٹی کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ غدر نے پورے معاشرے کو نیست و نابعد کر دیا۔ وہ پیرس کو پورپ کا لکھنو کہتی ہیں جس میں اتنی جاذبیت تھی کہ فرات ہے تو وہ گومتی سین اور ٹمیز ہے تو وہ گومتی۔ چھوٹی سی ندی نیل کا حکم رکھتی تھی۔ گومتی ان ساری ندیوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ جو مختلف تہذیبوں کی علامت ہیں۔ فرانسیسی، انگریز، پورپین سب نوابوں کے تمدن میں مدغم۔

مثلاً دوپلے اور نپولیلین کی بوٹ شیپ والی ہیٹ کو گومتی میں غوطہ دیا گیا تو وہ بصورت کشتی نما لکھنوی ٹوپی نمودار ہوئی۔[11] پروفیسر بیگ احساس، نے ناول کے متن سے مجرے والیوں کی تہذیبی اخلاقیات کی مثالیں درج کر کے انہیں مختلف زبانوں، علوم وفنون میں ماہر ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزوں اور مقامی نواب زادیوں کی شادیوں کے واقعات بھی ناول سے درج کیے ہیں۔ ان واقعات کی ناول میں پیش کش نے ایک مخلوط تہذیب اور سیکولر ہندوستانی سوسائٹی کی بڑی واضح تصور پر پیش کی ہے۔ ایک طرف نو آبادیاتی مرعوبیت اور حکمت عملیوں سے لکھے گئے ناول اور تاریخیں جو ہندوستانی اور نوابی زندگی کو ہر طرح سے معیوب اور قابلِ نفرین گردانتے ہیں اور دوسری طرف سوسائٹی کا یہ تصور۔ قرۃ العین حیدر نے بڑی تخلیقی مہارت سے نو آبادکار کے تشکیل دیے گئے اقتداری بیانیے کو رد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناول نو تاریخی مطالعے کے لیے ہر حوالے سے بہترین ہے۔

پروفیسر احساس بیگ، نے ناول میں پیش کیے گئے طوائف کا ذکر خصوصی طور پر کیا ہے۔ اقتداری بیانیے کے تحت لکھے گئے ناولوں میں طوائف ایک منفی اور محض جنسی مخلوق کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاح پسندی کے تحت لکھے گئے ناولوں میں طوائفوں کو ایک کم ترین اور اخلاقی حوالوں سے کمزور مخلوق دکھایا ہے۔ قاری سرفراز حسین، کے ناول خاص طور پر طوائف کی ایسی ہی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس قرۃالعین حیدر نے، طوائفوں کو تہذیب کا منبع اور مخلوط سوسائٹی کی سب سے عمدہ مثال کے طور، تصویر کشی پیش کی ہے۔ناول کی اس جہت کے حوالے سے پروفیسر احساس بیگ رقم طراز ہیں:

> "کیسے کیسے اہل کمال اس زمانے میں موجود تھے۔ یہ بات مشہور ہے کہ روسا اپنے لڑکوں کو آداب وتہذیب سیکھنے اعلیٰ درجے کے بالاخانوں میں بھیجتے ہیں۔ ان کا ایک کردار پوچھتا ہے ایسا کیوں ہے؟ کیا انگلستان میں لارڈ لوگ اپنی اولاد کو تھیٹر میں ناچنے والیوں کے ہاں تربیت کے لیے بھیجتے ہیں؟ اس کا یہ جواب ہے کہ ہماری مائیں بہنیں ایسی ایجوکیٹیڈ نہیں ہیں کہ خود اپنے لڑکوں کی تربیت کر سکیں۔ وہ

چندابائی کے بارے میں لکھتی ہیں جس کو مہ بقالقب دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں ایک مجرے کے ایک ہزار لیتی تھیں۔ مہاراجہ چند اول کے دربار میں اسے کرسی ملتی تھی۔ آصف جاہ ثانی کے پیچھے پیچھے اپنے ہاتھی پر میدانِ جنگ جاتی تھیں۔ یکتائے روزگار، نیزہ باز، تیر انداز، شہ سوار، علم دوست اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ جس کا دیوان انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے۔ ماہ لقالاکھوں روپے چھوڑ کر مریں۔۔۔ بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی ماہ لقا چندابائی کی زمین پر تعمیر ہوئی"۔ (۱۲)

یوں قرۃ العین حیدر نے عمومی تاریخی بیانیے کو جگہ جگہ متبادل بیانیے سے، رد تشکیل کے عمل سے گزارا ہے۔ اسی طرح ناول نے پردے اور تصویر کشی کے مسئلے پر بھی اجتہادی رائے کا اظہار کیا اور اس کے اثبات کے لیے قدیم مسلم تاریخ اور کتب سے مثالیں دی ہیں۔ ناول کے اسی وصف کی تعریف میں احساس بیگ نے لکھا ہے کہ 'قرۃ العین حیدر' کے بعد کئی لوگوں نے تاریخ کو فکشنائز کرنے کی کوشش کی لیکن کبھی تاریخ پیچھے رہ گئی اور کبھی فکشن۔ ایسا فکشن تخلیق کرنا صرف اور صرف قرۃ العین حیدر کا فن ہے۔ احساس بیگ نے مضمون میں بڑے اعلیٰ انداز میں سادگی اور روانی کے ساتھ نو تاریخی تناظر کو ناول کے متن پر اطلاق کر کے دیکھایا ہے۔ یوں نئی تاریخیت تاریخ کے جس حاوی بیانیے کے رد تشکیل کی متمنی ہے۔ اُس کا مکمل اظہار ہوا ہے اور ادب و تاریخ مساوی درجوں پر اشتراک کرتے ہوئے نظر آئے ہیں۔

اس مضمون کا مزید جائزہ لیا جائے تو اس حوالے سے "گردشِ رنگِ چمن --- نئی تاریخیت کی ایک روشن مثال"، پروفیسر بیگ احساس، کا نو تاریخیت کے تناظر میں ایک انتہائی اہم اطلاقی مضمون ہے۔ جیسا کہ قرۃ العین حیدر اُردو ناول کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہیں، ویسے ہی ان کے ناول کا یہ تنقیدی مطالعہ بھی اپنی مثال آپ ہے کہ اُردو ناول کا نو تاریخیت کے تناظر میں ایسی مثال کم ہی ملتی ہے ۔ جیسے احساس بیگ نے نو تاریخیت کے ضمن میں

پڑھت کی ایک کوشش کی ہے۔ اس کا ایک انتہائی اہم وصف یہ ہے کہ: اپنے مضمون کا آغاز ہی احساس بیگ "شمس الرحمن فاروقی" کی نئی تاریخیت سے متعلق رائے سے کرتے ہیں۔(جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔) جس کے تناظر میں وہ کہتے ہیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے میں نو تاریخیت کے بنیادی اساسی پہلو صرف دو ہیں۔ اول: کہ مصنف اپنے مقتدر طبقے کے خلاف کوئی رکھتا ہے یا نہیں؟ یعنی مصنف کو اپنی اشرافیہ اور مقتدر طبقے سے کسی قسم کا کوئی اختلاف ہے یا نہیں؟ اور آیا اس نے اپنے مضمون میں اس اختلاف کو بیان کیا ہے یا نہیں؟ دوسرا: نو تاریخیت کا پہلو یہ ہے کہ آیا اس نے یہ رائے یا یہ اختلاف خود اختیار کیا ہے؟ مکمل شعوری طور پر اختیار کیا ہے؟ یا غیر یا لاشعوری کیا ہے؟ مصنف گردشِ رنگِ چمن اور شمس الرحمٰن فاروقی کی نو تاریخیت سے متعلق اس رائے کے حوالے سے تقابل کرتے ہوئے ناول اور اس کے تناظر میں لکھتے ہیں:

> " قرۃ العین حیدر کا ناول فن کا ایسا مایا جال ہے جس میں قاری کھو جاتا ہے۔ اس ناول میں ایک جہاں معنی چھپا ہوا ہے۔ ایک سطر، ایک ایک لفظ معنی کی کئی سطحیں رکھتا ہے۔۔۔۔۔۔ گردشِ رنگ چمن مندرجہ بالا نکات پر پورا اترتا ہے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ مصنف نے یہ رویہ شعوری طور پر اختیار کیا ہے یا غیر شعوری اپنایا ہے۔"(۱۳)

یعنی قرۃ العین حیدر کا ناول گردشِ رنگِ چمن، نو تاریخیت کے حوالے سے اس امر پر تو پورا اترتا ہے کہ اس میں مقتدر اور اشرافیہ سے اختلاف کیا جا رہا ہے۔ بیگ احساس نے اہم کرداروں کا سہارا لیتے ہوئے نو تاریخی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں ان کا ماننا ہے کہ یہ ہے تو قرۃ العین کا وطیرہ ہے کہ اس کے کردار زیادہ متحرک ہوتے ہیں اور ہمیشہ ان کے ساتھ سانحات واتفاقات ہوتے رہتے ہیں۔ مگر مذکورہ ناول میں شاید نام کی مناسبت ہے کہ اس ناول میں کرداروں میں گردش یعنی تحریک کچھ زیادہ ہی ہے۔ مصنف (پروفیسر بیگ احساس) کرداروں پر مزید توجہ دیئے بغیر نو تاریخی طریق رسائی سے ناول کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس میں وہ یہ

انداز بھی اپناتے ہیں کہ جیسے نو تاریخیت ایک تسلسل کی قائل نہیں بل کہ نو تاریخیت عوامل اور وجوہ پر زور دیتی ہے۔اس طرح اس تجزیے میں بھی عوامل اور وجوہ کا تاریخی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اسلامی حوالے سے جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسلام میں تصویر کشی کی روایت پر گفتگو کرتی ہیں کہ قصص الانبیاء معراج نامہ سب میں آدمؑ تا محمد ﷺ پیغمبروں کی باضابطہ صورت گری موجود ہے۔۔۔۔وہ کہتی ہیں سیرت النبیؐ کو ہر عثمانی سلطان کے عہد میں اسٔریت کیا گیا ہے۔" (۱۴)

یعنی اس طور پر وفیسر بیگ احساس ناول کے تاریخی پہلو سامنے لاتے ہیں۔اس مضمون کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو مضمون اُردُو میں نو تاریخیت کے ابتدائی اطلاقی مطالعات کی ایک بہت بہتر مثال ہے جس میں نہ صرف ہمیں نو تاریخیت کا تجزیہ سامنے آتا ہے بل کہ ہمیں اردو میں نو تاریخیت کا ایک اطلاقی نمونہ بھی ملتا ہے۔ جس سے بعد میں آنے والے ناقدین مدد لے سکتے ہیں۔ہاں مضمون میں ایک کم زوری یہ ہے کہ 'پروفیسر بیگ احساس' نے کسی حد تک زیادہ ہی قرۃ العین حیدر کی تعریف کی ہے جو کہ تنقید رویے کے خلاف دکھائی دیتی ہے، جیسا کہ وہ مضمون کا اختتام بھی اس جملے سے کرتے ہیں کہ ایسا فکشن تخلیق کرنا صرف اور صرف قرۃ العین کا فن ہے۔

"ڈاکٹر قاضی عابد" کا مضمون: **"قصصِ ہند': تاریخیت اور نو تاریخیت"**، بہت اہم حیثیت کا حامل ہے۔ یہ مضمون شش ماہی مجلہ "تحقیق نامہ "(گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور) کے شمارہ: ۱۷ میں ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔ نو تاریخیت کے اطلاقی مطالعات میں ایک جامع اور تفصیلی مقالے کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔اس مقالے میں ڈاکٹر قاضی عابد نے شمس العماء محمد حسین آزاد کی "قصصِ ہند"(۱۹۲۸ء) کا نو تاریخی مطالعہ کیا ہے۔ بنیادی طور پر اس مضمون کے دو حصے ہیں: پہلے حصے میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے نظری مباحث کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ دوسرے حصے: میں قصصِ ہند کا نو تاریخی مطالعہ کیا گیا ہے۔ مضمون نگار نے آغاز میں تاریخ کے تصور کی وضاحت میں اسے "عمل سے گزرا ہوا زمانہ" قرار دیا ہے اور مختلف ادوار میں اس کے متنوع تصورات کی وضاحت کی ہے۔

اس ذیل میں انہوں نے معنی کے کثرت اور تعبیر کے سلسلے میں تناظر کی اہمیت کو باور کرایا ہے۔ انہوں نے تاریخ کے تعبیر کے مسئلے پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ تاریخ، تاریخیت اور نو تاریخیت کی نئی تعبیری مباحث کے حوالے سے انہوں نے "گرین بلاٹ، ریمنڈ ولیمز اور مشل فوکو"، جب کہ اردو کے حوالے سے "ڈاکٹر عتیق اللہ" کے کام کو اہمیت دی ہے۔ اس مقام پر انہوں نے تاریخی اور نو تاریخی مکتبِ فکر کی تفہیم کے لیے عتیق اللہ کے بیانات سے استفادہ کیا ہے اس کے علاوہ انہوں نے "ڈان ای۔ وین" کے مضمون سے بھی استفادہ کیا ہے اس تمام مباحث کو سمیٹے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اوپر کے مباحث سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ محض کوئی گزرا ہوا واقعہ نہیں ہے بلکہ اس کا بیان بھی ہے اور تجزیہ بھی، تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث سے اقدر تعلق نہیں رکھتے جس قدر وہ واقعے کے بیان اور اس سے کہیں زیادہ واقعے کی تعبیر، تجزیے اور اس آئیڈلوجی پر دھیان دیتے ہیں، جس پر واقع کی تشکیل کی گئی تھی گویا واقعہ جنم نہیں لیتا۔ اس کی تشکیل کسی مورخ کے ہاتھوں ہوتی ہے اور اس تشکیل کے پیچھے جو آئیڈلوجی کام کر رہی ہوتی ہے تعبیر اور تجزیہ اسے زیر بحث لاتا ہے اور اس کی تشکیل کا انہدام کر کے ہی اس کے پس منظر میں موجود طاقت کے کھیل کو بے نقاب کر کے ہی اس بیانیے کو سمجھا جا سکتا ہے"۔(۱۵)

اس بیان سے وہ قصصِ ہند کے نو تاریخی مطالعے کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ اُن کی نظر میں قصصِ ہند تاریخ کو زمانی تسلسل میں دیکھنے کے بجائے تاریخ کے چند منتخب ادوار یا کرداروں پر محیط ہے۔ یہ کتاب نصابی ضرورت کے تحت نو آبادیاتی ہندوستان میں تحریر کروائی گئی۔ مولانا آزاد پکے اثنا عشری تھے۔ مزید یہ ہے کہ وہ شعوری طور پر یا غیر شعوری انداز میں استعماری مقاصد کی تکمیل کر رہے تھے۔ آزاد، کے ذہن میں اپنی ثقافت سے محبت کے باوجود Hybridity کا راسخ عقیدہ بھی ابھر رہا تھا۔ اور اسی طرح وہ دو قومی نظریے سے دور ایک خاص وضع کی تاریخ نویسی

کا حصہ نہ تھے۔ انہوں نے اپنی رفتارِ طبع کے تحت "محمود غزنوی، اورنگ زیب، اکبر اعظم، شیواجی، محمد شاہ" اور نسائی کرداروں میں "پدمنی، دیول دیوی اور نور جہاں" کو متن کی تشکیل کے لیے منتخب کیا، قاضی عابد کا کہنا ہے کہ محمود غزنوی کے کردار کی جس صورت کو آزاد نے پیش کیا وہ اس کے پاکستانی تصور کے مطابق نہیں، جس میں اسے بت شکن اور مساوات پسند اور مقدس سورما مانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'محمود غزنوی'، "اشتیاق حسین قریشی" یا "ڈاکٹر صفدر محمود" کی طرح آزاد کا مذہبی ہیرو نہیں ہے۔ [۱۶] اس امر کی وضاحت مضمون نگار نے قصصِ ہند کے متن سے کی ہے۔ اس طرح مضمون نگار نے اکبر اور اورنگ زیب کے حوالے سے بھی پاکستان کے قومی نام نہاد بیانیوں کی تردید قصصِ ہند کے ذریعے سرانجام دی ہے۔ اُن کے الفاظ میں اس بیانیے میں اکبر سیکولر اور ناپسندیدہ کردار جب کہ اورنگ زیب ٹوپیاں سی کر اور کتابت کرکے گزارا کرتا۔ لیکن آزاد کا تصور اس سے مختلف ہے۔ اس لیے ان دونوں بیانیوں کو آزاد نے نظری تاریخ سازی کے انہدام کے عمل سے گزارا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس تفاوت کو واضح کرنے کے لیے قصصِ ہند سے طویل اقتباسات نقل کیے اور اس تصادم کی وضاحت کی ہے۔ محمد شاہ اور نادر شاہ افغانی کے متعلق بھی ہمارے قومی مورخین نے جو قومی بیانیہ تشکیل دیا ہے، قصصِ ہند میں آزاد کے تجزیے نے اس کے مقابل ایک متبادل بیانیہ ترتیب دیا ہے۔ مضمون نگار نے تفصیلِ ہند کے نسائی کرداروں کے حوالے سے کہا ہے کہ نور جہاں، پدمنی اور دیول دیوی کی تشکیل اس طرز پر آزاد نے کی ہے کہ وہ اپنی عصری رومانوی تشکیل سے پیچھا چھڑاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ صاحبِ مضمون نے یہ اعادہ بھی کیا ہے کہ آزاد کی اس بیانیہ تشکیل سے برصغیر کے معاشرے میں پہلی مرتبہ عورت کی عقل، ذہانت، شجاعت و بہادری کو تاریخ میں معروضی حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ لہذا یہی وجہ ہے کہ عورت آزاد کے ہاں ایک فرد کے طور پر سامنے آئی ہے۔ مضمون کے آخر میں قاضی عابد نے لکھا ہے:

"قصصِ ہند اور تاریخ نویسی میں ایک ایسے متبادل بیانیے کا درجہ رکھتی ہے کہ اگر ہم تاریخیت اور نو تاریخیت کے تناظر میں اس کا مطالعہ کریں تو علم اور طاقت کے

تال میل سے لکھی گئی ریاستی تاریخ کے کئی ساختہ بیانیوں کا انہدام ممکن ہے۔"(۱۷)

ڈاکٹر قاضی عابد، کا مذکورہ مضمون نو تاریخیت، تاریخ اور تاریخیت کے تصورات اور اس کے ساتھ ساتھ قصصِ ہند کے عملی مطالعے کے تطابق سے خاصہ اہم ہے۔ بادی النظر میں یہ ثقافتی مادیت کے بنیادی تصور سے استفادہ کرتا ہے اور تاریخ کی تشکیل میں قومی طاقت اساس بیانیوں کی رد تشکیل کرتا ہے اور ان قومی وریاستی بیانیوں کے متقابل ایک متبادل بیانیہ تشکیل دینے کی طرح ڈالتا ہے۔ ہماری قومی تاریخ نویسی کے تناظر میں یہ مقالہ اہم ہے۔ مضمون نگار نے بڑے سہل انداز میں تجزیے کی بھرپور صلاحیت سے استفادہ کرتے ہوئے مباحث کی تشکیل کی ہے۔

"خس خاشاک زمانے'---نو تاریخی پڑھت"، "ڈاکٹر نسیم عباس احمر" کا مضمون ہے۔ جو کہ ان کی اپنی مرتبہ "نو تاریخیت [منتخب اردو مقالات] "میں ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔ مضمون کے ابتدائی حصے میں انہوں نے ادب، تاریخ اور کلچر کے باہمی رشتے کے تناظر میں تنقیدی کارگزاری کو موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے کلچر کے واحدنی ہونے کی نفی کی ہے، اسی طرح تاریخ اور ادب کے واحدنی ہونے کی بھی نفی کی ہے۔ وہ تاریخ کے دوسرے رخ کو سامنے لاتے ہوئے اُن درزوں، وقفوں اور خاموش آوازوں کی نشان دہی کو نو تاریخیت کا مقصد ومنشامانتے ہیں، جنہیں کچل دیا گیا، طاقت کے بے پنا بہاو نے جنہیں سامنے نہ آنے دیا۔ لہذا نو تاریخیت ایک طرح سے تاریخ کی باز آفرینی کا نام ہے۔ نو تاریخی مطالعے کے مختلف طریقوں کو خوب صورتی سے جمع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نو تاریخیت کے مطالعے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ گرین بلاٹ نے دو مختلف متون (ادبی وغیر ادبی) میں کارفرما مشترک تاریخی اور ثقافتی عناصر کی دریافت کا طریقہ اپنایا۔ ریمنڈ ولیمز نے ایک متن میں کلچر کی تین صورتوں (حاوی، باقیاتی اور نوخیز کلچر) کے ذریعے ثقافتی بازیافت کی ہے۔ تیسرا طریقہ جو ناتھن ڈولی اور

ایلن سن فیلڈ نے شیکسپیئر کے ڈراموں کے متنی تجزیے، سیاسی اور تہذیبی متعلقات
کی روشنی میں نظریاتی تفہیم کی صورت کیے ہیں۔" (۱۸)

مضمون کا دوسرا حصہ اُنہیں تصورات کو بنیاد بنا کر، "مستنصر حسین تارڑ" کے ناول، "خس وخاشاک زمانے"، کی نو تاریخی پڑھت کرتا ہے۔ اس ناول میں تین نسلوں کی کہانی بیان کی گئی ہے، جب کہ ناول کا علاقہ (Landscap) "گوجرانوانہ، پنجاب، لاہور، نیویارک اور کنیڈا" ہے۔ پنجاب کی ثقافت ناول میں کھل کر سامنے آئی ہے تارڑ نے اس ناول میں عصری مقامی تاریخ کے بہت سے واقعات کو رد تشکیل کے عمل سے گزارا ہے اور ان کے لیے متبادل بیانیے تشکیل دیے ہیں۔ یعنی تاریخ کے مشہور اور عمومی تصورات کو رد کیا ہے۔ اور ان کے عقب میں اپنے مشاہدے اور تجزیے کو بنیاد بنا کر پنہاں حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ صاحبِ مضمون نے ناول نگار کی اسی کارگزاری کو نو تاریخی مطالعے کے اساس بنا کر ناول کے متن سے مختلف تاریخی واقعات کے متبادل بیانیوں کو پیش کیا ہے اور تجزیے کے عمل سے گزارا ہے۔ ڈاکٹر نسیم عباس احمر، لکھتے ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ کا ناول، خس وخاشاک زمانے، میں بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک تاریخ اور تہذیبی وقوعات کی نئی تفہیم پیش کی ہے اور یہ ناول ادبی متن کے ساتھ ساتھ مذکورہ عہد کا متبادل تاریخی متن بھی ٹھہرتا ہے۔" (۱۹)

اس تناظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مضمون نگار نے پاک وہند کے نو آبادیاتی عہد اور مابعد نو آبادیاتی عہد کے بہت سے تاریخی وقوعات کو ناول کے متن سے متبادل تاریخی بیانیے کی رو سے منکشف کیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کے تناظر میں اُن کا کہنا ہے کہ ناول نگار نے مقامی مسلمانوں یا آبادی کو ہمیشہ درآمد شدہ حکومتوں پر منحصر قرار دیا ہے۔ جب حکم رانی کی باگ دوڑ مسلمانوں کے ہاتھوں آئی تو وہ بھی دراصل درآمد مسلمانوں حکم ران تھے، مقامی نہ تھے۔ ظاہر ہے " مغل، لودھی اور خاندانِ غلاماں" وغیرہ، سب کے سب باہر سے آکر یہاں حکم ران

ہوئے۔لہذا یہ ایک اعتبار سے نو آبادکاری کی ایک نوع ہے۔دیکھا جائے تو ہماری عمومی تاریخ اس طرز کے خیالات کو نہیں مانتی۔ تاہم ناول نگار نے تاریخ کو ایک الگ زاویے سے دیکھا ہے۔ مضمون نگار نے قیام پاکستان کے بعد کی صورت حال کو بھی ناول کے متن کے تناظر میں پرکھا ہے۔کہتے ہیں کہ قائداعظم نے جن جن لوگوں سے ہاتھ ملایا وہ سب کے سب کھوٹے سکے تھے ۔ناول نگار نے ان کھوٹے سکوں کا تقابل مسلم تاریخ سے کیا ہے اور یزید وشمر جیسے حکمرانوں سے ان کی مماثلت کو واضح کیا ہے۔نسیم عباس احمر، کا کہنا ہے:

> "انھوں نے ایک اور تاریخی تعبیر بھی کی ہے کہ برصغیر صرف انگریزوں کی حکمرانی کے دوران متحد کیا گیا تھا،وگرنہ اس کے خمیر میں تو انتشار ہے۔نئی مملکت کے قیام کے فوری بعد مفاد پرستوں کی قبضہ گری اور الاٹمنٹوں کا پول بھی کئی مقامات پر کھولا گیا ہے۔کھوٹے سکوں کا انجام کار،پہلا مارشل لاء جنرل ایوب کی حکومت ٹھہرا۔" (۲۰)

اس کے ۱۹۶۵ء کی جنگ کو اور سقوط ڈھاکہ کو معصوم عوام کو فریب دینے والا قرار دیا گیا ہے۔ جس میں مقامی معصوم افراد مختلف سیاسی طاقتوں کے کہنے پر نام نہاد حبِ وطن کے تحت خالی ہاتھوں لڑائی کے میدان میں اترے۔اس ناول میں تارڑ نے ادب کے علاوہ دیگر تاریخی مصادر سے بھی استفادہ کر کے متبادل تاریخی بیانیہ اخذ کیا ہے۔مثلاًانہوں نے مختلف سپاہیوں کی آپ بیتوں سے استفادہ کیا:

> "اس ناول میں جنرل نیازی کے دستخط کرنے کی کاروائی اور پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کی ذلت کا بیان بھی ملتا ہے۔ اس واقعے کے لیے سپاہی فتح محمد کی آپ بیتی سے مدد لی گئی ہے۔۔۔ کردار انعام اللہ کے ناول "آٹوبائیو گرافی آف اے باسٹرڈ"،سے استفادہ کرتے ہوئے افغان مجاہدین کی روس جنگ میں

شرکت، مجاہدین کی درندگی اور جہادیوں کی آپسی تفرقہ بازی کو شامل ناول کیاہے۔" (۲۱)

۹/۱۱ کے واقعات میں ملک میں جرنیلوں کی عیاشیوں کو بھی ناول کے متن سے صاحبِ مضمون نے متبادل تاریخی حقائق کے طور پر اخذ کیاہے۔ اس لحاظ سے مضمون نگار نے بڑی کاوش سے پورے ناول کے تاریخی بیانیوں کا مطالعہ کیاہے۔ نسیم عباس احمر کا مذکورہ مضمون نو تاریخی عملی مطالعات کے ضمن میں ایک بہت اہم اضافہ ہے۔ ناول کے متن کو گہرائی سے سمجھنے اور اس کی تفہیم کرانے میں کام یاب رہے ہیں۔ نو تاریخیت کے طاقت اساس بیانیے کی رد تشکیل کرنے والے عنصر کو بھی کام یابی سے ناول کے متن پر اطلاق کر کے نتائج پر آمد کیے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر نو تاریخیت کے اطلاقی تناظر میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ مگر شاید ڈاکٹر نسیم عباس احمر، ایسا معتمد نقاد اس تجزیے کو مزید عمدگی سے پیش کر سکتا تھا۔

اِن عملی مطالعات کے تناظر میں آخری مضمون: **"ڈاکٹر حنا جمشید"** کا **"عبداللہ حسین کا نو تاریخی شعور: تخصیصی مطالعہ نادار لوگ"**، ہے۔ جو ۲۰۲۲ء میں "اورینٹل کالج میگزین، جلد:۹۷، شمارہ: ۴، مسلسل شمارہ:۳۶۶"، میں شائع ہوا۔ اس مضمون کو یہاں زیرِ تحقیق لانے کی وجہ اوپر بھی بیان کی جاچکی ہے۔ (ویسے تو مقالہ ہٰذا کو رقم کرنے کا عمل قریباً ۳۰ جنوری ۲۰۲۳ء کو مکمل ہوا۔ مگر اس میں زیرِ تحقیق مواد کو شامل کرنے کی تلاش کا عمل "خاکہ"(Synopsis) کی صورت میں ۲۰۲۰ء کے اواخر میں کیا جا چکا تھا۔ جس کے "خاکہ" (Synopsis) کی منظوری جامعہ ہٰذا (نمل، اسلام آباد) کے "دی بورڈ آف ہائیر اسٹڈیز اینڈ ریسرچ" (BASR) کی مجلس میں ۲ جون ۲۰۲۱ء کو دی گئی، جس کا اطلاع و اجازت نامہ ۷ جولائی ۲۰۲۱ء کو جاری ہوا۔ یوں اس تحقیق میں بیش تر زیرِ تحقیقی مواد ۲۰۲۰ء یا اس سے قبل کا ہے۔ البتہ چند ایک تحاریر کو مقالہ رقم کرنے کے عرصے کے دوران، نگرانِ مقالہ ہٰذا (ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ) کی پابستہ اجازت سے شامل کیا گیا۔ اُس کی ایک مثال ڈاکٹر حنا جمشید کا یہ مضمون ہے۔) اس کے علاوہ حنا جمشید نو تاریخیت کے تناظر میں اپنا "پی ایچ ڈی: اُردُو" کا تحقیقی

مقالہ (بعنوان : پاکستانی ادب اور نو تاریخیت) بھی رقم کر چکی ہیں۔(جس کا تفصیلی ذکر، باب اول میں؛"**مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق** " میں کیا جا چکا ہے۔) ڈاکٹر حنا جمشید کا یہ مضمون مفصل اور مختصر کے درمیان؛" درمیانی سِطری "کا ہے۔ یا کسی حد تک اسے مفصل کہا جا سکتا ہے اگر تمہیدی مَباحث کو بھی مضمون ہی سمجھا جائے تو۔(جب کہ وہ مضمون کے عنوان سے ہٹ کر نظری مَباحث کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس کی طوالت کچھ زیادہ ہی ہے۔) اس مضمون میں "عبداللہ حسین "کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچانے والے ناول "اداس نسلیں " کے کہے جانے والے دوسرے حصے: "نادار لوگ "کا نو تاریخی مُطالعہ کیا گیا ہے۔ 'اداس نسلیں' اور 'نادار لوگ' ویسے الگ الگ ناولوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور شائع بھی الگ الگ ہوئے، پہلے **اداس نسلیں** اور بعد ازاں **نادار لوگ**۔ مگر یہ دونوں ناول ایک ہی سلسلے کی کڑی سمجھے جاتے ہیں۔ حنا جمشید خود کہتی ہیں: "عبداللہ حسین کے ناول **اداس نسلیں** کے یہی لوگ اِن کے دوسرے ناول **نادار لوگ** میں ان کا موضوع بنے۔ "(۲۲) یعنی اس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ عبداللہ حسین نے ایک منظر نامہ 'اداس نسلیں' میں پیش کیا اور پھر اُس کے کرداروں کا احوال 'نادار لوگ' میں پیش کیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ صاحبِ مضمون کا اپنا "ڈاکٹر آف فلاسفی "(پی ایچ ڈی) کا سندی تحقیقی مقالہ کا موضوع 'نو تاریخیت' سے متعلق ہے۔ جس بنا پر کسی حد تک صاحبِ مقالہ (حنا جمشید) کا ایک فکری میلان سا قائم ہوا ہوا ہے اور اس تناظر میں نو تاریخیت کے مَباحث کی طرف جھکاؤ ہے۔ اور ایک لحاظ سے چوں کہ یہ مضمون بھی نو تاریخیت کی ذیل میں ہی ایک اطلاقی مُطالعہ ہے۔ اس بنا پر مُصنفِہ نے اس اطلاقی مضمون کا قریباً آدھا حصہ؛ "نو تاریخیت کے نظری مَباحث، اس کی روایت اور بنیاد گزاروں " کے تعارف پر صَرف کیا ہے۔ جو کہ شاید یہاں بے جا محسوس ہوتا ہے۔ اور خاص کر اس قدر مفصل بیان کیا جانا۔ اور پھر اُس مفصل بیان میں بھی کوئی نیا پہلو سامنے نہیں لائیں۔ بل کہ اُردو تنقید میں نو تاریخیت کی روایت، بنیاد گزاروں اور نظری مَباحث کا جو پہلے سے ذکر ہے، بل کہ ایک جیسی تحاریر کی جو پہلے سے بھرمار ہے اسی (*مَطمحِ نظر*) کو الفاظ بدل کر دوبارہ بیان کر دیا ہے۔ اپنے اس مضمون کا آغاز اِنہیں مَباحث سے کرتی ہیں۔ اور پہلی سطر میں ہی تاریخ، ثقافت اور ادب کے رشتے کو

واضح کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔اور اس تاریخ، ثقافت اور ادب کے رشتے کی وضاحت کے بعد بحث کا تانتا تاریخیت اور نو تاریخیت سے جوڑتی ہیں۔اِسی حوالے سے وہ نو تاریخیت کے تناظر میں ادبی متون کا تعلق واضح کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> " نو تاریخیت کے مَباحث نے ادبی متون کو ثقافتی ظواہر کا نقش ثابت کرنے کے باوجود، تاریخ اور ثقافت کے مابین راست تعلق کے وجود سے گریز کیا۔ در حقیقت نو تاریخیت ادبی متون کی تہ میں ملفوف تاریخی حقائق کی دریافت کا نام ہے۔"(۲۳)

حنا جمشید، بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے، "گرین بلاٹ"، "ریمنڈ ہنری ولیمز" ، "مشل فوکو" اور "اُن کے رفقا" کے کردار پر، نو تاریخیت کے حوالے سے روشنی ڈالتی ہیں۔ تاریخیت اور نو تاریخیت اور اس کے بنیاد گزاروں سے متعلق حنا جمشید کے اس مضمون میں بیان کردہ نقطۂ نظر کو پھر سے تفصیلی اس لیے بیان نہیں کیا جارہا کہ اُن کا بیان مقالہ ہٰذا میں بارہا کیا جا چکا ہے۔ اس نو تاریخیت کی روایتی روایت کے بعد بحث کا رخ وہ پاکستان کی تاریخ کے آغاز کی طرف کرتی ہیں۔ جس سے متعلق وہ عمومی روایتی مؤرخین کی طرح یہ کہتی ہیں کہ پاکستان کے حالات ابتدا سے ہی بہتر نہ تھے اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بد سے بد تر ہوتے گئے۔یعنی پاکستان اپنے قیام کے ساتھ ہی کئی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ اور اس کی بڑی وجہ مقتدر قوتوں کا جبر ہے۔ اپنے مضمون کے اس اگلے حصے میں، پاکستان کی ابتدائی اَبتر تاریخی صورت حال (جو کہ مزید گمبھیر ہوتی گئی) کو پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عبداللہ حسین نے اپنے مذکورہ دونوں ناولوں میں اسی صورت حال کی نوحہ گری کی ہے۔ مضمون کے نصف حصے کے بعد وہ بحث کا رخ "نادار لوگ" اور اس کے نو تاریخی مطالعہ کی جانب موڑتی ہیں۔ اور پہلے پہل نادار لوگ کا جائزہ نو تاریخیت کی نظری جہات کے تناظر میں کرتی ہیں ۔ کہ نو تاریخیت کس طرح نو تاریخی پڑھت کا تقاضا کرتی ہے۔ جیسے کہ نو تاریخیت اس امر پر اصرار کرتی ہے کہ ادبی متون کو تاریخی متون کی طرح سمجھا جائے اور اسی طرح ہی پرکھا

جائے۔اور اُن عصری رویوں کی تحدیدات کا تعین بھی کیا جائے جو تاریخ کے کسی بھی عہد میں" سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی" حوالے سے اَدِھکاری رہے۔ اس تناظر میں نادار لوگ کے تخلیقی متن میں تہ در تہ پوشیدہ ملفوف تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں پاکستان کی عصری تاریخ کا وہ منظر نامہ ابھر کر سامنے آئے گا کہ جب ملک میں آمریت اس قدر مسلط تھی کہ عوام کے لیے اپنی رائے کا اظہار بھی بے حد مشکل تھا۔ اسی طرح مُصنفِہ نے نو تاریخیت کی نظری جہات کے تناظر میں دیگر ہم پلہ تاریخی متون کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اس حوالے سے کچھ یوں لکھتی ہیں:

> " تاریخ کے دیگر ادبی متون کو اگر اس ناول سے متصل کر کے پڑھا جائے تب بھی یہی ایک اجتماعی رائے سامنے آتی ہے کہ پاکستان کی عصری تاریخ کے وہ حقائق جنھیں پاکستان کی غیر جمہوری قوتوں، عسکری طاقتوں، مقتدر اشرافیہ اور سر پرست طبقات کو بچانے کے لیے منظرِ عام سے ہٹا دیا گیا، وہ رویہ قطعاً درست نہ تھا۔۔۔خالد حسن جو بھٹو کے خاصے قریب رہے، انھوں نے اپنی کتاب **مقابل ہے آئینہ** میں جب بھٹو کا خاکہ لکھا، تو انھوں نے اس خاکے میں کمیشن کی اس رپورٹ کے بارے میں اپنی یہی رائے قلم بند کی، کہ سانحۂ مشرقی پاکستان کے ذمہ داران کو نہ صرف سزا دی جائے بل کہ اس سانحے سے متعلق اس تحقیقی رپورٹ کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔"(۲۴)

علاوہ بریں مُصنفِہ نے اس ناول کے تناظر میں ناول کے چند اہم تاریخی کرداروں کا احوال بھی پیش کیا ہے۔ جیسے ناول کے مرکزی کردار: "اعجاز "کا، اور اس کی جبری گم شدگی وغیرہ کا۔ اس ناول کے تناظر میں میں مجموعی جائزہ پیش کرتے ہوئے، "ڈاکٹر حنا جمشید "یوں رقم طراز ہیں:

"عبد اللہ حسین ناول کے اختتام کو بڑی مہارت سے جبر کے اُسی دائرے میں واپس لے جاتے ہیں جو ابتدا سے جاری و ساری ہے۔ جس کا تعلق تہذیب و ثقافت کی ان جڑوں سے ہے جو سماج میں مخصوص صورتوں میں سرایت کیے ہوئے ہیں ،جہاں جبر مظلوم لوگوں کو اپنی زندگی کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ جسے مقتدر طبقات نے محض اپنی مفاد پرستی کے لیے، اس مخصوص قسم کی ذہن سازی سے یوں متشکل کیا کہ سماج (کا) ہر فرد اس جبر پر تکلیف میں ہونے کے باوجود مہر بہ لب ہے۔۔۔۔۔ عبد اللہ حسین کا یہ ناول جہاں فکر و فن کی کئی خوبیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے وہیں پاکستان کی عہد بہ عہد کئی عشروں پر مشتمل تاریخ کا، ایسا غیر جانب دار اور متبادل بیانیہ بھی اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، جو کسی بھی تاریخی دستاویز سے کم نہیں۔ یہ متبادل بیانیہ پاکستان کی موجودہ عصری صورت حال اور مسائل کی ان وجوہات کا بھی تعین کرتا ہے جن کی جڑیں آج بھی ماضی میں کہیں پیوست ہیں۔ یہی نہیں بل کہ یہ ناول پاکستان کی عصری تاریخ کا حقیقی آئینہ ہوتے ہوئے، ہمارے ان مسائل کی بھی نشان دہی کرتا ہے جو پاکستان کے قیام سے آج تک بعینہ وہیں موجود ہیں۔"(۲۵)

ڈاکٹر حنا جمشید، کے اس مضمون کا اجمالی جائزہ لیا جائے تو اس کی صورت حال کچھ اس طرح ہمارے سامنے آتی ہے کہ ایک سرسری مطالعہ سے یہ مضمون بہ ظاہر بہت اہم دکھائی دیتا ہے۔ اور عبد اللہ حسین کے ناول: "نادار لوگ" کے نو تاریخی مطالعہ کی حد تک اہمیت کا حامل ہے بھی۔۔۔ مگر اِس میں چند ایک قباحتیں ہیں: **اول:** مضمون اُس تنقیدی اُپج پر رقم نہیں کیا گیا، جس کا یہ متقاضی تھا۔ **دوم:** مضمون کا ایک بڑا حصہ عنوان کے خلاف جا کر عمومی سطح کے نظری مَباحث پر صَرف کیا گیا۔ جو کہ بے جا طوالت کے لحاظ سے بھی مناسب نہیں ہے اور کوئی نیا پہلو سامنے نہ لانے کی بنا پر بھی، اُس کا یہاں رقم کرنا کوئی جواز نہیں رکھتا۔ **سوم:** مقالہ نگار (حنا جمشید) نے جو پہلے سے

موجود مباحث پر صفحات تلپٹ کیے ہیں وہی اگر نادار لوگ کو حصہ دیتی تو بہت سے اور اہم پہلو نو تاریخی تناظر میں منکشف ہوتے، کہ جن کی ابھی بے حد تشنگی ہے۔ **چہارم:** مضمون ہٰذا میں براہ راست عام تاریخی عصری متن سے، عمومی تاریخ کی مثالیں پیش کر کے، موازنہ و تقابل کرنے کی بجائے، ملتی جلتی مثالیں (جسے مثال برائے مثال، کہا جا سکتا ہے۔) دے کر عمومی تقابل سے کام چلایا گیا ہے جو کہ نو تاریخیت کے رویے کے برعکس ہے۔ (ظاہر ہے کہ ادبی تاریخی متون کے ہم پلہ، عمومی تاریخی متون میں مثالیں تلاش کرنا، ایک مشکل امر ہے اور قوی مُطالعہ کا متقاضی ہے۔) **پنجم:** اس مضمون میں کسی حد تک بے ربطی دیکھنے میں آئی ہے۔ شاید 'حنا جمشید' نو تاریخیت کی ایک جہت کو زیادہ ہی سنجیدہ لے گئی ہیں کہ نو تاریخی مطالعہ کسی خاص ربط کا قائل نہیں۔ مگر اس کا ہر گز یہ مطلب بھی نہیں کہ؛ نو تاریخیت کے بنیاد گزاروں کا ذکر کرتے ہوئے، پاکستان کی عصری تاریخ کی قصہ گوئی شروع کر دی جائے اور اسے پھر بیچ میں چھوڑ کر نو تاریخیت کے پیش رو کا ذکر شروع کر دیا جائے اور بنیاد گزاروں کو بھول جایا جائے۔' بہر حال اُردو تنقید میں نو تاریخیت کے انتہائی قلیل عملی مطالعات کے مجموعی منظر نامے کے تناظر میں ایک مُوثق اضافہ کم از کم ہے۔

اُردو تنقید میں نو تاریخیت کے اطلاقی مَباحث کے حوالے سے اِن مضامین کے علاوہ جو تحاریر ہمارے سامنے آتی ہیں وہ "غیر مطبوعہ مقالہ جات" ہیں۔ جو مختلف جامعات میں ڈگری کے حصول کی غرض سے رقم کیے گئے۔ ان میں پہلا مقالہ؛ "پنجاب یونی ورسٹی، لاہور"، جب کہ باقی دونوں مقالہ جات؛ "نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد" سے ہیں۔ اول الذکر مقالے کا، تحقیق ہذا کے باب سوم میں، نظری حوالے سے جائزہ لیا جا چکا ہے۔ جس میں اس کا مکمل احوال بیان کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ **"سید ازو عباس"** نے "شعبۂ اردو، اوری اینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور"، میں "ایم۔ فل: اُردُو" کی ڈگری کے حصول کے لیے ۲۰۱۸ء میں **"اردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث"** کے عنوان سے رقم کیا۔ جسے تین بنیادی مباحث اور چوتھا محاکمہ کے باب میں منقسم کیا۔ اس مقالہ کا پہلا باب؛ "اردو تنقید کی روایت" ہے، دوسرا باب؛ "اردو تنقید میں تاریخیت اور

نو تاریخیت کے نظری مباحث" ہے، تیسرا باب؛"اردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کیا اطلاقی جہات" اور چوتھا؛" محاکمہ "(الف: محاکمہ، ب: کتابیات، ج: ضمیمہ: تاریخیت اور نو تاریخیت کے انگریزی سے اُردُو میں ترجمہ شدہ مضامین کا جائزہ) کے عنوان سے ہے۔پہلا باب اُردو کی تنقیدی روایت ہے ،جس میں مقالہ نگار نے 'نو تاریخیت' سے کڑیاں جوڑنے کی کوشش کی ہے۔جب کہ دوسرے باب کا تفصیلی جائزہ، مقالہ ہٰذا کے 'باب سوم' میں لیا جاچکا ہے جو کہ تاریخیت اور نو تاریخیت کے اُردُو تنقید میں نظری مباحث سے متعلق ہے۔ تیسرا باب تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے اطلاقی مطالعات سے متعلق ہے جس کا جائزہ یہاں مقصود ہے۔ اور آخری باب "محاکمہ، کتابیات اور ضمیمہ (تاریخیت اور نو تاریخیت کے انگریزی سے اُردُو میں ترجمہ شدہ مضامین کا جائزہ)" پر مشمول ہے، ہم یہاں پر باب سوم کا جائزہ لیتے ہیں۔

مقالہ ہذا کے باب سوم کا عنوان: **"اردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کی اطلاقی جہات"** ہے۔اس باب کا آغاز مقالہ نگار نے روایتی طور پر تنقید کی دونوں اقسام "نظری" اور "اطلاقی" کے فرق اور اطلاقی تنقید کی اہمیت سے شروع کیا ہے۔ اطلاقی تنقید کی توضیح پیش کرتے ہوئے مصنفِ مقالہ کا رخ تاریخیت اور نو تاریخیت کے اطلاقی مباحث کی جانب موڑتے ہیں جس میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے فرق ایک طرف رکھتے ہوئے دونوں کے اطلاقی مضامین کو بغیر کسی زمانی و دیگر تسلسل کو اپناتے ہوئے تجزیاتی مُطالعہ کیا یعنی صاحب مقالہ نے پہلا مضمون نو تاریخیت کا لیا تو اگلا تاریخیت کے اطلاقی مَباحث کے مضمون کا جائزہ لے لیے اور اس کے بعد پھر نو تاریخیت کا جائزہ لیا اور یوں بحث کو آگے بغیر کسی تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے بڑھایا ہے۔ ہم یہاں پر مقالہ میں ،مقالہ نگار کے زیر بحث لائے نو تاریخیت کے مضامین کا جائزہ لیں تو،صاحبِ مقالہ نے اُنہیں تین مضامین کو موضوع بنایا ہے کہ جن کا جائزہ باب ہذا میں اس سے قبل لیا جاچکا ہے۔لہذا ان کو تفصیلی بیان کرنا یہاں بے جا طوالت کا باعث بنے گا۔ اُردُو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے اطلاقی مضامین سے متعلق صاحبِ مقالہ لکھتے ہیں:

"اردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے اطلاقی نمونے شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر بیگ احساس، ڈاکٹر ناہید قمر، اسلم سراج الدین، اور ڈاکٹر قاضی عابد نے پیش کیے۔" (۲۶)

اس سے ایک پہلو جو ہمارے سامنے آتا ہے کہ اردو تنقید میں نو تاریخیت کے مباحث کے آغاز سے لے کر ۲۰۱۸ء تلک اور ۲۰۱۸ء سے آج تک کس قدر قلیل مطالعات سامنے آئے، حتیٰ کہ ۲۰۱۸ء سے آج تک صرف گنتی کے چار مضامین اور دو مقالات ہیں جس میں نو تاریخیت کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ نو تاریخیت کے مضامین سے متعلق "سید ازور عباس" لکھتے ہیں:

"اردو تنقید میں نو تاریخیت کے صرف تین اطلاقی نمونے پیش کیے گئے۔ اگرچہ یہ تعداد خاصی کم ہے لیکن اس میں پائی جانے والی سنجیدگی اور پختگی قابلِ قدر ہے۔"(۲۷)

میں صاحبِ مقالہ کی آدھی رائے سے تو اتفاق کرتا ہوں مگر بقیہ آدھی رائے سے ناہوں۔ مُتفق اس طرح، کہ یہ تینوں اطلاقی نمونے اُردُو تنقید میں نو تاریخیت کے اطلاقی مطالعات کے ابتدائی نمونے ہیں اور یہ ایک نمونہ بنانے کی خاطر اہمیت کے حامل تو ہوسکتے ہیں۔ اور نامتفق ایسے کہ جس قدر پختگی و مقدرت کے صاحبِ مقالہ قائل ہیں، ایسا نہ ہے۔ ہاں "قاضی عابد" کا مضمون اِن میں اہمیت کا حامل ہے کہ وہ ہمیں باقاعدہ ایک نمونہ بھی فراہم کرتا ہے اور نو تاریخی تنقید و تجزیہ کے حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ علاوہ بریں: "شمس الرحمٰن فاروقی" کا مضمون بھی اہم ہے۔ مگر اس کی اہمیت کو کچھ کم اُس کا انتہائی مختصر ہونا کرتا ہے۔ (کیوں کہ وہ شمس الرحمٰن فاروقی کے ایک طویل مضمون کے آخری سے پہلے حصے کا ایک ضمنی عنوان ہے۔ جس کا تعارف و تجزیہ اسی باب میں پیچھے کیا جاچکا ہے۔) سید ازور عباس، کے اس مقالے کا مجموعی جائزہ لیا جائے، تو یہ اس لحاظ سے ضرور اہمیت کا حامل ہے کہ اِس میں نو تاریخیت کے تمام مضامین کا اکٹھ ہے، مگر اس میں اطلاقی تناظر میں کوئی نئی مثال

سامنے کم ہی آتی ہے۔اور تنقیدی انداز صاحبِ مقالہ خاصا روایتی ہے۔ اس میں یہ ایک بے حد کم زور پہلو ہے کہ صاحبِ مقالہ نے اِن اطلاقی مباحث کا جائزہ لیتے ہوئے بنیادی ماخذ سے رجوع نہ کیا ہے۔ انگریزی تنقید میں ایک اہم سلسلہ نو تاریخیت کے اطلاقی مباحث کے حوالے سے نشاۃ الثانیہ کے مطالعات اور شیکسپیئر کے مطالعات کا ہے۔ صاحبِ مقالہ نے اُردُو کے کسی نمونے کا انگریزی کے اُن ابتدائی نمونوں سے موازنہ نہ کیا ہے۔

اُردُو تنقید میں نو تاریخیت کے اطلاقی مباحث کے حوالے سے دوسرا اطلاقی مقالہ:**"سمعیہ شکور"** کا ہے جو انھوں نے ۲۰۱۹ء میں " شعبۂ اُردُو زبان وادب، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد" میں "ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان" کی نگرانی اور "ڈاکٹر نازیہ یونس" کی شریک نگرانی میں :**"زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت("تتلیاں ڈھونڈنے والی" اور "رقصِ بسمل ہے"، کے حوالے سے)"** کے عنوان سے رقم کیا۔ یہ مقالہ اُردُو تنقید میں نو تاریخیت کے تناظر میں دوسرا اطلاقی جب کہ افسانے کے نو تاریخی مطالعہ کے حوالے سے پہلی کاوش ہے۔ یہ مقالہ کوئی اتنا ضخیم نہ ہے۔ زاہدہ حنا، جدید اردو افسانے کا ایک اہم نام ہیں جن کے افسانوں کا نو تاریخی مطالعہ شاید وقت کا تقاضا بھی تھا۔ سمعیہ شکور، بھی انہیں جدت طراز افسانہ نگار مانتی ہیں اور اعتراف کرتی ہیں کہ زاہدہ حِنا کا اسلوب وآہنگ ایسا انوکھا ہے کہ وہ نو تاریخیت سے اٹا ہوا ہے۔ نہ صرف یہ بل کہ سمعیہ شکور کے مطابق زاہدہ حنا کے افسانے، افسانے کم اور ایک تاریخی دستاویز زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ زاہدہ حنا سے متعلق سمعیہ شکور کے اس مقالے کا جائزہ لیا جائے تو سمعیہ شکور نے اس مقالے کو چار اساسی اور پانچویں ماحصل باب میں منقسم کیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان:"موضوعِ تحقیق کا تعارف اور بنیادی مَباحث"ہے، جو کہ جامعہ کے تجویز کردہ نمونہ کے مطابق ہے۔ باب دوم:"زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت کا موضوعاتی مطالعہ" باب سوم:"زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت کا اسلوبی جائزہ" اور باب چہارم:"زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت کا فنی جائزہ" کے عنوان سے ہیں۔ جب کہ پانچواں باب "ماحصل" کے عنوان سے ہے جس میں "مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات" پیش کی گئی ہیں۔

سمعیہ شور، کے مقالہ کے پہلے باب کا جائزہ لیا جائے تو جیسے کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ پہلے باب میں بنیادی مباحث بیان کیئے گئے ہیں۔ جس میں مقالہ نگار نے زاہدہ حنا کا تعارف، نو تاریخیت اور نو تاریخیت کے بنیادی تصورات کو انتہائی اختصار سے بیان کیا ہے۔ اور نو تاریخیت کے بیان اور اس کے تصورات کے بیان میں کچھ زیادہ ہی اختصار سے کام لیا ہے۔ مصنفہ نو تاریخیت کا بنیادی خیال کچھ یوں بیان کرتی ہیں کہ نو تاریخیت ایک ایسا ادبی نظریہ ہے کہ جو اس فکر پر منحصر ہے کہ متن کی تفہیم و تعبیر مصنف اور نقاد، دونوں کو تاریخ کے تناظر میں کرنی چاہیے۔ اور کوئی بھی متن اکیلا کوئی معنی نہیں رکھتا بل کہ دوسرے متون جیسا کہ تاریخی، سماجی اور ثقافتی' کے تناظر میں اس کی پڑھت کی جانی چاہیے۔ اس بنیاد کی بنا پر مُصنفِہ اپنے مقالہ کو استوار کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن پڑھت میں جلد ہی اِن اصولوں کو بھول جاتی ہیں۔ اس مقالہ کا دوسرا باب "زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت کا موضوعاتی مطالعہ " کے عنوان سے ہے۔ جس میں زاہدہ حِنا کے افسانوں کا؛ "سماجی، نفسیاتی، مذہبی اور سیاسی " تناظر میں جائزہ لیتی ہیں۔ زاہدہ حِنا کے افسانوں میں نو تاریخیت کے تناظر میں نفسیات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "پانیوں پر بہتی پناہ، زاہدہ حِنا کا افسانہ بنگلہ دیش کے ایک تاریخی واقعہ پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے وہاں کے لوگوں کی نفسیات کو بیان کیا ہے کہ کس طرح لوگ افسانوں کے جذبات اور ان کے ذہنوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ اس افسانے میں ایک لڑکی کا کردار ہے جو ایک لکھاری ہے۔ تنہائی اور خوف کے عالم میں مبتلا ہے جو لوگوں سے اس قدر خوف کھاتی ہے کہ اس کو کسی بھی چیز کی آواز سے ڈر محسوس ہوتا ہے۔"(۲۸)

اسی طرح دیگر موضوعات جیسا کہ سماجی، مذہبی اور سیاسی کا احوال بیان کرتی ہیں۔ باب دوم تلک تو سمعیہ شکور کے مقالے کی سمجھ آتی ہے۔ لیکن اس کے بعد "باب سوم " اور "باب چہارم " میں بات سمجھ سے باہر ہے کہ جس میں مقالہ نگار نے نو تاریخیت کے عنوان کے تحت دونوں ابواب میں "زبان و بیان، تشبیہات، علامت نگاری،

پلاٹ کردار اور مکالموں" کا جائزہ پیش کیا ہوا ہے۔ یہ طریقہ کار تو نو تاریخیت کیا، روایتی تاریخی طرائق یا نو مارکسی طرائق کے بھی از حد خلاف ہے۔ کم از کم راقم نے نو تاریخیت کے تحت یہ نہیں پڑھا کہ اس ضمن میں تشبیہات اور علامتوں کا جائزہ لیا جائے یا زبان کے حسن و نقائص روایتی طور سے بیان کیئے جائیں۔ ہاں اگر تاریخی تناظر میں کوئی زبان کی تبدیلی کا احوال بھی پیش کرتی تو کہا جاسکتا تھا کہ چلیں اس نو تاریخی مطالعہ میں ایک نئی جہت ابھر کر سامنے آئی ہے۔ مقالہ نگار کا، زاہدہ حنا، کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ذرا علامت نگاری کی رائے کے حوالے سے اقتباس ملاحظہ کیا جائے:

> "ادب میں علامتوں نے کئی پہلوؤں سے وجود حاصل کیا کہیں الفاظ کے ذریعے، کہیں زبان کے ذریعے سے اور کہیں تصورات کے ذریعے سے وجود پایا۔ علامت کے استعمال میں ایک نئی صورت زاہدہ حنا کے افسانوں میں نظر آتی ہے ان کے افسانے مختلف پرتوں میں معنی کا انکشاف کرتے ہیں۔" (۲۹)

دیکھا جائے تو نو تاریخیت کے تحت یہ تجزیہ اور ضمنی عنوانات ہی سراسر غلط ہیں۔ ہاں اگر انہیں بیان کرنا کسی قسم کی کوئی مجبوری بھی تھی تو کم از کم انہیں کسی ایسے ڈھنگ سے بیان کیا جاتا کہ ان کا کوئی جواز سمجھ میں آتا۔ اسٹیفن جے گرین بلاٹ، سے لے کر تمام نو تاریخی ناقدین کے تجزیات کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں کسی ناقد کے ہاں نو تاریخیت کے ضمن میں یہ عنوانات نظر نہیں آتے۔ نو تاریخیت کا نظریہ، اساسی طور پر "تاریخ" کے علاوہ، جن عناصر کے گرد مرکوز ہے یعنی؛ "ثقافت" اور ثقافتی تشکیل" وغیرہ، مُصنِفہ نے اپنے مقالے میں اس کا ذکر تک کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔

نو تاریخیت کے اطلاقی مباحث کے ضمن میں عہد حاضر تک آخری اطلاقی مقالہ: **"عائشہ واجد"** کا ہے۔ یہ مقالہ ۲۰۲۰ء میں **"اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت"** کے عنوان سے "پروفیسر ڈاکٹر رخشندہ مراد" کی نگرانی میں "شعبۂ اُردو زبان وادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد" میں "ایم۔ فل: اُردو" کی

ڈگری کے حصول کی غرض سے رقم کیا گیا۔ اُردُو تنقید میں نو تاریخیت کے اطلاقی مباحث کے حوالے سے یہ تیسرا مقالہ اور افسانوں کے نو تاریخی مطالعہ کے تناظر میں یہ دوسرا مقالہ ہے۔ یہ مقالہ مجموعی طور پر ضخامت کے لحاظ سے مختصر مقالہ جات میں شمار ہوتا ہے جو کہ کل چار "اساسی" اور پانچویں "ماحصل" کے باب میں منقسم ہے۔ جامعہ کی طرف سے تجویز کردہ روایتی طریق کار کے مطابق "موضوعِ تحقیق کا تعارف اور بنیادی" مباحث کے عنوان سے اس مقالے کا پہلا باب ہے۔ دوسرا باب: "اسد محمد خان کی افسانہ نگاری"، تیسرا باب "اسد محمد خان کے افسانوں کا نو تاریخی مطالعہ (۱۹۷۰ء تا ۱۹۹۷ء)" اور چوتھا باب: "اسد محمد خان کے افسانوں کا نو تاریخیت مطالعہ (۲۰۰۳ء تا ۲۰۱۰ء)" کے عنوان سے ہے۔ جب کہ آخری باب پنجم "محاحصل" ، محاکمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقالے کو دیکھا جائے تو پہلے دو ابواب اساسی نوعیت کے ہیں۔ پہلا باب کہ جس میں نو تاریخیت کا تعارف اور اس کے بنیادی گروہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرے باب میں اسد محمد خان کی سوانح، افسانہ نگاری اور افسانوی مجموعوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ نو تاریخیت کے تعارف میں مُصنفِہ نے نو تاریخیت کے اساسی ماخذ سے رجوع کرنے کی بجائے اُردُو میں نو تاریخی تنقید سے استفادہ کیا ہے۔ جب کہ اسد محمد خان کا تعارف کچھ یوں کرواتی ہیں:

> "اسد محمد خان نے ستر کی دہائی میں افسانہ نگاری شروع کی۔ ان کا منفرد لہجہ ان کی پہچان ہے۔ لہٰذا اسلامی کلچر، گنگا جمنی تہذیب، ہندی تاریخ اور پیش تر سوری عہد، ان کے افسانوں کا موضوع ہے۔ انہوں نے عالمی ملکی اور سیاسی مسائل پر بھی افسانے لکھے۔"(۳۰)

اسی طرح عائشہ واجد اسد محمد خان کے افسانوں میں تاریخ کی وضاحت کو یوں بیان کرتی ہیں:

> "اسد محمد خان نے آج کے دور کو تاریخ سے جوڑا ہے۔ آج بھی معاشرہ ویسا ہی ہے جیسا ٹیکنالوجی کی ترقی سے پہلے تھا۔ جیسے ماضی میں مقتدر طبقہ محکوم طبقے کے حقوق

کو پامال کرتا تھا اور محکوم طبقہ اس کو خدا کی مرضی سمجھ کر قبول کر لیتا تھا۔ مذہب پر بھی ان اشرافیہ کی حکومت تھی یہ مذہب کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اسد محمد خان کے افسانے اہم ہیں۔ انہوں نے حاشیائی طبقے کے ذریعے اعلیٰ اقدار و روایات اور ہند اسلامی کلچر کو اجاگر کیا ہے۔" (۳۱)

بالا اقتباس سے ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اسد محمد خان کا تاریخی تناظر میں رجحان کس طرف مائل تھا۔ عائشہ واجد، کے مقالے میں جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، کہ ابتدائی دو ابواب اساسی نوعیت کے حامل ہیں۔

لٰہذا 'تیسرا باب' اس تناظر میں اہمیت کا حامل ہے کہ جس میں باقاعدہ نو تاریخی پڑھت کی کوشش کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں، اسد محمد خان کے ۱۹۷۰ سے ۱۹۹۷ء کے دوران تین مجموعوں: "کھڑکی بھر آسمان"، "ہرج خموشاں" اور "غصے کی نئی فصل" کا نو تاریخی مطالعہ کیا گیا ہے۔ کسی حد تک عائشہ واجد کی یہ کاوش نو تاریخیت کے قریب تر دکھائی دیتی ہے کہ جس میں کم از کم نو تاریخی پڑھت کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ جس میں وہ تجزیہ کا آغاز ہی سوالیہ انداز سے کرتی ہیں۔ کہ کیا واقعی اقدار و روایات عام انسانوں میں موجود ہوتی ہیں یا یہ کوئی طاقت کا نیا کھیل ہوتا ہے کہ جس میں مقتدر طبقہ ان کو عام طبقے پر تھوپتا ہے؟ اس کا جواب وہ اسد محمد خان کے افسانے "باسودے کی مریم" میں تلاش کرتی ہیں:

"اسد محمد خان کے ہاں ایک بڑی تعداد تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی افسانوں کی ہے۔ "بادسودے کی مریم" اُن کا نمائندہ افسانہ ہے۔ یہ افسانہ (افسانوی) کردار جسے "انابوا" کہا جاتا ہے، کہ (کے) گرد گھومتا ہے۔ یہ افسانہ تقسیمِ ہند سے پہلے کے سماج کا آئینہ دار ہے۔۔۔۔ یہ افسانہ ۱۹۷۰ء اور اس کے بعد بڑھتی ہوئی مذہبی انتہا پسندی کا ردِ بیانیہ ہے۔ اقتدار کے حصول کے لیے مذہب کا چولا اوڑھا گیا۔ مذہب کے نام پر فرقہ واریت اور ذات پات کی تقسیم کو ہوا دی گئی۔ مذہب

اور عقیدت کے نام پر سادہ اور ناخواندہ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکی گئی۔"(۳۲)

اس مقالے کے باب چہارم میں اسد محمد خان کے دوسرے دور کے افسانوی مجموعی "نربدااور دوسری کہانیاں"، "تیسرے پہر کی کہانیاں" اور "اک ٹکڑا دھوپ کا" کا جائزہ لیا گیا ہے جو کہ ۲۰۰۳ء سے ۲۰۱۰ء کے دوران شائع ہوئے۔ اس باب کا آغاز بھی روایتی طور پر تاریخ اور ثقافت کے رشتے کو بیان کرنے سے کرتی ہیں۔ اور بحث کو نو تاریخی مُطالعہ کی طرف بڑھاتی ہیں۔ اسد محمد خان کے افسانوں کے تناظر میں تاریخ کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"رگھوبا اور تاریخ'، میں اسد محمد خان نے تاریخ نگاری کے فرسودہ نظام کا پردہ چاک کیا ہے۔ تاریخ ہمیشہ مقتدرہ طبقے کی لکھی جاتی ہے انہی کے کارناموں سے بھری جاتی ہے۔ عام آدمی کا تاریخ میں کوئی کردار نہیں ہوتا اس کو تاریخ میں تب تک جگہ نہیں ملتی جب تک اس کی نسبت کسی طاقت ور شخص سے نہ ہو۔"(۳۳)

عائشہ واجد، کے اس مقالہ "اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت" کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو ایک اہم دستاویز کے طور پر سامنے آتا ہے۔ کم از کم جس میں "نو تاریخی طریق رسائی" کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جس سے ہم نو تاریخی مُطالعہ سے کسی حد تک واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کا موازنہ اگر: "سمعیہ شکور" کے مقالے سے کیا جائے تو اُس تناظر میں یہ بہت بہتر مثال ہے۔ علاوہ بریں 'عائشہ واجد' کے مقالے میں جو ایک بہت کم زور پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ عائشہ واجد نے نو تاریخی مطالعہ کرتے ہوئے انتہائی اختصار سے کام لیا اور بہت سے اسد محمد خان کے دیگر افسانوں کو، اِنہیں افسانوں مجموعوں میں سے ہی، بحث کا حصہ نہیں بنایا، کہ جن کا نو تاریخی مطالعہ کیا جا سکتا تھا۔ اس علاوہ "عائشہ واجد" نے اِس نو تاریخی مُطالعہ کے دوران اسے کسی حد تک محدود کر دیا ہے۔ نو تاریخیت کی کئی ایک اور نظری جہات ایسی تھیں کہ جن کے تناظر میں اِن افسانوں کو پرکھا جا سکتا تھا۔

علاوہ بریں اگر نو تاریخی کے اطلاقی مضامین ومقالہ جات کے مجموعی مزاج کا جائزہ لیا جائے تو ابھی اسے استوار ہونے میں شاید ایک مُمتد وقت درکار ہے۔ کیوں کہ بہت سے ناقدین تجزیہ کرتے ہوئے، یا تو نو تاریخیت کے ڈھنگ کو ہی بھلا بَیٹھتے ہیں یا پھر نو تاریخیت کے متعدد پہلوؤں کو درگزر کر دیتے ہیں، اور اپنے اطلاقی مُطالعہ کے دوران نَو تاریخیت کی نظری جہات کا اطلاق نہیں کرتے۔

حوالہ جات

1. David Daichas,Critical Approaches to Literature,Longman,London, 1959, P: 121

۲. سید محمد عقیل، تنقید اور عصری آگہی، ذوالفقار صدیقی، الہ آباد، ۱۹۷۶ء، ص:۱۱۳

۳. ناصر عباس نیّر، عالم گیریت اور اردو اور دیگر مضامین، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور:۲۰۱۵ء، ص ۱۱۲

۴. قاضی افضال حسین، تحریر اساس تنقید: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء، ص:۱۳

۵. ناصر عباس نیّر، جدید اور مابعد جدید تنقید، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص:۳۰۲

۶. ناصر عباس نیّر، متن، سیاق اور تناظر، سنگ میل پبلی کیشنز: لاہور ۲۰۱۶ء، ص ۲۴

۷. شمس الرحمٰن فاروقی، متن کی قرات، مرتب: قاضی افضال / صغیر افراہیم، شعبہ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۱۷ء، ص:۱۷

۸. شمس الرحمٰن فاروقی، متن کی قرات، مرتب: قاضی افضال / صغیر افراہیم، ص:۳۸

۹. ایضاً، ص:۳۳، ۳۴، ۳۵

۱۰. محمد نعیم، ڈاکٹر، اُردو ناول اور استعماریت، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص:۷۹

۱۱. احساس بیگ، پروفیسر، گردش رنگ چمن نئی تاریخیت کی ایک روشن مثال، (مضمون) مشمولہ: متن کی قرات، مرتبہ صغیر افراہیم / قاضی افضال حسین، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص:

۱۲. احساس بیگ، پروفیسر، گردش رنگ چمن نئی تاریخیت کی ایک روشن مثال، (مضمون) مشمولہ: متن کی قرات، مرتبہ صغیر افراہیم / قاضی افضال حسین، ص:۱۷

۱۳. ایضاً، ص:۱۲۱

۱۴. ایضاً، ص:۱۲۹

۱۵. قاضی عابد،ڈاکٹر، اساطیر، کتھا، کہانی اور مابعد جدید تناظر، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص: ۷۶

۱۶. قاضی عابد،ڈاکٹر، اساطیر، کتھا، کہانی اور مابعد جدید تناظر، ص:۷۷

۱۷. ایضاً، ص:۷۷

۱۸. نسیم عباس احمر،ڈاکٹر، "خس وخاشاک زمانے"---نو تاریخی پڑھت (مضمون)، مشمولہ نو تاریخیت، مرتبہ: ڈاکٹر نسیم عباس احمر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص: ۲۰۳

۱۹. نسیم عباس احمر،ڈاکٹر، "خس وخاشاک زمانے"---نو تاریخی پڑھت (مضمون)، مشمولہ نو تاریخیت، مرتبہ: ڈاکٹر نسیم عباس احمر، ص:215

۲۰. ایضاً، ص:۲۰۴

۲۱. ایضاً، ص: ۲۰۵، ۲۰۸

۲۲. حنا جمشید، ڈاکٹر، عبد اللہ حسن کا نو تاریخی شعور: تخصیصی مطالعہ نادار لوگ (مضمون)، مطبوعہ: اورینٹل کالج میگزین، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ ۳۶۶، جلد ۹۷، ۲۰۲۲ء، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، پاکستان، لاہور، ص: ۱۰۷

۲۳. حنا جمشید، ڈاکٹر، عبد اللہ حسن کا نو تاریخی شعور: تخصیصی مطالعہ نادار لوگ (مضمون)، مطبوعہ: اورینٹل کالج میگزین، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ ۳۶۶، جلد ۹۷، ۲۰۲۲ء، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، پاکستان، لاہور، ص:۱۰۲

۲۴. حنا جمشید، ڈاکٹر، عبد اللہ حسن کا نو تاریخی شعور: تخصیصی مطالعہ نادار لوگ (مضمون)، مطبوعہ: اورینٹل کالج میگزین، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ ۳۶۶، جلد ۹۷، ۲۰۲۲ء، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، پاکستان، لاہور، ص:۱۱۶

۲۵. حنا جمشید، ڈاکٹر، عبداللہ حسن کا نو تاریخی شعور: تخصیصی مطالعہ نادار لوگ (مضمون)، مطبوعہ: اورینٹل کالج میگزین ، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ۳۶۶، جلد۹۷، ۲۰۲۲ء، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، پاکستان ، لاہور، ص:۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱

۲۶. سید ازور عباس، اُردُو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث، مقالہ برائے ایم۔فل اردو (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: شعبۂ اُردُو اوری ینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص:۱۴۱

۲۷. سید ازور عباس، اُردُو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث، مقالہ برائے ایم۔فل اردو (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: شعبۂ اُردُو اوری ینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص:۱۹۶

۲۸. سمعیہ شکور، زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت (تتلیاں ڈھونڈنے والی اور رقص بسمل ہے، کے حوالے سے)، مقالہ برائے ایم۔فل اردو، (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: شعبہ اردو زبان وادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء، ص: ۳۶

۲۹. سمعیہ شکور، زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت (تتلیاں ڈھونڈنے والی اور رقص بسمل ہے، کے حوالے سے)، مقالہ برائے ایم۔فل اُردُو، (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: شعبۂ اُردُو زبان وادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء، ص: ۷۶، ۷۷

۳۰. عائشہ واجد، اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت، مقالہ برائے ایم۔فل اُردُو، (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: شعبۂ اُردُو زبان وادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء، ص:۵۲

۳۱. عائشہ واجد، اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت، مقالہ برائے ایم۔فل اُردُو، (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: شعبۂ اُردُو زبان وادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء، ص: ۵۷

۳۲. عائشہ واجد، اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت، مقالہ برائے ایم۔فل اُردُو، (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: شعبۂ اُردُو زبان وادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء، ص: ۵۷، ۵۸

۳۳. عائشہ واجد، اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت، مقالہ برائے ایم۔فل اُردو، (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: شعبۂ اُردو زبان وادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء، ص:۸۶

الف۔ مجموعی جائزہ

ہمارے اکثر اربابِ فراست و پربینِ فن تاریخ یہ افشا کرتے ہیں کہ: "تاریخ" (History) صرف اور صرف انسانوں سے وابستہ ہے۔ اس رائے کے تناظر میں ایک لحاظ سے وہ صحیح بھی ہیں اور ایک لحاظ سے غلط بھی۔ اگر زاویہ نظر تھوڑا سا کشادہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ "تاریخ" (History) صرف اس رُبع مسکون کے باسیوں سے نہیں بل کہ اس کارخانہ قدرت میں ہر ایک شئے سے متصل ہے۔یعنی کائنات (Universe) میں ہر ہر چیز اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے۔ جو آغازِ آفرینش سے حال اور حال سے ابد تلک، مسلسل تشکیل پا رہی ہے۔ اور جُوں جُوں یہ سلسلہ آگے بڑھتا جائے گا، ویسے ویسے تاریخ اُٹھیل ہوتی جائے گی۔ یہاں پر بالا بیان کیے گئے دانش وروں اور تاریخ دانوں کی رائے کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ؛ جسے بیان، محفوظ اور منتقل تو انسان ہی کرتا ہے۔ کیوں کہ اس کارگاہ میں ایک انسان ہی ایسا جان دار ہے، جو شعور و علم رکھتا ہے۔ پس اسی علم کی بدولت انسان تاریخ کو بیان کرتا ہے اور رقم کر کے محفوظ کرتا ہے۔ یہاں پر صورت حال یہ بنتی ہے کہ انسانوں کے علاوہ کوئی بھی مخلوق یا شئے، اپنی تاریخ سے واقفیت حاصل نہیں کر سکتی، مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کی کوئی تاریخ ہی نہ ہے۔ جیسا کہ انسانوں کے علاوہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ بہت سے جانوروں کی مجموعی وارتقائی تاریخ ہمیں ملتی ہے کہ وہ ابتداء میں کیسے تھے؟ عصرِ رواں میں کس حالت میں ہیں؟ ان کی جنس میں "جینیاتی" (Genetics) تبدیلیاں کیا کیا اور کب کب ہوئیں؟ وہ اس دھرتی پر کب سے پائے جاتے ہیں؟ کس کس دور میں ان کی تعداد کیا کیا تھی؟ اور وہ کب سے معدوم ہو گئے ہیں؟ یہ ایک نوع سے متعلقہ تاریخ کی چند اقسام ہیں۔ اسی طرح تاریخ کی دیگر بہت سی اقسام ہیں، جیسے: "علم کی تاریخ"، "فلسفہ کی تاریخ"، "ممالک کی تاریخ"، "سیاست کی تاریخ" وغیرہ وغیرہ (ان کا تفصیلی بیان مقالہ ہٰذا کے باب اول میں کیا جا چکا ہے۔) اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ یہ تمام چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تاریخ کی تمام حالتوں، اس کی تمام اقسام، اس کی وجود سے جب ہم تاریخ کے "بیان" کی جانب رخ کرتے ہیں، تو تاریخ ایک مجموعی سا روپ دھار لیتی ہے۔ (ویسے تاریخ کے بیان کے حوالے سے تاریخ کے جدید ماہرین اور جدید نظریات جیسا کہ: "نو تاریخیت" کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ تاریخ از خود بیان ہوتی ہے۔ یعنی اسے بیان کیا نہیں جاتا۔) تاریخ کے اسی مجموعی سے روپ کی طرف، تاریخ کے عمومی مباحث کا رُخ ہوتا ہے اور اجمالی طور پر تاریخ کے تناظر میں بحث کرتے ہوئے اسی کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ اسی تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ ایک مسلسل تشکیلی عمل سے گزرتی ہے اور گزر رہی ہے۔ جس میں ابتداء سے آج تلک کسی قسم کا ٹھہراؤ نہیں۔ دیکھا جائے تو مجموعی طور پر ہمارا نسق لاتعداد "کہکشاؤں"(Galaxies) پر استوار ہے۔ جس میں ایک کہکشاں میں "سورج"(Sun) اور "زمین"(Earth) کو انتہائی اہمیت حاصل ہے اور زمین ہی وہ سیارہ(Planet) ہے کہ جس پر زندگی پائی جاتی ہے۔ اس میں اہم کردار سورج بھی ادا کر رہا ہے۔ ہماری آماج گاہ یعنی زمین، سورج کے گرد مسلسل گردش میں ہے، اسی گردش سے دن اور رات پیدا ہوتے ہیں، وقت ڈھلتا ہے، زندگی کو قائم رہنے میں مدد ملتی ہے۔ اور تاریخ آگے بڑھتی ہے۔ اس آگے بڑھنے کے دوران اس کرۂ ارض و اس کے متعلقات میں جو جو کچھ وقوع ہو رہا ہے، وہ تاریخ بناتے جا رہے ہیں۔ تا آں کہ نہ صرف یہ دنیا بل کہ پوری کائنات اور جہاں تک ابھی انسانوں کی رسائی نہ ہوئی ہے، وہ بھی اس عملِ مسلسل میں شامل ہیں۔ اور زمان و مکان کی دوریاں نیز ان کا باہمی اقتران بھی انتہائی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک لحاظ سے یہ تمام ہی تاریخ کے تشکیلی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی اگر زمان و مکان میں یہ دوریاں و باہمی اقتران ایسا نہ ہے تو تاریخی عمل تہس نہس ہو جائے۔

ابتدائی ادوار میں انسانوں پر جب یہ وارد ہوا کہ ہم ایک عہدِ مسلسل میں تسلسل کے ساتھ جی رہے ہیں اور یہ جو جو کچھ ہو رہا ہے یہ بے ربط نہ ہے تو انسانوں نے اس گزرے وقت کو تاریخ کا نام دیتے ہوئے اور اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اسے مختلف طرائق سے محفوظ کرنا شروع کیا۔ جس کا آغاز پتھروں پر نقش و نگار اور پھر لکھائی سے اپنے ماضی کو محفوظ کرنے سے ہوا۔ بعد ازاں دورِ جدید میں "جدید آلات"(Modern Equipment’s) سے

اور جدید طرائق سے انسانوں نے اس کی کھوج کی اور آج انسانوں کی رسائی "معلوم یا تحریری تاریخ" (Recorded or Written History) کی صورت میں پچھلے "پانچ سے چھ ہزار سال" (Five to Six Thousand Years) کی تاریخ تک ہے اور آنے والے وقتوں میں جدید طرائق اور ذرائعوں کی مدد سے انسان اپنے ماضی میں مزید پیچھے تک کھوج کرے گا اور مزید قدیم دور کو بہتر سے بہتر جاننے کی کوشش کرے گا۔ کیوں کہ یہ قوی امکان ہے کہ تاریخ تو اس سے بہت پہلے سے اپنا وجود رکھتی ہے۔ یہ ہماری ہی کم علمی ہے کہ ہم اس تلک رسائی نہیں کر پا رہے۔ یہاں پر ایک یہ اہم سوال بھی سامنے آتا ہے کہ تاریخ کا یہ عمل آخر کب اپنی تکمیل کو پہنچے گا اور کیا یہ تکمیل کو پہنچے گا بھی یا نہیں؟ اس کا جواب مختلف مکاتیبِ فکر اور فلسفیوں و تاریخ دانوں نے دیا ہے۔ جن کے اس متعلق متعدد نظریات پائے جاتے ہیں۔ تاریخ کے معتمد فلسفی: "جارج ولہیلم فریڈرش ہیگل" (Georg Wilhelm Frederic Hegel) کا اس تناظر میں یہ خیال ہے کہ؛ "خدا تاریخ کے ذریعے اپنے منصوبوں کی تکمیل کر رہا ہے، جب یہ منصوبے پورے ہو جائیں گے تو تاریخ کا عمل بھی مکمل ہو جائے گا"۔ یعنی جارج ولہیلم فریڈرش ہیگل، کے نزدیک، تاریخی عمل خدا کے منصوبوں کی تکمیل کا ایک عمل ہے۔ اسی طرح مذاہبِ عالم میں سے ایک اہم مذہب "اسلام" کی رُو سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ "روزِ قیامت" (Day of Judgment/ Doomsday) کے آنے سے تاریخ کا یہ عمل اپنی تکمیل کو پہنچے گا۔ جس کے حوالے سے مختلف نشانیاں بتائی گئی ہیں۔ "جدید سائنس" (Modern Science) کے نظریات کے مطابق تاریخ کا یہ عمل کچھ اس طرح مکمل ہو گا کہ؛ آج سے قریباً "ساڑھے چار بلین سال سے پانچ بلین سال" (Four and half Billion Years to Five Billion Years) تک کے عرصے میں سورج (Sun) کے "ہائیڈروجن" (Hydrogen) سے "ہیلیئم" (Helium) میں مسلسل تبدیل ہونے والا عمل ختم ہو جائے گا اور تمام "ہائیڈروجن"، "ہیلیئم" میں تبدیل ہو جائے گی۔ جس سے "پگھلاہٹ" (Fusion) کا عمل بھی رُک جائے گا اور مزید اگلے "پانچ کروڑ سال" (Five Crore Years) میں سورج "سرخ و شال ستارہ" (Red Giant Star) بن جائے گا۔ یوں سورج

اپنے آغاز کے بعد سے قریباً کل: "گیارہ ارب سال" (Eleven Billion Years) میں اپنے انجام کو پہنچے گا۔ جس کی وجہ سے انسانوں کو اپنا وجود برقرار رکھ پانا بھی ناممکن ہو جائے گا اور اس سے تاریخ کا عمل بھی اپنے انجام کو پہنچے گا۔ اور یہی سائنس کے نزدیک تاریخ کا اختتام ہو گا۔ سائنس کے متعدد مفکرین اور سائنس دان اس نظریے سے اکتفا کرتے ہیں۔ مگر بعض سائنس دان ایسے بھی ہیں کہ جن کا خیال ہے کہ یہ عمل کبھی اپنے انجام کو نہیں پہنچے گا اور تاریخ کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری و ساری رہے گا۔ نہ ہی سورج کی حالتوں کے بدلنے کی وجہ سے تاریخ کا یہ عمل رک پائے گا۔ تاریخ کے فلسفیوں، مذاہب اور سائنس دانوں کے علاوہ اگر "لادین یا ملحدین" (Atheist) کے نظریات کا جائزہ لیا جائے تو اُن میں سے بھی بیش تر سائنس کے معروف نظریے سے اتفاق کرتے ہیں، جس کے مطابق ایک وقت پر مختلف وجوہات کی بنا پر تاریخ کا اختتام ہو گا۔ جب کہ کچھ ملحد مفکرین کا بھی یہ خیال ہے کہ یہ عمل کبھی اختتام کو نہیں پہنچے گا اور اس کا مسلسل تشکیل پاتے رہنا ہی اس کی بناوٹ کا مقصد ہے اور یہی اس کی بقا ہے وہی اس کی ابدی صورت ہے۔ ہاں کچھ کا خیال یہ بھی ہے کہ تاریخ کا یہ عمل اس سیارہ سے ختم ہو جائے گا اور صرف یہ سیارہ فنا ہو گا۔ اس کے علاوہ باقی کائنات میں تاریخ کا یہ عمل یوں ہی جاری و ساری رہے گا۔ مختلف مکتبۂ فکر کے مفکرین کی آرا کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تاریخ کی تکمیل کے حوالے سے یہ مختلف آرا ابھی صرف مفروضات پر مبنی ہیں۔ ہم حتمی طور پر اس سے متعلق کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ تاریخ کے عمل کی تکمیل جب بھی ہو، البتہ اس سے یہ زیادہ ضروری ہے کہ ہم ترقیمِ تاریخ کے حوالے سے تاریخ میں موجود خلا اور فاصلوں کو پُر کرنے کی طرف توجہ دیں اور اسے مزید محفوظ کریں۔ تا کہ تاریخ کا ادھورا منظر نامہ پورے طور پر واضح ہو سکے۔ یہ عمل نسلِ انسانی کی بقا کے لیے از حد فائدہ مند ہو گا۔ جس سے ہم مستقبل میں مزید بہتری کی جانب گام زن ہو سکیں گے۔ جب ماضی کی کوتاہیاں مکمل طور پر ہمارے سامنے ہوں گی۔

جب ہم تاریخ کے بیان کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو تاریخ کا یہ بیان صرف خالصتاً "تاریخی متون" (Historical Texts) کے توسط سے ہی نہیں ہوتا۔ بل کہ دیگر متن بھی تاریخ کے بیان و اظہار کا ذریعہ بنتے

ہیں، جن میں ایک اہم ذریعہ "ادبی متون" (Literary Texts) ہیں، جن کے توسط سے تاریخ کو بیان کیا جاتا ہے۔ یہ ذریعہ نہ صرف تاریخ کے بیان کا وسیلہ بنتا ہے، بل کہ اس کے توسط سے تاریخ محفوظ بھی ہوتی ہے اور تاریخ کے وہ پہلو بھی منکشف ہوتے ہیں، جو متعدد وجوہات کی بنا پر عمومی تاریخ میں بیان نہیں کیے جا سکتے۔ ادبی متون کے ذریعے بیان کی گئی تاریخ،اُن رازوں پر سے پردہ اٹھانے کا ذریعہ بھی بنتی ہے جنہیں عمومی تاریخ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ادبی متن کے ذریعے تاریخ کی تفہیم کے بھی ایک سے زائد طرائق ہیں۔ اول: ادب میں تاریخ نثر و نظم کے متون کے توسط سے پیش کی جاتی ہے۔ نثر و نظم میں پیش کی گئی تاریخ،شاید عمومی تاریخ کی طرح ڈھکے چھپے انداز میں بیان ہو یا بعض اوقات منصف انتہائی وضاحت میں بھی بیان کر دیتا ہے۔ دوم: نثر و نظم کے متون کے علاوہ ادب میں تاریخ، تنقیدی متون کے توسط سے بھی پیش کی جاتی ہے۔ جس میں نقاد نہ صرف تنقید سے کام لیتا ہے، بل کہ جدید تنقیدی اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جدید پڑھت کے طور پر برتتا ہے اور تاریخ اور اس سے وابستہ تمام پہلوؤں کو منکشف کرتا ہے۔ اس ضمن میں ادب میں جو دو قدیم طرائق ملتے ہیں وہ: "روایتی تاریخی طریقِ رسائی" (Traditional Historical Approach) اور "مارکسی تاریخی طریقِ رسائی" (Marxist Historical Approach) ہیں۔ جب کہ ایک نیا طریقہ: "نو تاریخی طریقِ رسائی" (New Historical Approach) ہے، جو "تاریخیت" (Historicism) اور "نو تاریخیت" (New Historicism) کی دَین ہے۔

اس ضمن میں ہم دیکھیں کہ "تاریخیت" (Historicism) کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تاریخیت ایک "فلسفیانہ" (Philosophical) اصطلاح ہے، جس کا دائرۂ عمل صرف ادب و تاریخ تک نہیں، بل کہ دیگر علوم پر بھی محیط ہے۔ اس اصطلاح کا سب سے پہلی بار استعمال ہی فلسفے میں، جرمن فلسفی: "کارل ولہیلم فریڈرش شلیگل" (Karl Wilhelm Friedrich Schlegel) کے توسط سے ہوا۔ ہے۔ بعدازاں اِس کی جھلک اٹلی کے مشہور فلسفی اور تاریخ دان: "جیامباتیستا ویچو" (Giambattist Vico)، اور فرانسیسی فلسفی: "مشیل ڈی مونٹیگن" (Michel De Montaigne) کی تحاریر میں دیکھی جا سکتی ہے، پس وہیں سے اِس نے رواج پکڑا۔

جسے بعد ازاں ادبی مُطالعات کی پرکھ کے لیے برتا جانے لگا۔ ادب اور خاص کر اُردُو ادب سے منسلک قارئین جو اس کا دائرۂ عمل صرف ادبی تنقید تلک سمجھتے ہیں، وہ درست نہیں ہے۔ بل کہ اس کا دائرہ کار وسیع ہے اور اِس تناظر میں یہ "کثیر جہاتی"(Multilateral) اصطلاح ہے۔ بایں وجہ، تاریخیت، تاریخی پڑھت کے نئے طرائق کے اُصولوں کے طور پر سامنے آئی، جس نے مُطالعہ کو نیا رواج دیا۔ بعض ناقدین اسے صرف اصولوں تک محتوی کر دیتے ہیں جب کہ بعض کے نزدیک اس کے تحت عملی مطالعات بھی کیے جاسکتے ہیں۔ جب ہم اس تناظر میں جائزہ لیتے ہیں تو اِس کے وضع کردہ اصول تو سامنے آتے ہی ہیں، ساتھ ہی اس کے زیرِ اثر عملی مُطالعات بھی ملتے ہیں۔ تاریخیت کی ہی نئی صورت کا نام: **"نَو یا نئی تاریخیت"(New Historicism)** ہے۔ جو "تاریخیت" کی ایک قسم (Variant) بھی ہے بعض ناقدین اِسے تاریخیت کی قسم ماننے سے انکاری بھی ہیں۔ دیکھا جائے تو "تاریخیت" سے اس کا جَوہری تعلق ہے۔ اور یہ دراصل "جدیدیت"(Modernism) ، "امریکی نئی تنقید" (American New Criticism)اور "روسی ہیئت پسندی"(Russian Formalism) ، کے "ضدِ دعوی" (Antithesis) کے طور پر سامنے آئی۔ نو تاریخیت، کا اساسی جَرِ ترادب اور تاریخ و ثقافت کو ہم رشتہ کرنے سے ہے اور یہی نَو تاریخیت کا تعارف اور تعریف بھی ہے۔ نَو تاریخیت کے بنیاد گزار: "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" (Stephen Jay Green Blatt) ہیں، جنھوں نے مُتعدد تحاریر، مضامین اور کُتب کی مدد سے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۷ء کے درمیان نَو تاریخیت کا نظریہ پیش کیا۔ اُنھیں کی تحاریر سے متاثر ہو کر ۱۹۹۳ء میں "ریاض صدیقی" نے اُردو ادب میں اپنے پہلے مضمون بعنوان: "نو تاریخیت" کی مدد سے نَو تاریخیت کو متعارف کرایا۔ تحقیق ہٰذا تاریخ، فلسفۂ تاریخ، تاریخیت اور نَو تاریخیت کے نظریات کی ہی ایک تعارفی دستاویز کی حیثیت سے ہے، جس میں اِنھیں موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ذیل میں چاروں ابواب کا اختصار کے ساتھ احوال بیان کیا جارہا ہے۔

باب اول:

باب اول، تحقیق ہٰذا میں اساسی نوعیت کا حامل باب ہے، جس میں بنیادی موضوعات و مَباحث کا تعارف کروایا گیا ہے۔ اس باب کو "چار" (۴) حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ: تمہید ہے۔ جس میں موضوعات کا اور تحقیقی لوازمات کا انتہائی اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ: تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے اجمالی تعارف سے متعلق ہے۔ جس میں تاریخ کی بُنت، تاریخ کے اساسی تشکیلی عناصر اور فلسفۂ تاریخ کے مَباحث کو پیش کرتے ہوئے، تاریخ کا مجموعی ڈھانچہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس حوالے سے ہمارا سامنے یہ پہلو افشا ہوتا ہے کہ تاریخ جسے ہم صرف واقعات کے بیان تک محدود سمجھتے ہیں۔ اس کا دائرۂ عمل صرف واقعات کے بیان تک محدود نہ ہے۔ بل کہ اس کا پیرایہ بے حد وسیع ہے۔ جس میں واقعات کے علاوہ فرد، معاشرہ، سماج، ثقافت اور سیاست کے بیان کو بھی، اساسی اہمیت حاصل ہے۔ تیسرا حصہ: "تاریخیت" کا مختصر تعارف ہے۔ جس تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخیت ایک ایسا نظریہ و تصور ہے، جس کے تحت؛ تصورات، اقدار، اخلاقیات اور رہائش کے طریقے کو بیان کیا جاتا ہے نیز اس کا مقصد ثقافتی روابط کو واضح کرنا بھی ہے۔ اور ادبی تناظر میں یہ تاریخ کے مُطالعے کی حکمت عملیوں پر دال ہے۔ چوتھا حصہ: نُوتاریخیت کے تعارف سے متعلق ہے۔ جس حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ نو تاریخیت کا اساسی مقصد ادب، تاریخ اور تاریخ کے تناظر میں تشکیل پاتی ثقافت سے ہے اور اُن کی تفہیم و تعبیر سے ہے۔ نو تاریخیت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ تاریخی تناظر میں ادبی متون کے ساتھ ساتھ غیر ادبی متون کی حیثیت بھی کم نہ ہے۔ بل کہ مصنف کا حق یہ بنتا ہے کہ وہ غیر ادبی تاریخی متون سے استفادہ کرتے ہوئے تاریخ کی تفہیم کو ادب میں یقینی بنائے۔ نو تاریخیت کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ ہمیں تاریخ کی تشریح وبیان سے صرف ماضی کے واقعات کا بیان نہیں کرنا چاہیے بل کہ اِس حوالے سے ہم تاریخی تفہیم یوں کریں کہ ماضی کی ایک پوری تصویر ہمارے سامنے ہو۔ نہ صرف ماضی بل کہ عصری تاویل بھی کی جانی چاہیے۔ نو تاریخیت میں ثقافت کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ یہاں

تک کہ کچھ ناقدین تو اسے ثقافتی مطالعہ ہی قرار دیتے ہیں لہٰذا اس ضمن میں نو تاریخیت یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ نو تاریخیت کی ذیل میں خالی ثقافتی مطالعہ ہی نہ ہو، بلکہ ثقافت کی تاریخی تشکیل کا مکمل احاطہ کیا جائے۔

باب دوم:

باب دوم، نو تاریخیت کے بنیاد گزاروں، دبستانِ خیال اور اساسی نظری جہات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ضمن میں باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ نو تاریخیت کے پیش رو کے تعارف اور ان کے نظریات سے متعلق ہے۔ جب کہ دوسرا حصہ نو تاریخیت کے دونوں بنیادی دبستانوں، اُن کے مفکرین اور اُن کے تصورات سے متعلق ہے۔ اس حوالے سے نو تاریخیت کے تین پیش رو: "مشل فوکو"(Michel Foucault) ، لوئی آلتھیوسے "(Louis Althusser) اور "مورس ڈکسٹین"(Morris Dickstein) کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ نو تاریخیت کے امریکی دبستان سے وابستہ لوگوں میں: "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" (Stephen Jay Green Blatt) "جوناتھن گولڈ برگ"(Jonathan Gold Berg) "اسٹیفن اورگل"(Stephen Orgel)، "لوئی مانڑوس" (Louis Montross) اور "لیزا جارڈائن" (Lisa Jardine) اور برطانوی دبستان میں سے: "ریمنڈ ہنری ولیمز"(Raymond Henry Williams) ، " کیتھرین بیلسی" (Catherine Belsey)، "جوناتھن ڈولی مور"(Jonathan Dollimore) اور "ایلن سن فیلڈ" (Alan Sinfield) کا تعارف اور نو تاریخیت کے حوالے سے اِن کے نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔ نو تاریخیت کے پیش رد میں "مشل فوکو" اور لوئی آلتھیوسے " جب کہ دونوں دبستانوں میں "اسٹیفن جے گرین بلاٹ"، "جوناتھن گولڈ برگ"، لیزا جارڈائن "، "ریمنڈ ہنری ولیمز" اور کیتھرین بیلسی" کے نظریات اہمیت کے حامل ہیں۔

باب سوم:

باب سوم، سے تحقیق ہٰذا کا رخ، اُردُو ادب و تنقید میں نَو تاریخیت کی جانب ہوتا ہے۔ اس باب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں اُردُو تنقید کی نظری روایت کو انتہائی اختصار سے بیان کرتے ہوئے،

اِسے نوتاریخیت سے جوڑا گیا ہے اور نوتاریخیت کے آغاز وارتقا کو بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرے حصے میں نوتاریخیت کی اُردُو میں نظری مَباحث کی تحاریر جو کہ: **"چودہ"(۱۴) مضامین** اور **"ایک"(۱) مقالہ** ہیں، کا جائزہ لیا گیا ہے۔ **اُن کی فہرست یہ ہے:**

مضامین:

۱۔ **نوتاریخیت** ، ریاض صدیقی، ۱۹۹۳ء

۲۔ **اُردُو تنقید کا مسئلہ اور نوتاریخیت**، ریاض صدیقی، ۱۹۹۵ء

۳۔ **تاریخیت و نوتاریخیت**، پروفیسر عتیق اللہ، ۲۰۰۲ء

۴۔ **نئی تاریخیت**، ڈاکٹر ناصر عباس نیّر، ۲۰۰۴ء

۵۔ **مابعد جدیدیت---تاریخیت، نئی تاریخیت**، وہاب اشرفی، ۲۰۰۴ء

۶۔ **تاریخیت اور نوتاریخیت: ادبی تھیوری کا ایک اہم مسئلہ**، گوپی چند نارنگ، ۲۰۰۵ء

۷۔ **نوتاریخیت اور اس کا پیش و پس**، پروفیسر عتیق اللہ، ۲۰۰۵ء

۸۔ **نئی تاریخیت**، ڈان ای۔ وین، مترجم: فرحت احساس، ۲۰۰۶ء

۹۔ **نئی تاریخیت**، ڈاکٹر الطاف انجم، ۲۰۱۳ء

۱۰۔ **تاریخ اور نوتاریخیت**، قاسم یعقوب، ۲۰۱۷ء

۱۱۔ **ادب اور ثقافت اور نوتاریخیت: ایک مطالعہ**، ڈاکٹر حنا جمشید، ڈاکٹر شازیہ عنبرین، ۲۰۲۰ء

۱۲۔ **تاریخ، تاریخیت اور نوتاریخیت: بنیادی تعقلات**، سید ازور عباس، ڈاکٹر مطاہر شاہ، ۲۰۲۲ء

۱۳۔ **نوتاریخیت**، ڈاکٹر عبد العزیز ملک، ۲۰۲۲ء

۱۴۔ **نو تاریخیت**، اورنگ زیب قاسمی، ۲۰۲۲ء

مقالہ:

۱۔ **اُردُو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مَباحث**، سید ازور عباس، ۲۰۱۸ء

اس باب کی مجموعی صورت حال ہمارے سامنے یوں آتی ہے کہ: باب ہٰذا میں جو "چودہ"(۱۴) مضامین اُردُو تنقیدی روایت میں نَو تاریخیت کے نظری مَباحث سے متعلق زیرِ بحث لائے گئے ہیں، اِن میں "تین"(۳) سے "چار"(۴) مضامین ایسے ہیں کہ جن کا مُطالعہ کر کے واقعی نَو تاریخیت سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اِن میں "پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر ناصر عباس نیّر اور گوپی چند نارنگ" کے مضامین شامل ہیں۔ **ریاض صدیقی**، کا پہلا مضمون اُردُو میں نو تاریخیت کے نظریات پر سب سے پہلا مضمون ہے۔ اس پہلے مضمون کے مُطالعہ سے کوئی اَنمان واضح نہیں ہوتا۔ جب کہ اپنے دوسرے مضمون میں نو تاریخیت سے زیادہ تاریخیت، سوانحی تنقید اور تاریخی تنقید کو موضوع بناتے نظر آتے ہیں۔ **پروفیسر عتیق اللہ**، کا پہلا مضمون اُردُو میں پہلی بار نَو تاریخیت کی مختلف جہات کو متعارف کراتے ہوئے نظر آتا ہے، تاہم اِس میں نارسیدگی یہ ہے کہ اِس نے نَو تاریخیت سے زیادہ تاریخ، مارکسی تصورات، تاریخی تنقید اور تاریخیت کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ **ڈاکٹر ناصر عباس نیّر**، کا مضمون اُس مِفتاح حیثیت کا حامل ہے، کہ اس کے ذریعے اُردُو میں نَو تاریخیت کے پہلی بار مفصل دَر وا کیے۔ اور اِس نظریے کے بنیاد گزاروں کے اصل مآخذ سے استفادہ کرتے ہوئے، اُردُو میں اُنہیں پیش کیا۔ **وہاب اشرفی**، کا مضمون تاریخیت اور نَو تاریخیت کے لائینفک رشتوں کی ادھوری سرگزشت ہے۔ **گوپی چند نارنگ**، کا مضمون اُن کے تنقیدی افق کی ہمہ جہت اتھاہ اور ادبی تفہیم کی وسعت کا عکاس ہے۔ انہوں نے مغربی تنقید کے تاریخی و فکری ارتقا اور اس کے نَو تاریخیت کے تسلسل کو بڑے وقیع اور مدلل و منظم انداز میں پیش کیا ہے۔ **پروفیسر عتیق اللہ**، کا دوسرا مضمون دیگر مضمون نگاروں کی نسبت نو تاریخیت کے تصورات اور علمیات کو کسی حد تک بہتر طریقے سے پیش کرتا ہے۔ **ڈان ای۔ وین**، کا مضمون جس کا اُردُو مترجم: "**فرحت احساس**" ہیں، اس مضمون میں نو تاریخیت کے نظریات کو بیان کرنے سے

زیادہ اس کے سیاسی تفاعل پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ **ڈاکٹر الطاف انجم**، کے مضمون میں اُردُو میں پہلے سے پیش کیے گئے مَباحث کو ہی دوبارہ ترتیب دے کر پیش کر دیا ہے۔ **قاسم یعقوب**، کے مضمون میں نَو تاریخیت سے زیادہ تاریخ، تصوراتِ تاریخ اور تاریخ کی حرکت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس میں نَو تاریخیت سے متعلق مَباحث نہ ہونے کے مترادف ہیں۔ **ڈاکٹر حنا جمشید اور ڈاکٹر شازیہ عنبرین**، نے اپنے مضمون میں اُردُو میں پہلے سے بیان کردہ مَباحث کو ترتیب نَو کر کے پیش کیا اور ساتھ ہی نَو تاریخیت کے نظریات کو بنیاد بنا کر پاکستان کی عصری تاریخ کو پیش کیا۔ **سید ازور عباس اور ڈاکٹر مطاہر شاہ**، کا مضمون اُردُو میں دستیاب مواد کی بنا پر نَو تاریخیت کے مَباحث کو جمع کرنے کی ایک بہتر مثال ہے۔ **ڈاکٹر عبدالعزیز ملک**، نے اپنے مضمون میں گرین بلاٹ، مشل فوکو اور کیتھرین بیلسی وغیرہ کے نظریات سے استفادہ کر کے نو تاریخیت کے نظریات کو پیش کیا ہے۔ مگر یہ زیادہ تر اُردُو میں پہلے زیرِ بحث لائے جا چکے ہیں۔ **اورنگ زیب قاسمی**، کا مضمون تحقیقی و تنقیدی تناظر میں انتہائی کم زور نوعیت کا حامل ہے۔ علاوہ بریں، **سید ازور عباس**، کا تحقیقی مقالہ اِس تناظر میں اہمیت کا حامل ہے کہ یہ اُردُو میں باقاعدہ پہلا تحقیقی مقالہ ہے جو نَو تاریخیت کے نظری اور اطلاقی مَباحث پر رقم کیا گیا ہے۔ مگر اِس کا انتہائی ناتُواں پہلو یہ ہے کہ مقالہ نگار نے ایک بھی اساسی ماخذ سے رجوع نہیں کیا۔ یہاں تلک کہ نَو تاریخیت کے نظریہ کے پیش کرنے والے: "اسٹیفن جے گرین بلاٹ" کی بھی کسی ایک تحریر کو بھی زیرِ بحث نہیں لائے اور نہ ہی اُس سے مستفید ہوئے۔

باب چہارم:

باب چہارم، اُردو تنقید میں نَو تاریخیت کے اطلاقی مباحث سے متعلق ہے۔ اس باب کو بھی حسب روایت دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ اُردُو تنقید کی اطلاقی روایت سے متعلق ہے۔ جس میں اُردُو تنقید کی اطلاقی روایت کو بیان کرتے ہوئے، اِسے نَو تاریخیت کے اُردُو تنقید میں نو تاریخیت کے اطلاقی مُطالعات سے جوڑا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں اُردُو تنقید کے اطلاقی مباحث کے **"پانچ"(۵) مضامین** اور **"تین" (۳) مقالہ جات** کا جائزہ لیا گیا ہے۔ **اُن کی فہرست یہ ہے:**

مضامین:

ا۔ **بڑے گھر کی بیٹی---چھوٹا کردار**، شمس الرحمٰن فاروقی، ۲۰۰۷ء

۲۔ **گردشِ رنگِ چمن---نئی تاریخیت کی ایک روشن مثال**، پروفیسر بیگ احساس، ۲۰۰۷ء

۳۔ **قصصِ ہند': تاریخیت اور نو تاریخیت**، ڈاکٹر قاضی عابد، ۲۰۱۵ء

۴۔ **"خس وخاشاک زمانے"---نوتاریخی پڑھت**، ڈاکٹر نسیم عباس احمر، ۲۰۱۸ء

۵۔ **عبداللہ حسین کا نوتاریخی شعور: تخصیصی مطالعہ نادار لوگ**، ڈاکٹر حنا جمشید، ۲۰۲۲ء

مقالہ جات:

ا۔ **اُردُو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مَباحث**، سید ازور عباس، ۲۰۱۸ء

۲۔ **زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت ("تتلیاں ڈھونڈنے والی" اور "رقصِ بسمل ہے" کے حوالے سے)**، سمعیہ شکور، ۲۰۱۹ء

۳۔ **اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت**، عائشہ واجد، ۲۰۲۰ء

اِس باب کی مجموعی صورت حال ہمارے سامنے یوں آتی ہے کہ؛ باب ہٰذا میں جو "پانچ "(۵) مضامین اُردُو تنقیدی روایت میں نَو تاریخیت کے اطلاقی مُطالعات سے متعلق زیرِ بحث لائے گئے ہیں ، اِن میں " تین " (۳) مضامین ایسے ہیں کہ جن کا مُطالعہ کر کے واقعی نَو تاریخیت کے اطلاق سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اِن میں " شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر بیگ احساس اور ڈاکٹر قاضی عابد "کے مضامین شامل ہیں۔ **شمس الرحمن فاروقی**، کا اس تناظر میں دوہری حیثیت کا حامل ہے کہ ایک تو یہ نَو تاریخیت کے اولیں اطلاقی مُطالعات میں شمار ہوتا ہے دوسرا یہ انتہائی تنقیدی بصیرت سے رقم کیا گیا ہے۔ کہ جس میں شمس الرحمٰن فاروقی نے پریم چند کے افسانے میں ابھرنے والے ثقافتی رشتوں کی توضیح و تفہیم کی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے اَس طرزِ مُطالعہ کو ، بعد میں آنے والے

نقادوں نے بھی اپنایا ہے۔ **پروفیسر بیگ احساس**، نے بھی اپنے مضمون میں شمس الرحمٰن فاروقی کے ہی انداز کو اپنایا ہے۔ یہ مضمون نَو تاریخیت کے ابتدائی اطلاقی مُطالعات کی ایک بہتر مثال کے طور پر سامنے آتا ہے۔ البتہ اِس میں کم زور پہلو یہ کہ اِس میں پروفیسر بیگ احساس نے قرۃالعین حیدر کی از حد تعریف کی ہے۔ جو کہ معتمد تنقیدی رویے کو زیب نہیں دیتا۔ **ڈاکٹر قاضی عابد**، کا مضمون بھی ایک انتہائی اہم دستاویز کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ جس میں صاحبِ مضمون نے نَو تاریخیت اور ثقافتی مادیت کے بنیادی تصورات سے رجوع کرتے ہوئے، تاریخ کی تشکیل میں قومی طاقت اساس بیانیوں کی رد تشکیل کی اور اِن بیانیوں کے متبادل بیانیہ تشکیل دینے کی کوشش کی ہے۔ **ڈاکٹر نسیم عباس احمر**، کا مضمون نو تاریخی پڑھت کی عمدہ مثال ہے، مگر اُن کی تنقیدی اِستعداد کی عکاسی نہیں کرتا۔ **ڈاکٹر حنا جمشید**، کا مضمون اطلاقی نوعیت کا ہونے کے باوجود نظری مَباحث پر زیادہ اکتفا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جو کہ اطلاقی مُطالعے کی ذیل میں بہتر روش نہ ہے۔ علاوہ بریں، **سید ازور عباس** کا تحقیقی مقالہ اطلاقی پڑھت کی بہتر کاوش ہے۔ مگر اس کی حیثیت تنقیدی سے زیادہ توضیحی کی ہے۔ **سمعیہ شکور**، کا تحقیقی مقالہ انتہائی کم زور نوعیت کا حامل ہے۔ جس کا عنوان تو نو تاریخی مُطالعہ کا ہے۔ مگر انداز روایتی اپنایا گیا ہے۔ **عائشہ واجد**، کا تحقیقی مقالہ، نو تاریخی پڑھت کی ایک بہتر طالبِ علمانہ کاوش ہے۔ جس میں مقالہ نگار نے کم از کم نَو تاریخیت کی جہات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، پڑھت کے ایک ڈَھنگ کو وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔

ب۔ تحقیقی نتائج:

۱. نوتاریخیت کے تناظر میں سب سے پہلے یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ یہ نظریہ باقاعدہ نظریہ کی حیثیت سے نہ ہے۔اور اس بات کا اعتراف خود نوتاریخیت کے بنیاد گزار:"اسٹیفن جے گرین بلاٹ" (Stephen Jay Green Blatt) نے کیا ہے۔لیکن آج اس کی موجودہ صورت حال دیکھی جائے تو یہ نظریہ ارتقائی منازل طے کرکے باقاعدہ ایک نظریہ کی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔یعنی آج اس کے ایسے مباحث ملتے ہیں کہ اس نے باقاعدہ نظریہ کا رُوپ دھار لیا ہے۔نہ کہ اس کی حیثیت کسی؛"رجحان، میلان، رویے یا صرف علمی سرگرمی" کی ہے۔ ہمارے اردو ناقدین کے ہاں یہ مسئلہ ملتا ہے کہ وہ ایک طرف اندھی تقلید کرتے ہوئے اسٹیفن جے گرین بلاٹ کے اُس اقتباس کا حوالہ بھی دیئے جاتے ہیں۔ اور اسے نظریہ بھی کہے جاتے ہیں۔ مگر کوئی نتیجہ اخذ کرکے اس کی وضاحت بھی نہیں دیتے۔

۲. نظریۂ نوتاریخیت کے حوالے ایک رائے یہ ملتی ہے کہ؛"یہ کسی خاص بندھے ٹکے رویے کا نام نہیں ہے۔"اور اسی کو بنیاد بنا کر اردو تنقید میں ہر ناقد نے اسے پیش کیا اور یہ تاثر دیا ہے کہ اس کی کوئی حدود ہی نہیں ہیں۔ لیکن اس کا بالکل یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس کی کوئی حدود و قیود نہیں ہیں۔ بل کہ دیگر نظریات کی طرح اس کی بھی اساسی نظری جہات ہیں اور سیمائیں ہیں۔ ہاں ان میں صورت حال کے لحاظ سے معمولی تبدیلی ہو سکتی ہے یا کی جاسکتی ہے، مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ بالکل ہی وارستہ ہیں۔

۳. نظریۂ نوتاریخیت کے بنیاد گزاروں کے حوالے سے ایک یہ کم زور پہلو سامنے آتا ہے کہ انہوں نے اپنے مطالعات کا رخ "شیکسپیئر کے جائزوں"(Shakiespeare Study)اور "نشاۃ الثانیہ"(Renaissance) کی جانب رکھا ہے۔اور اسے کسی حد تک اِن موضوعات کی جانب محدود کر دیا ہے۔ علاوہ بریں، بڑے اہم بنیاد گزاروں نے بھی اس کی اساسی نظری جہات اس قدر واضح نہیں کی ہیں، جس کی یہ متقاضی تھی۔ بل کہ

انہوں نے نظری مباحث کے الگ سے مضامین لکھنے کی بجائے اطلاقی مطالعات میں ہی نظری کو زیر بحث لایا ہے۔

۴. اُردو تنقید میں نو تاریخیت کے نظری مَباحث کے تناظر میں جتنے مضامین یا تحاریر ملتی ہیں۔ وہ واضح طور پر چند ایک مضامین کا چربہ بل کہ سرقہ معلوم ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ معتمد ناقدین نے بھی اساسی مآخذ سے رجوع کیئے بغیر ہو بہو مضامین تحریر کر دیئے ہیں۔ جس سے نو تاریخیت نظریاتی طور پر سمٹ کر رہ گئی ہے۔

۵. اُردو ادب و تنقید میں نو تاریخیت کے اطلاقی نمونے بھی پس ماندگی کا شکار نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب نظری مباحث ہی واضح نہیں ہیں تو اطلاقی بھی گراوٹ کا شکار ہوں گے۔ متعدد ناقدین نے نو تاریخیت کے اطلاقی مُطالعات کی آڑ میں "روایتی تاریخی طریقِ رسائی" (Traditional Historical Approach) یا "مارکسی تاریخی طریقِ رسائی" (Marxist Historical Approach) سے کام لیا ہے۔

ج۔ سفارشات:

۱. ایک امر جو انتہائی اساسی مگر از حد تشویش ناک ہے کہ اُردُو میں تاریخیت اور نو تاریخیت کی مفصل وضاحت ہی نہ ہے۔یعنی اچھے خاصے مطالعے سے تاریخیت اور نو تاریخیت کے اشتراکات وافتراقات کو واضح نہیں کیا جاسکتا۔اس لیے از حد ضروری ہے کہ ان کی تعریف سے لے کر ان کی نظری جہات اور اختیارات کو واضح کیا جائے۔ تاکہ تاریخیت اور نو تاریخیت کی منہاجات کا اساسی فرق ابھر کر سامنے آئے۔

۲. تاریخیت اور نو تاریخیت کے اشتراکات وافتراقات کی وضاحت نہ ہونے کی طرح، نو تاریخیت کے اساسی نظری پہلوؤں کی بھی وضاحت، اردو ادب میں نہ ہونے کے مترادف ہے۔ماسوائے دو سے تین مضامین کے، اُردو میں نو تاریخیت کی نظری جہات کو واضح کرنے کے لیے کوئی مواد دستیاب نہ ہے۔اور ان دو تین مضامین میں بھی نظری جہات مکمل واضح نہیں ہوتی۔نو تاریخیت کے نظریے سے متعلق مضمون نگار یا مقالہ نگار نو تاریخیت کی بحث کو بیچ میں چھوڑ کر ادھر اُدھر نکل جاتے ہیں۔پس انہیں واضح کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

۳. ان وضع کردہ نظری جہات کے تناظر میں اردو کے متعدد اہم متون کے اطلاقی مطالعات کے لیے نو تاریخیت کی ذیل میں تجزیہ کرنے کے بہتر ڈھنگ کی اختراع کی جانی چاہیئے۔ تاکہ اس اہم نظریے کو اطلاقی تناظر میں بھی وسعت ملے۔اور ادب کی بہتر سے بہتر تفہیم کی جاسکے۔

۴. اُردو کے چند ناقدین نے نو تاریخیت کی توضیح کرتے ہوئے اسے تاریخ سے بھی زیادہ ثقافتی تناظر میں اہم سمجھا ہے۔اور یہ تاثر دیا ہے کہ اس کی حیثیت ثقافتی مطالعات کی ہے۔ان ناقدین کی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے نئے قارئین کو یہ واضح کیا جانا چاہیئے کہ بے شک ثقافتی تناظر میں اس کی بہت اہمیت ہے، لیکن آدِ اساسی اہمیت تاریخ کی ہی ہے۔اور تاریخ کی بُنت کے ایک بہت اہم عُنصر کے طور پر ہی ثقافت کو برتا جاتا ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

اُردو کتب:

- اورنگ زیب قاسمی، ادبی تھیوری: بنیادی تصورات اور مباحث ورلڈ ویو پبلشرز،، لاہور، ۲۰۲۲ء
- الطاف انجم، ڈاکٹر، اردو میں مابعد جدید تنقید (اطلاقی مثالیں، مسائل و ممکنات)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء
- عبد العزیز ملک، ڈاکٹر، معاصر تنقیدی رجحانات، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۲ء
- عتیق اللہ، پروفیسر، تعصبات، ایم۔ آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء
- قاسم یعقوب، ڈاکٹر، تنقیدی سیاق اور نئے سوال، کتابی دنیا، لاہور، ۲۰۲۲ء
- قاسم یعقوب، ڈاکٹر، لفظ اور تنقید معنی، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء
- گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، جدیدیت کے بعد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۵ء
- ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، جدید اور مابعد جدید تنقید، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۲۱ء
- وہاب اشرفی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء
- نسیم عباس احمر، ڈاکٹر، نو تاریخیت (منتخب اُردو مقالات)، مرتبہ، مثال پبلی شرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء

اُردو مقالہ جات:

- سید ازور عباس شیرازی، اردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث، مقالہ برائے ایم۔ فل اردو (غیر مطبوعہ)، مملوکہ، شعبہ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۸ء
- عائشہ واجد، اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت مقالہ برائے ایم۔ فل اردو، (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: شعبہ اردو زبان وادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء
- سمعیہ شکور، زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت (تتلیاں ڈھونڈنے والی اور رقص بسمل ہے، کے حوالے سے)، مقالہ برائے ایم۔ فل اردو، (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: شعبہ اردو زبان وادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء

اُردو مضامین:

- احساس بیگ، پروفیسر، گردش رنگ چمن نئی تاریخیت کی ایک روشن مثال، (مضمون) مشمولہ: متن کی قرات، مرتبہ صغیر افراہیم / قاضی افضال حسین، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۷ء
- حنا جمشید، شازیہ عنبرین، ادب اور ثقافت اور نو تاریخیت: ایک مطالعہ، (مضمون) مطبوعہ: الماس، شمارہ ۲۰۲۰، ۲۳، شعبہ اردو، شاہ عبدالطیف یونیورسٹی، خیر پور
- ڈان ای۔ وین، نو تاریخیت، مترجمہ فرحت احساس، مشمولہ: نو تاریخیت، مرتبہ: نسیم عباس احمر، ڈاکٹر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء
- ریاض صدیقی، اردو تنقید کا مسئلہ اور نو تاریخیت (مضمون) مشمولہ: نو تاریخیت، مرتبہ: نسیم عباس احمر، ڈاکٹر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء

- ریاض صدیقی ،نو تاریخیت (مضمون)، مشمولہ :نو تاریخیت ، مرتبہ :ڈاکٹر نسیم عباس احمر ،مثال پبلشرز، فیصل آباد۲۰۱۸ء
- سید ازور عباس ، مظاہر شاہ:ڈاکٹر ، تاریخ ، تاریخیت اور نو تاریخیت :بنیادی تعقلات ،(مضمون)مطبوعہ :اردو، شمارہ ۲، جلد۹۷، ۲۰۲۲ء، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی
- شمس الرحمان فاروقی، متن کی قرات، مرتب: قاضی افضال / صغیر افراہیم،شعبہ اُردو علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،۲۰۱۷ء
- عتیق اللہ ، پروفیسر ، تاریخیت و نو تاریخیت (مضمون)، مشمولہ :ترقی پسندی ،جدیدیت ،مابعد جدیدیت، مرتبہ :ندیم احمد،ڈاکٹر، بھارت آفسیٹ، دہلی
- وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت، تاریخیت، نئی تاریخیت، (مضمون)، مشمولہ: نو تاریخیت (منتخب اُردو مقالات)، مرتبہ نسیم عباس احمر،ڈاکٹر، مثال پبلی شرز، فیصل آباد،۲۰۱۸ء

ثانوی مآخذ:

اُردو کتب:

- ابو الکلام قاسمی،ڈاکٹر، نظریاتی تنقید (مسائل و مباحث)،بیکن بکس،لاہور،۲۰۱۵ء
- ابو اللیث صدیقی،ڈاکٹر،عابدہ ریاست رضوی، فرحت فاطمہ رضوی، اردو لُغت (تاریخی اصول پر) (جلد ششم)،اُردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ)، کراچی،۱۹۴۸ء
- اسلم انصاری، قومی تشخص اور ثقافت، (مضمون) مشمولہ: قومی تشخص اور ثقافت، مرتبہ خالد سعید بٹ،ڈاکٹر، جنید اقبال، گلزار آفاقی، محمد داؤد، ادارہ ثقافت پاکستان، اسلام آباد،۱۹۸۳ء
- ایڈورسعید، شرق شناسی، مترجمہ محمد عباس، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،۲۰۱۲ء
- جی ڈبلیو ایف ہیگل، فلسفہ تاریخ، مترجمہ: اقبال آفاقی،ڈاکٹر، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد،۲۰۱۸ء
- حسن اختر ملک،ڈاکٹر، تنقید اور تحقیقی جائزے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۸۳ء
- خرم شہزاد،ڈاکٹر، ژاک دریدا کا تحریر اساس فلسفہ، سٹی بک پوائنٹ، کراچی،۲۰۲۲ء
- ڈاکٹر محمد اشرف کمال ، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات ، مثال پبلی شر رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ ،امین بازار، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء
- سید محمد عقیل، تنقید اور عصری آگہی، ذوالفقار صدیقی، الہ آباد۱۹۷۶ء
- شبلی نعمانی، شعر العجم (جلد چہارم) معارف پریس، اعظم گڑھ،۱۹۲۳ء
- شیما مجید (مرتب)، مقالاتِ رحمان، نگارشات، لاہور،۱۹۸۹ء
- عبادت بریلوی س،ڈاکٹر، اردو تنقید کا ارتقاء، انجمن ترقی اردو، کراچی،۲۰۰۱ء
- عبد الحیٔ خواجہ (مشفق خواجہ)، (مترجم) تاریخ فرشتہ، از: محمد قاسم فرشتہ، المیزان، لاہور،۲۰۱۳ء
- عزیز ابن الحسن،ڈاکٹر، اردو تنقید۔ چند منزلیں، پورب اکادمی، اسلام آباد،۲۰۱۲ء

- فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۴ء
- قاضی افضال حسین، ڈاکٹر، تحریر اساس تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء
- قاضی عابد، ڈاکٹر، اساطیر، کتھا، کہانی اور مابعد جدید تناظر، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۷ء
- کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، سر فراز قومی پریس، لکھنو، ۱۹۶۴ء
- مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور فلسفہ تاریخ، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء
- محمد حسن، ڈاکٹر، مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء
- محمد نعیم، اردو ناول اور استعماریت، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۷ء
- مقبول بیگ بدخشانی، مرزا، اُردو لغت، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۸ء
- میرا جی، مشرق و مغرب کے نغمے، آج، کراچی ۱۹۹۹ء
- ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، لسانیات اور تنقید، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
- ناصر عباس نیّر، عالم گیریت اور اردو اور دیگر مضامین، سنگِ میل پبلی کیشنز: لاہور: ۲۰۱۵ء
- ناصر عباس نیّر، متن، سیاق اور تناظر، سنگ میل پبلی کیشنز: لاہور، ۲۰۱۶ء
- وزیر آغا، ڈاکٹر، دستک اس دروازے پر، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۹۳ء
- وزیر آغا، ڈاکٹر، دستک اس دروازے پر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی: ۱۹۹۳ء
- وزیر آغا، کلچر کے خدوخال، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء
- یاسر جواد، (مترجم)، دنیا کی قدیم ترین تاریخ، از: ہیروڈوٹس، نگارشات پبلی شرز، لاہور، ۲۰۱۸ء

اُردو مضامین:

- ریاض احمد، ڈاکٹر، اردو تنقید کا نفسیاتی دبستان (مضمون) مشمولہ: تنقیدی نظریات، مرتبہ ڈاکٹر احتشام حسین، جلد اول، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، ۲۰۰۹ء
- سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، طین اور ساں بو (مضمون) مشمولہ: تنقید کی جمالیات، مرتبہ پروفیسر عتیق اللہ، جلد دوم؛ فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۸ء

اُردو لغات:

- نورالحسن نیّر، مولوی، کاکوروی، نوراللغات (جلد دوم)، جنرل پبلی شنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۸۹ء
- وہاب اشرفی، ڈاکٹر، کاشف الحقائق: ایک مطالعہ، ایجوکیشنل پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۴ء
- یونس حسنی، ڈاکٹر، نسیم بیگ، مرزا، حسین مجتبیٰ زیدی، شمیم اختر، شاہد الدین درانی، اُردو لغت (تاریخی اصول پر)، (جلد ہژدہم)، اُردو لغت بورڈ، کراچی، ۲۰۰۲ء
- احمد دہلوی، سید، مولوی، فرہنگ آصفیہ (جلد اول)، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۷ء
- فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، شاہدہ تسنیم صدیقی، نسیم بیگ، مرزا، اُردو لغت (تاریخی اصول پر) (جلد یازدہم)، اُردو لغت بورڈ (ترقی اُردو بورڈ)، کراچی، ۱۹۹۰ء
- عبداللہ خان خویشگی، محمد، فرہنگ عامرہ، ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء

انگریزی کُتب و مضامین:

- Aviezer Tucker, A Companion to the philosophy of FHistory and Historiography, 2018.
- Bertrand Russell, The Analysis fo Mind, G. Allen and Unwin, London, 1921.

- C. Behan Mcculagh, Colligation, (Article) Added: A companion to the Philosophy of History and Historiography, Compiled by: Aviezar Tucker.
- David Carr, Time, Narrative, and History, Indiana University Press, Bloomington, 1986.
- David Daichas, Critical Approaches to Literature, Longman, London, 1959.
- David Matsumoto, Linda Juang, Culture and Psychology, Wadsworth, Cengage Learning, Belmont, 2013
- Dolli more, Jonathan, Desire: A memoir, Bloomsburg, London and New York, 2017.
- E.H.Carr, What is History?, Penguin Books, London, 2018.
- F.R. Ankersmit, Narrative and Interpretation, (Article) Added: A companion to the Philosophy of Hisotry and Historiography, Compiled by: Aviezer Tucker.
- Gary Gutting, Foucault: A Very Short Introduction, oxford university press, oxford, 2005.
- Georg Withelm Friedrich Hegel, The Philosophy of History, Translator, Kitchener, 2001 A.D.
- Gupte Shwer Prasad, I.A Richards and Indian Theory of Rasa, Sarap &sons ,New Dehli, 2007.
- Harry Ritter, Dicionary of Concepts in History, Greenwood Press, New York, 1986 A.D.
- Hayden White, Tropics of Discourse: Essays in Cultural Criticsim, The Johns Hopkins University Press, Baltimore, 1978.

- Helge Kragh, An introduction to the Historicography of Science, Cambridge University Press, Cambridge, 1987.
- Karl Raimund Popper, The Poverty of Historicism, Harper Torch Books, The Academy Library Harper & Row, Publishers, New York and Evarston, 1961A.D
- Lois Tyson ,critical theory today :A user friendly Guide ,Routledge ,New York, 2006.
- Louis Althusser, On the reproduction of capitalism: ideology and ideological State Apparatuses, Verso, London, 2014.
- Luke Ferretter, Louis Althusser, Routledge, London, 2006.
- M.H Abrams,A glossary of literary terms ,Hol.Rinehart& winstom London, 1988.
- Mark Robson , Stephen Greenblatt, Routledge, London , 2008.
- Marmie Hughes-Warrington, Fifty key thinkers on history, London, Routledge, 2000.
- Maurice Mandelbaum, The Anatomy of Hisotical Knowledge, The Johns Hopkins University Press, Baltimore and London, 1977.
- Michel Foucault, Archeology of knowledge, Routledge, London, 1989.
- Michele Barret, Philip Richard D. Corrigan, Annette Kuhn, Ideology and Cultural Production, Groom Helm, London, 1979
- R.G.Collingwood, The Idea of History, Oxford University Press, London, 1956.
- Robin Waterfield, (Translator) The Histories, by Herodotus, Oxford University Press, New York, 2008.

- Roland barthers, Images, music, Text, selected and Trans:Stephen Heath, London, Macmillian,1977.
- Stephen Green Blatt, Towards a Poetics of Culture, (Article) Added: The New Historicism, Edited: Harold Aram Veeser, Routledge, New York, 2013 A.D, P: 01
- Stephen Greenblatt, Catherine Gallagher, Practicing New historicism, University of Chicago Press,London, 2000
- Stephen Greenblatt,Renassiance Self-Fashioning:From more to Shakespeare, University of Chicago Press,2005
- Stephen Jay Green Blatt, The Forms of Power and the Power of Forms in the Renaissance, (Article) Added: Genre, Issue 15, 1982 A.D, University of Oklahoma, Norman
- The Oxford American Dictionary of Current English, Oxford university press, New York, 1999.

ویب گاہیں:

- https://anthropology.va.edu
- http://www.oxfordlearnersdictionaries.com
- http://www.theguardian.com
- https://dictionary.cambridge.org
- https://en.Wikipedia.org.com
- https://handwiki.org
- https://ubd.gov.pk
- https://www.collinsllinsdictionary.com
- https://www.etymonline.com
- https://www.historytoday.com.

- https://www.merriam-webster.com
- https://www.newworld.encyclopedia.org
- https://www.newworldencyclopedia.org.com
- https://www.thoughtco.com
- https://www.vocabulary.com
- https://youtube.com